

قلمی

اقبالی کے آخری مسائل

ڈاکٹر عابد حسین بنیادی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

22

6

Marfat.com  
Marfat.com  
Marfat.com

# اِقْبَالِكْ

## کے آخری دو سال<sup>(۲)</sup>

از

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

130410

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

# فہرست

۱۔ مقدمہ

## حصہ اول

### پس منظر

سرمائیکل اور ڈوائز کی حکومت	پہلا باب :-	۲ :-
میشاق لکھنؤ کے بعد	دومر ابا :-	۳ :-
اصلاحات کا نفاذ	تیسرا باب :-	۴ :-
پہلی وزارت کا دور	چوتھا باب :-	۵ :-
یونینسٹ پارٹی کا قیام	پانچواں باب :-	۶ :-
تجاویز دہلی	چھٹا باب :-	۷ :-
۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک	ساتواں باب :-	۸ :-

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

## حصہ دوم

### اقبال کے آخری دو سال

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ	۳ شہواں باب :-	۹ :-
۱۹۳۷ء کا انتخاب	نواں باب :-	۱۰ :-
"مسلم رابطہ عوام" کی تحریک	دسواں باب :-	۱۱ :-
کانگریسی راج	گیارہواں باب :-	۱۲ :-
سکندر جناح پبلیٹ ۱	بارہواں باب :-	۱۳ :-
سکندر جناح پبلیٹ ۲	تیرہواں باب :-	۱۴ :-
مسجد شہید گنج کا قضیہ	چودھواں باب :-	۱۵ :-
خاتم	پندرہواں باب	۱۶ :-
	ضمیمہ ۱	۱۷ :-
	ضمیمہ ۲	۱۸ :-
	ضمیمہ ۳	۱۹ :-

# انتساب

میں اس کتاب کو - اپنے مرحوم و معذور دوست ملک برکت علی  
 کے نام سے منسوب کرتا ہوں - جن کے انتقال پر طالی پر ۵ اپریل ۱۹۴۶ء  
 کو قائد اعظم نے فرمایا تھا -

“ . . He was, from the very beginning, a true and loyal member of the Muslim League, and on all occasions he rendered the greatest service to Muslim India. His advice and his staunch support on all critical occasions were of the greatest value to the Legal profession and myself. Muslim India has lost in him a great man, and I have lost in him not only a colleague and collaborator but also a friend.”

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



۶

۷

Marfat.com  
Marfat.com  
Marfat.com

پہلا حصہ

پس منظر

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

# مقدمہ

اپریل ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ میرے دوست مولانا چرغ حسن حسرت مرحوم، روزنامہ بھروز کے ایڈیٹر تھے۔ اور اپنے اخبار کا اقبال نمبر نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں۔ انہوں نے مجھ سے بھی مضمون کی فرمائش کی۔ میں نے عرض کیا کہ "اقبال کی شاعری کے پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب کسی مزید اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کوئی نیا عنوان بتائیں۔ تو شاید میں اس پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں" حسرت خاموش ہو گئے۔ اور چند منٹ سوچ کر کہنے لگے، کہ "اقبال کے آخری دو برسوں کی سرگزشت آپ کیوں نہیں لکھ ڈالتے؟ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور آپ بھی لیگ میں کام کرتے تھے۔"

حسرت کے ان الفاظ نے اقبال کی زندگی کا ایک ایسا پہلو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو اس وقت تک، بعض وجوہ سے، لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن گھڑا کر۔ جب میں نے اپنی کتابوں کی الماری میں سے۔ اس دور کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادداشتیں نکالیں۔ اور ان کو ترتیب وار دیکھنا شروع کیا۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ اس موضوع پر کسی روزنامے کے لئے، سیر حاصل مضمون لکھنا ممکن نہیں۔ داستان بہت طویل تھی۔ جسے اگر بے حد اختصار سے بیان کیا جاتا۔ تو بھی ایک روزانہ اخبار کی تنگ دامانی۔

اُس کی طوالت و تفصیل کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹیلی فون پر حسرت سے یہ مشکل بیان کی۔ تو انہوں نے دوبارہ اصرار کیا۔ کہ خواہ مختصر ہی سہی۔ لیکن مضمون ضرور لکھنا ہو گا۔

بہر حال میں نے تعمیل ارشاد میں مضمون لکھ دیا۔ جو اپنے اختصار کے باوجود۔ امرتسر کے پورے دو صفحات پر پھیل گیا۔ چونکہ نیا عنوان تھا۔ اور اس سے قبل کسی نے اس موضوع پر کچھ لکھا نہیں تھا۔ اس لئے مضمون بہت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اور اکثر اخبارات و رسائل نے۔ اُسے اپنے ہاں نقل بھی کیا۔

اس واقعہ کے بعد۔ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آئے۔ کہ میں اقبال کی زندگی کے اس پہلو کو۔ پوری تفصیل سے۔ ایک کتاب کی صورت میں پیش کر دوں۔ میں کام کی نوعیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں۔ اقبال کے ان آخری دو برسوں کو۔ بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ اگر اس دور کی روئیداد کو۔ ضرباً تحریر میں لاکر محفوظ نہ کیا گیا۔ تو آئندہ نسلوں تک۔ معتبر و مستند حالات پہنچنے کی قطعاً کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ ان احساسات کے باوجود۔ میں بعض مجبورلوں کے باعث۔ اس کام کی تکمیل کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں انگلستان آ گیا۔ اور یہاں روزمرہ زندگی کی حدود میں۔ کچھ اس طرح عنان گیر ہوئیں۔ کہ اس کتاب کا خاکہ۔ ذہن میں آہستہ آہستہ وضو ہوتا گیا۔ تاہم مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تاثر نہیں۔ کہ میں اس کام سے کلبتہ کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اور اکثر یہ سوچتا تھا۔ کہ جو وہی حالات۔ سازگار ہوئے

اس فرض کی بجا آوری کی کوشش کروں گا۔

اس دوران میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ میرے عزیز دوست اے۔ ڈی ظہر بھی لندن تشریف لے آئے۔ وہ پاکستان ہائی کمیشن میں وزیر اقتصادیات تھے۔ لیکن میرے لئے تو اُن کی ذات ایک ایسے ہمدرد و عزم خوار مشیر کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کے گراں قدر مشوروں کی مجھے قدم قدم پر ضرورت تھی۔ اظہر صاحب کا علمی و ادبی ذوق اُن کی سخن سنجی و سخن فہمی اور سب سے بڑھ کر اُن کی دوست داری و محفل آسائی میرے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک وہ لندن میں رہے۔ اُن کی سدا بہار شخصیت کے طفیل مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں وطن سے چھ ہزار میل دُور پردیس میں بیٹھا ہوں۔

ہمارے درمیان اکثر اقبال پر گفتگو چھڑ جاتی تھی۔ اور یہ گفتگو بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اسی قسم کی ایک گفتگو کے دوران میں اظہر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اقبال کے آخری دو برسوں کی سرگزشت کیوں نہیں لکھتا میں نے جواب میں ایک عذر تو یہ پیش کیا کہ کتاب کے لئے جس قدر مواد درکار ہے۔ وہ یہاں نہیں بلکہ لاسو میں پڑا ہے۔ اور وہاں سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دستاویزوں اور مسودوں کا یہ انبار منگو انا بے حد مشکل ہے۔ دوسرا عذر یہ تھا کہ جب تک کوئی پیشتر کتاب شائع کرنے کی حامی نہ بھرے۔ میرے لئے قلم اٹھانا ممکن نہیں۔ اظہر صاحب نے ان دونوں کاموں کا ذمہ لے لیا۔ چنانچہ اُن کی ہمت و مستعدی ہے۔ یہ دونوں مشکلیں رفع ہو گئی ہیں۔ کتاب کے مواد کا بیشتر حصہ بھی لاہور سے

لندن پہنچ گیا۔ اور کتاب کی اشاعت کا بار اٹھانے کے لئے۔ اقبال اکیڈمی بھی آمادہ ہو گئی۔ اب میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ لہذا مجھے کتاب کی تحریر و تسوید کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ آج مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں۔ کہ اگر آٹھ ماہ بعد لندن نہ آتے۔ اور اُن کا دوستانہ اصرار مجھے اس کام پر آمادہ نہ کرتا۔ تو اس کتاب کا ایک لفظ بھی نہ لکھا جاتا۔ اور یہ سارا ذخیرہ میرے سینے ہی میں دفن رہتا۔

علامہ اقبال کی خدمت میں پہلی بار عرض ہونے کا شرف مجھے اُس وقت حاصل ہوا تھا۔ جب وہ میکلو ڈروڈ پر رہتے تھے۔ میں اُس زمانے میں کلج میں پڑھتا تھا۔ اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی چند روز کے لئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا سے میرا دُہرا رشتہ تھا۔ وہ میرے اُستاد تھے اور دوست بھی تھے۔ مولانا کا قاعدہ تھا۔ کہ وہ جتنے روز لاہور میں قیام فرماتے۔ پلاناغہ شام کو ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب سے میری نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا۔

ڈاکٹر صاحب مولانا اکبر شاہ خاں کے علم و فضل۔ اور اُن کی تاریخ دانی کے بڑے قدر دان تھے۔ اور مولانا کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ جب تک ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں موجود رہتے جو وہ بہت کم بولتے تھے۔ صرف ڈاکٹر صاحب کی باتیں سنتے تھے۔ مولانا کا مشہور تاریخی رسالہ عبرت باقاعدہ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ سے گذرتا تھا۔ اور وہ کبھی کبھی خط لکھ کر۔ مولانا کے کسی مضمون کی داد بھی دیتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں :-

”مخدومی۔ السلام علیکم

امسال عارفانہ نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی۔ اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ امیر خاں پر آپ نے خوب مضمون لکھا۔ خدا کے تعالیٰ اُس کے جانشینوں کو سچی ہدایت دے۔ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش ہو جائیں۔ صدیق رضی اللہ عنہ پر سچی خوب مضمون لکھا گیا ہے۔ میں نے اُن کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیئے تھے۔

ہمت اُوکشت بِلتِ راجو ابر

ثانی اسلام و غار و بدر و قسبر

ہمید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

”محمد اقبال“

ادھر مولانا کی یہ کیفیت تھی کہ وہ جب لاہور سے واپس نجیب آباد گئے تو اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے انہوں نے عجزت میں لکھا۔

”... بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور۔ کہ اُس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھ دار اور روشن دماغ شخص اقبال موجود ہے اور بڑا ہی بد نصیب ہے لاہور کہ اُس کے باشندوں نے۔ اقبال کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے۔ اور فیض یاب ہونے کی کما حقہ کوشش

لہ نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونگ۔ ہندوستان۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

نہیں کی۔ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے۔ کہ ہندوستان کی تاریخ میں پنجاب کے موجباتِ عظمت جب لکھے جائیں گے۔ تو اُن میں ڈاکٹر اقبال کا نام نمایاں حروف میں نظر آئے گا۔ اور ہر سیالکوٹی ولاہری اقبال کا نام لے لے کر فخر کرے گا۔ لیکن اُس کا یہ فخر ندامت و شرمندگی سے تبدیل ہو جائے گا۔ جب اس حقیقت کا انکشاف ہو گا کہ روسیہ کی شخص۔ صرف ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں چہرہ گھنٹے گزارنے۔ اور بعض مسائلِ علمیہ سمجھنے کے لئے۔ گنگا۔ جمن۔ ستلج۔ بیاس وغیرہ دریاؤں کو عبور کر کے۔ راوی کے کنارے لاہور میں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن لاہور میں رہنے والوں کو کبھی برسوں بھی اس امر کی خواہش نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر اقبال سے کچھ سُنیں اور پوچھیں۔“

میری رائے میں ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر۔ ایک مفکر۔ ایک فلسفی اور ایک شاعر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے ہمہ گیر فکر کی پہنائی میں سیاستِ اسلامی کو بھی بڑا نمایاں مقام حاصل تھا۔ خود انہوں نے مسلم لیگ کے خطبہٴ صدارت میں فرمایا تھا:-

”میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ۔ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسل اور متواتر تعلق کی بدولت، جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی رُوح سے، جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے



میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے۔ اسلام کی حیثیت کیا ہے۔“

ہاں ہمہ۔ یہ کہنا پڑے گا۔ کہ ڈاکٹر صاحب ایک سیاسی مفکر تھے۔ عملی سیاست دان نہ تھے۔ کم از کم اُن عام اور مروجہ معنوں میں سیاست دان نہ تھے جن میں مثلاً مسٹر جناح، سر فضل حسین اور مولانا محمد علی تھے۔ عملی سیاسیات میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے۔ کہ بسا اوقات موقع و محل کا خیال کرتے ہوئے، اور اپنے نظریے میں ترمیم و تغیر کر کے۔ فریق مخالف سے مفاہمت کر لینا پڑتی ہے یا پھر جب غنیم طاقت و رسوا۔ تو ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی خاطر اُس سے سمجھوتہ کر لینے میں بھی عار محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی وقتی سیاست سے چنداں واسطہ نہ تھا۔ یوں کہنا چاہیے۔ کہ اُنہیں ایک سنگامی لیڈر یا عملی کارکن کی بجائے۔ ایک مثالیت پسند یعنی ”آئیڈلیٹ“ کا مرتبہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے برسوں پہلے۔ اپنی بصیرت سے یہ تو محسوس کر لیا تھا۔ کہ بڑے عظیم ہند کے مسلمانوں کی نجات کا راز صرف یہ ہے۔ کہ اس خطہ ارضی کے اُن علاقوں کو، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، علیحدہ کر کے۔ ایک جداگانہ مملکت قائم کر دی جائے۔ لیکن جب اس تصور کو معرض عملی میں لانے کا وقت آیا۔ تو اُنہوں نے یہ سارا کام مسٹر جناح کے سپرد کر دیا تھا۔

ایک عملی سیاست دان کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو دو مختلف موقعوں پر کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پہلا موقع اُس وقت پیش آیا جب وہ ۱۹۲۶ء میں

پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور دوسرا موقع وہ تھا جب انہیں ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں مرتبہ بڑی شدت سے محسوس کر لیا تھا۔ کہ قدرت نے اُن کو اس قسم کے ادا لے اور معمولی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کونسل کی سہ سالہ میعاد ختم ہوئی۔ تو انہوں نے دوبارہ ممبر بننے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور گول میز کانفرنس سے تو وہ اس قدر برگشتہ خاطر ہوئے تھے۔ کہ استعفیٰ دے کر واپس چلے آئے پنجاب لیجسلیٹیو کونسل میں کامیاب ترین آدمی سر فضل حسین تھے۔ اور گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں۔ سب سے زیادہ کامیاب آغا خان اور چودہری ظفر اللہ خاں ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اقبال اور فضل حسین یا اقبال اور آغا حشاں یا اقبال اور ظفر اللہ خاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب انگیز سمجھی نہ تھا۔

جس شخص کی ساری عمر اس طرح بسر ہوئی ہو کہ س  
 اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں  
 کچھ سوز و ساز رومی کبھی تیج و تاب رازی  
 اور جس شخص کا اپنے متعلق یہ دعوائے ہو کہ س  
 سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تربیت اُس نے  
 آدم کو سکھاتا ہے آداب حسد ادنی  
 اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مانیٹیکو چیمینورڈ اصلاحات کے تحت قائم کی ہوئی  
 پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کی مضحکہ خیز فنسائیں۔ جہاں قبائلی غبیت کا زور و شور تھا۔

اور جہاں طاقت و اقتدار کا سرِ حشمہ۔ ایک طرف گورنر اور دوسری طرف دیہات کے چند بڑے بڑے ناخواندہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی انقلاب برپا کر دے گا۔ گویا جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کرنے اور اپنے نفس کو فریب دینے کے مترادف تھا۔

اقبال کا یہ دعوئے حرف بہ حرف صحیح ہے۔ کہ

زیارت گاہِ اہلِ غم و ہمت ہے لحدِ میری

کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

لیکن اسی اقبال کو۔ جب ہم نے گول میز کانفرنس میں بھیجا۔ تو ہم یہ پیش پاؤں فنادہ حقیقت نظر انداز کر گئے۔ کہ اس قسم کی کانفرنس میں سازش، ریشہ دوانی، خوشامد۔ اور منافقت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ وہاں بلاوجہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے۔ اور بوقتِ ضرورت جھوٹ بول دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال اس ماحول میں۔ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ اور مستعفی ہو کر واپس آ گیا۔

اقبال کو ہم نے ترجمانِ حقیقت بھی کہہ کر پکارا۔ اُسے ہم نے حکیمِ الامت کا لقب بھی دیا۔ اور اُسے شاعرِ مشرق کے نام سے بھی یاد کیا۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ کہ اقبال جس دور میں پیدا ہوا۔ اور جس معاشرے میں۔ اُس نے آنکھ کھولی۔ وہاں زندگی کی راہیں اتنی محدود و سوچ چکی تھیں۔ کہ اُسے محض کسبِ معیشت کے لئے اپنی عمر کا بیشتر حصہ۔ عدالتوں کی خاک چھانٹنے میں گزار دینا پڑا۔ یہ اقبال کا قصور نہ تھا۔ اُس معاشرے کا قصور تھا جو ہمارے دورِ زوال میں بلشی حکومت

نے ہم پر مسلط کر دیا تھا۔ اقبال کے دل میں ہمیشہ یہ کسک رہی۔ کہ جو کام اُسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ نہیں کر سکا۔ اور آخری عمر میں تو یہ احساس بہت قوی ہو گیا تھا۔ کلامِ اقبال کا ایک ذہین طالبِ علم۔ اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ یہ کسک محسوس کرتا ہے جو بعض اذیت نغمہ و آہنگ کے پردوں کو چیر کر۔ ایک نالہء دل دوز کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اقبال کے جن آخری دو برسوں کی سرگذشت۔ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اُن میں۔ اقبال کا زادیہ نگاہ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ پنجاب لیجلیٹو کونسل کے اندر رہ کر۔ پنجاب کے مسلمانوں کی قبائلی عصبیت کا نقشہ دیکھ چکے تھے۔ خود غرض رہنماؤں نے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو جس بے ددی سے شہری اور دیہاتی طبقوں میں تقسیم کر کے۔ ملی مفاد کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ بھی اقبال کی چشمِ بصیرت کے سامنے تھا۔ ادھر انگریز کی سوس ملوکیت اور انڈین نیشنل کانگریس کی سوس ملک گیری بھی اقبال کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ ان حالات میں۔ اقبال کی طبیعت میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ اُس وقت ایک طویل اور خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ اس نازک موقع پر۔ قوم کو اُن کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ اسی جذبے نے۔ اُنہیں مئی ۱۹۳۶ء میں۔ پنجاب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ اور اسی جذبے نے اُنہیں قائدِ اعظم جناح کا ایک "سیاسی" بن جانے پر مجبور کیا۔

۱۔ اس کتاب کے تیرھویں باب میں اقبال کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "سٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا معمولی سا پیروں۔"

پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک۔ تین ادوار میں سے گذری ہے۔ پہلا دور  
 مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر اقبال کی وفات یعنی اپریل ۱۹۳۸ء میں ختم ہو گیا۔  
 دوسرا دور اقبال کی وفات کے بعد شروع ہوا اور سر سکندر حیات خاں کے انتقال  
 یعنی دسمبر ۱۹۴۲ء میں ختم ہوا۔ اور تیسرا دور سر سکندر کی وفات سے شروع ہو کر  
 اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ میری پختہ رائے ہے کہ جب تک ان تینوں ادوار  
 کی مفصل تاریخ نہ سمجھ لی جائے۔ ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ قطعاً سمجھ میں  
 نہیں آسکتا۔ پہلے دور کی تاریخ تو میں نے اپنے ناچیز فہم کے مطابق مرتب کر دی  
 ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی۔ اور معاش کی مجبوریوں نے کچھ عرصے کے لئے ہمت  
 دی۔ تو شاید دوسرے اور تیسرے دور کی تاریخ بھی اسی طرح مرتب ہو جائے  
 حقیقت یہ ہے کہ یہ کام حکومت کا تھا۔ جس کے بے اندازہ وسائل سے گذشتہ  
 بارہ سال سے۔ پاکستان کے بہت سے اہل دانش و بینش متمتع ہو رہے ہیں  
 نہ کہ مجھ ایسے فقیر بے نوا کا۔ جسے محض جان و جسم کا رشتہ بجالا رکھنے کے لئے  
 انگلستان میں صبح و شام مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اور جو بڑی حد تک فراغت  
 و اطمینان کی دولت سے بھی محروم ہے۔

تذرت ہوئی سنا تھا کہ حکومت نے، حصول پاکستان کی جدوجہد کی  
 ایک جامع تاریخ لکھنے کے لئے، علماء و فضلاء کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس  
 دوران میں۔ بار بار حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا  
 کہ اس کمیٹی کا کیا حشر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کمیٹی کے ذرائع معلومات بہت  
 وسیع اور زرخیز ہوں گے۔ اور اس کے راستہ میں۔ وہ مالی دشواریاں بھی

حائل نہیں ہوں گی۔ جن کا شکار تصنیف و تالیف کا شغل رکھنے والے لوگ بالعموم ہوتے ہیں۔ مجھے اُس کمیٹی کے اراکین سے ہمسری کا، حاشا وکلا، کوئی دعویٰ نہیں۔ اور نہ میں اس قسم کی گستاخی کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ لیکن اتنا عرض کرنا تو شاید سوء ادب میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ کہ اب تک اُس کمیٹی کی کوششوں کا کوئی قابل ذکر نتیجہ، کم از کم، میری نظر سے نہیں گذرا۔

مجھے اندیشہ ہے، کہ شاید اس کتاب کے نام سے، بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ کہ میں نے اقبال کی زندگی کے آخری دو برسوں کی تمام جزئیات کا اعاطہ کیا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں۔ کہ اس قسم کی غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے گذارش ہے کہ میں نے اقبال کی بیماری یا اُن کی شاعری یا اُن کی خانگی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں نکھا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اقبال نے اپنے آخری دو برسوں میں پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو فروغ دینے۔ اور مشرجناح کی ہسم کو کامیاب بنانے کے لئے جو کچھ کیا تھا۔ اُس کی ایک جامع اور مستند روئیداد مرتب کر دی جائے۔

مشرجناح، جب ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو، مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کے لئے، ناہر تشریف لائے تھے، تو یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں نے، اُن کی بات ماننے، اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے سے، انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کے بعد، مشرجناح نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر، امداد و اعانت کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے ہر ممکن مدد دینے کا بہ طیب اظہار وعدہ کیا۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۳۶ء سے لے کر اپنے یوم وفات یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۷ء تک، اقبال

نے اپنی صحت کی دامانڈگی کے باوجود، جس گرم جوشی، اناہک اور جہات سے مسٹر جناح کی مدد کی۔ اور جس خلوص و صداقت سے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو فروغ دینے کی سعی فرمائی۔ یہ کتاب اُس جتد و جہد کی ایک دلچسپ اور سبق آموز تاریخ ہے۔

۱۹۲۳ء میں۔ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشراف نے۔ اقبال کے تیرہ خطوں کا ایک مختصر مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ خطوط ڈاکٹر صاحب نے۔ ۲۳ مئی ۱۹۲۳ء سے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۳ء تک، مختلف اوقات میں اسٹر جناح کو لکھے تھے۔ اس مختصر مجموعے کے دیباچے میں۔ قائد اعظم فرماتے ہیں۔ کہ

..... مسلم لیگ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ کہ اُس کی

قیادت کو مسلمانوں کی اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے قبول

کر لیا۔ لیگ کو اس منزل کا مرانی تک پہنچانے میں۔ سر محمد اقبال

کی کوششوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اگرچہ عوام کو اُس وقت۔ ان

کوششوں کا علم نہیں ہو سکا..... میرے نزدیک یہ خطبے حد

تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص وہ خطوط۔ جن میں اقبال

نے۔ اسلامی ہند کے مستقبل کے بارے میں۔ اپنے خیالات کا نہایت

واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اظہار کیا ہے۔“

میری اس کتاب کو۔ اقبال کی ان کوششوں کا جن کی طرف قائد اعظم

نے سٹیور بالائی میں ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ ایک منقطع اور منسوط تہ کردہ سمجھنا چاہیے۔

میں نے جب اس کتاب کا خاکہ مرتب کیا۔ تو مجھے محسوس ہوا۔ کہ اگر اس

داستان کو۔ یک لخت مئی ۱۹۳۶ء سے بیان کرنا شروع کیا۔ تو بحث کے متعدد پہلو تشہرہ جائیں گے۔ بہت سے نکتے صاف نہیں ہو سکیں گے۔ اور بہت سی الجھنیں جوں کی توں قائم رہیں گی۔ مثلاً اگر ہم ماضی کے اہم گوشوں پر سے نقاب اٹھائے بغیر۔ ایک دم یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ مئی ۱۹۳۶ء میں۔ یونینسٹ پارٹی نے۔ مسٹر جناح سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو نا محالہ دورِ حاضر کا ایک نوجوان، جو حال ہی میں اپنی تعلیم ختم کر کے بلج سے نکلا ہے، سوال کرے گا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی؟ یہ جماعت کب اور کیوں نکری تھی؟ اس پارٹی کے کیا اصول تھے؟ اس پارٹی نے پنجاب کی سیاسیات میں کیا حصہ لیا تھا؟ یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے سے کس بنا پر انکار کیا تھا؟ اقبال اور جناح کو یونینسٹ پارٹی سے کیا اختلاف تھا؟ عزتیں اس نوع کے بے شمار شکوک و شبہات ہی نہیں۔ بلکہ اہم سوال دل میں پیدا ہوں گے۔ جن کا تشریحی بخش جواب دیئے بغیر۔ ہم اس داستان کو ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

وقت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور سیاسی حالات میں۔ جس سرعت سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان کے پیش نظر کل کی بات۔ آج گویا برسوں کی پرانی بات معلوم ہونے لگتی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جو نئے نئے تھے وہ آج جوان رعنا بن چکے ہیں۔ جو لوگ اس وقت جوان تھے وہ آج پیری کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں۔ اور جو کہن سال تھے۔ وہ مدت ہوئی اس رباڑا کہنے سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج کے نوجوان کو کچھ معلوم نہیں



کہ یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی۔ کب اور کیونکر بنی تھی۔ اور مسلم لیگ سے اس کا  
تصادم کن اسباب کی بنا پر ہوا تھا۔ اُس نوجوان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پنجاب کے  
مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تقسیم کس نے پیدا کی تھی۔ اس تقسیم کا  
ہماری سیاست پر کیا اثر پڑا تھا۔ اور انجام کار اس تقسیم کے ہاتھوں، ہم کن  
مشکلات کا شکار ہو گئے تھے۔

ان تمام اُمور کی وضاحت۔ اور تمام عقدوں کی گرہ کشائی کے لئے۔ یہ ضروری  
ہے کہ میں یونینسٹ پارٹی کی بنیاد، تعمیر اور شہری اور دیہاتی تفرقے کی تقسیم کی  
داستان کو۔ کسی قدر تفصیل سے بیان کروں۔ تاکہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان۔ جو  
اقبال کے آخری دو برسوں کی اس سرگذشت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُس  
پس منظر سے بھی کما حقہ واقف ہو سکیں۔ جس نے ان تمام قومی فتنوں کو  
جنم دیا تھا۔ نظری نے کیا خوب کہا ہے۔

خلقِ رافتہ! ایں شہرِ فراموش شدہ

زخمِ پنهانِ بنائیم و خیرِ تازه کنیم

چنانچہ انہی خیالات و احساسات کے زیر اثر۔ میں نے اس کتاب کو دو  
حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ، جس کا عنوان پس منظر ہے۔ گویا اسباب و  
علل کی وہ کڑی ہے۔ جس کے طبعی نتائج آگے چل کر رونما ہوئے۔ اور جن نتائج  
سے۔ عہدہ برآ ہوئے کے لئے۔ قدرت نے اقبال اور جناح کے درمیان۔ ذوق و نظر  
کی یکسانیت اور فکر و عمل کی وحدت پیدا کر دی۔ جب تک اس پس منظر کا  
بغور مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ آئے واسے دور کی ماہیت یا تفصیل کا سمجھنا محال ہے۔

130410

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

اقبال کے ان آخری دو برسوں میں، جن کا مرقح آپ کو اس کتاب کے اوراق پر نظر آئے گا۔ جن اصحابِ عزم و ہمت تھے۔ اقبال کی زیرِ ہدایت، ملک و ملت کی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین غلام رسول خاں، پیر تلج الدین اور ملک زمان ہوسلی خاں کے اسمائے گما می بڑی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ ان لوگوں نے حد درجہ تا مساعد حالات کے باوجود، پنجاب میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا۔ اور پھر اُس پرچم کو، ایک لمحہ کے لئے بھی، سرنگوں نہ ہونے دیا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر رہے گا۔ کہ، اپنے علم و عمل کی بے مانگی کے باوجود میں بھی اُس پر خطر و ور میں۔ ان واجب الاحترام دوستوں کا شریکِ کار تھا۔ میں عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا۔ قابلیت، تجربے اور سیاسی فہم و ذہانت میں بھی۔ ان سب سے فروتر تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان دوستوں نے۔ مجھے اپنے برابر مسند پر جگہ دی۔ بڑی سے بڑی ذمہ داری کا کام سیکرٹری سپروڈ کیا۔ اور اکثر موقعوں پر۔ میری رائے کو اپنی رائے پر فوقیت عطا کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر آج ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین اور غلام رسول خاں زندہ ہوتے۔ تو یہ کتاب لکھنے کا فائق حتیٰ اُنہی کا تھا۔ افسوس کہ ان لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد۔ اس فرض کی بجا آوری مجھے ہی چھپان کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ عالی نے یہ کہہ کر شاید میرے ہی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

کر دیا فر کے یگا اڑوں نے یگا نہ ہم کو  
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگا نہ سرگز

میں نے جب ابتداء میں۔ غلام رسول خاں کی معیت میں۔ لیگ کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ تو مجھے اُن کے مزاج کی تیزی سے ڈر لگتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ شاید ہم زیادہ دیر تک اکٹھے کام نہیں کر سکیں گے لیکن تھوڑی مدت گزرنے پائی تھی کہ ہم بالکل شیر و شکر ہو گئے۔ غلام رسول خاں دل کے صاف۔ زبان کے کھرے اور عمل کے بے لوث تھے۔ اُنہیں اپنے الفاظ کا بے حد پاس تھا۔ چنانچہ وہ جو کچھ کہتے تھے۔ اُس پر چٹان کی طرح جم کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کی اسی ادائے۔ مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ غلام اقبال جب ۱۹۳۳ء میں افغانستان تشریف لے گئے تھے تو غلام رسول خاں اُن کے سکریٹری کی حیثیت سے ساتھ گئے تھے۔

پیر تاج الدین کی باغ و بہار شخصیت۔ تمام دوستوں کے لئے ایک نعمت تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے تو اُن کی بڑی پرمانی یاری تھی۔ اور بے تکلفی بھی غایت درجہ تھی۔ قائد اعظم سے بھری محفل میں مذاق کرنے۔ اور اُن پر فقرہ چست کرنے کا حوصلہ بھی پر صاحب ہی کو تھا۔ قائد اعظم اُن کے مزاج سے واقف تھے۔ اسلئے ہمیشہ ایسے موقع پر۔ ہنس کر ٹال جاتے۔

ملک برکت علی کی محبت و شفقت آفریں یاد سے۔ آج بھی آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک پیکرِ صدق و صفا اور مجتہدِ خلوص و محبت تھے۔ پنجاب کا کیا ذکر ہے۔ ہندوستان بھر میں اُن کے پائے کے بہت کم آدمی پیدا ہوئے ہیں۔ اُنہیں جناح سے عشق تھا۔ ملک برکت علی کی عظیم الشان شخصیت سے ہٹ کر۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں۔ بلکہ

نامکن ہے۔ وہ تنہا ایک انجن کا کام کرتے تھے۔ بٹھابغا سیاست گردی سے کوئی رعیت نہیں۔ لیکن یہ ملک برکت علی کے اصرار کا نتیجہ تھا۔ کہ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دس بارہ سال سیاست کی خوفا آرائیوں کی نذر کر دیئے۔

شروع میں خیال تھا کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی جائے گی۔ اس طرح سب سے بڑی سہولت یہ پیش نظر تھی کہ کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے جس قدر مواد میسر آسکا۔ وہ تمام تراجم انگریزی میں تھا۔ اگر کتاب انگریزی میں لکھی جاتی تو اس سارے مواد کا اردو میں ترجمہ کی محنت سے میں بچ جاتا لیکن بعد میں چند دوستوں نے اردو کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور فرمایا۔ کہ اگر ہم لنگوں نے بھی اپنی قومی زبان سے غفلت برتی۔ تو پھر اس ضمن میں۔ اہمیت کیا توقع کی جاسکتی ہے بہر حال میرا خیال ہے۔ کہ شاید آگے چل کر۔ اس کتاب کا ایک انگریزی ایڈیشن بھی تیار کرنے کی نوبت آئے گی۔

کتاب کا مواد فراہم کرنے میں۔ جس چیز نے زیادہ پریشان کیا۔ وہ لاہور۔ دہلی۔ کلکتہ وغیرہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کے۔ ہیں پچیس سال قبل کے۔ پڑانے پرچے تھے۔ بعض پرچے تو میرے کاغذات میں پہلے سے موجود تھے اور جو موجود نہیں تھے۔ ان کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ بہر کیف ذرا ہا شکرت ہے۔ کہ جن پرچوں کی ضرورت پیش آئی۔ وہ سچی بیار کے بدرجائے وقت پڑل گئے۔ البتہ اس سلسلے میں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ قائد اعظم کے بعض بے حد مہنطور جوانوں نے ملک برکت علی کو لکھتے تھے۔ دستیاب نہ ہو سکے۔

ملک صاحب کا قاعدہ تھا۔ کہ وہ ضروری کاغذات کا ایک ایک پرزہ بڑی

احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے۔ تاہم اعظم کے ان خطوں کو بھی۔ انہوں نے ایک بہت بڑے لفافے میں بند کر کے۔ اپنی کتابوں کی الماری میں مقفل کر رکھا تھا میں نے یہ خطوط ملک صاحب کی زندگی میں کئی بار دیکھے تھے۔ اب اس کتاب کے لکھنے کی نوبت آئی۔ تو ان خطوں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ تمام خطوط ضائع ہو گئے ہیں۔ اس متاعِ گہراں مایہ کے تلف ہونے کی۔ جو مختلف روایتیں پیش کی گئی ہیں۔ خدا شاہد ہے۔ مجھے اُن میں سے۔ ایک روایت بھی قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتی۔

غلام رسول خاں کے پاس بھی۔ بعض اہم دستاویزیں موجود تھیں۔ جو اگر آج مل جاتیں تو اس کتاب کی معنوی حیثیت زیادہ بلند ہو جاتی۔ لیکن افسوس کہ یہ ذخیرہ سبھی۔ اُن کی وفات کے بعد ضائع ہو گیا۔ غلام رسول خاں کا انتقال مارچ ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا۔ میں اُس وقت لاہور سے باہر تھا۔ جب اُس آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُن کی لائبریری کی قانونی کتابیں تو بعض دکھانے قیمت ادا کر کے خرید لی ہیں۔ اور کاغذات کے انبار کو۔ بے کار سمجھ کر جلا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اُسی انبار میں۔ بعض ایسے نوادر بھی تھے۔ جو آج میرے لئے چاندی اور سونے سے بڑھ کر قیمتی ثابت ہوتے۔

یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک کتاب کی طباعت و اشاعت کا تعلق ہے۔ اُس کی ذمہ داری اقبال اکیڈمی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ کی صداقت کا میں ذمہ دار ہوں۔

لندن کی مصروف دگر انبار زندگی کے جھمیوں - اور نان و نمک کے دھندوں سے - بعد شکل فرصت کے چند گھنٹے نکالنا - اور پھر ان چند گھنٹوں کو - برطش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری کے ایک گوشے میں بیٹھ کر - اس طرح خرچ کرنا کہ کم سے کم وقت میں - زیادہ سے زیادہ کتابوں اور اخباروں کو کھنگالا جاسکے - ایک ایسا ٹیڑھا کام تھا - جس سے خوش اسلوبی کے ساتھ - عہدہ بہر آہونے کا سلیقہ مجھے کبھی نہ آیا - یوں بھی ، فراغِ خاطر و جمعیتِ قلب کی وہ آسائش - جو تصنیفی کام کے لئے سب سے ضروری چیز ہے - اس تمام عرصے میں - مجھے ایک روز بھی بیسیر نہ آسکی - وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ :

خاطر مسلسل است و پریشاں چو زلفِ یار  
عیبم مکن کہ در شبِ ہجران نوشتہ ام

عاشق حسین، بٹالوی

لندن :-

۱۵ مئی ۱۹۵۹ء

Marfat.com  
Marfat.com  
Marfat.com

# سرمایہ اور دوا کی حکومت

۱۹۱۹ء کا جلیاں والا باغ ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا اہم موڑ ہے جس کے بعد اس بڑے عظیم کی سیاسیات نے یکسر نیا رخ اختیار کر لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب سے ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تھی۔ یہاں صحیح معنی میں صرف دو انقلاب آفریں واقعات پیش آئے۔ ایک ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ عظیم اور دوسرا جلیاں والا باغ کا حادثہ۔ تو اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ دونوں مرتبہ تاریخ کے دو بالکل نئے باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھلے گئے اور دونوں بار ہمیں سیاسیات کے ایسے عقبدوں کی گہرہ کشائی کرنا پڑی جن کے دُور رس نتائج کا پہلے سے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آزاد و خود مختار ہندوستان کی وہ مدہم سی سمت جو نال قلعہ کے درو دیوار پر روشنی ڈال رہی تھی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اس ملک میں مضبوط اور مضبوط تر ہو گئیں اس کے بالکل برعکس بائیسٹھ سال کے بعد جلیاں والا باغ کے حادثہ نے جس قومی تحریک کو جنم دیا تھا۔ اسی تحریک نے آگے چل کر ہندوستان میں برطانوی



حکومت کی جہڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اور اسی تحریک نے ایسے برگ و بار پیدا کئے جن کی آب و تاب سے آج بڑے عظیم کے دونوں ملک یعنی بھارت اور پاکستان جگمگا رہے ہیں۔

جلیاں والے باغ کا حادثہ خونیں کا صرف ایک شخص ذمہ دار تھا۔ سر مائیکل اوڈوائئر۔ جس نے مئی ۱۹۱۳ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک پنجاب پر حکومت کی۔ قدرت کی یہ بہت بڑی ستم ظریفی تھی کہ اُس نے سر مائیکل کو بیسویں صدی کے رُبحِ اول میں پنجاب کا حکمران بنایا۔ حالانکہ وہ اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے اس قدر شوریدہ سر۔ مطابق العنان اور بے لگام شخص تھا کہ اُسے اُنیسویں صدی کے رُبحِ اول میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ مائیکل اوڈوائئر جب ۱۹۱۳ء میں پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بن کر آیا تو اُس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس صوبے کی تعلیم یافتہ جماعت کو ایسا کچل کر رکھ دے کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔ اوڈوائئر کا خیال تھا کہ پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ جن میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ صبح و شام انگریزی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اخبارات میں انگریزوں کا تختہ اُلٹ دینے والے مفاہین چھپتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر۔ سکولوں کے مدرس۔ عدالتوں کے وکلاء اور جرائد و رسائل کے ایڈیٹر باہم مل کر ایسی انجمنیں بناتے ہیں۔ جن میں برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں۔ اسی قسم کے بے سرو پا اور دُوراز کار اقدام نے بڑھتے بڑھتے اُسے اس قدر مضطرب اور پریشان کر دیا تھا کہ وہ پنجاب میں کسی معمولی اور بے ضروری آئینی تحریک کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ

اُس نے پنجاب میں آنے کے فوراً بعد جو تقریر کی۔ اُس کے چند فقرے یہ ہیں:-

”مجھے صوبائی حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا کہ میرے پاس بعض لوگوں نے ایسی تجاویز بھیجا شروع کر دی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ اس صوبے کے نظم و نسق میں کیا کیا اصلاحات ہونی چاہئیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے عوام جو امیدیں اور آرزوئیں قائم کئے بیٹھے ہیں۔ مجھے اُن کی پذیرائی کیونکر کرنا چاہیئے۔ عدالتی اور انتظامی امور کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے کی بھی تحریک ہو رہی ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی خیالی اور غیر حقیقی باتیں اپنی جگہ کتنی ہی دلکش اور جاذب نظر کیوں نہ ہوں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ مختلف تجویزیں بھیجنے والے لوگ مجھے یہ بتاتے کہ حکومت کو اپنے اس اصل مقصد سے عہدہ ہٹا ہونے کے لئے کون سے بہتر ذرائع اختیار کرنا چاہئیں۔ تو وہ اپنی قوم اور اپنے صوبے پر زیادہ احسان کرتے۔ نیز میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کا یہ بنیادی مقصد (جان و مال کی حفاظت) دیگر تمام امور پر، خواہ ان کا تعلق حکومت کے نظم و نسق کی اصلاحات یا حکومت خود اختیاری کی تحریک سے ہو، بہر صورت مقدم ہے۔“

نظر بظاہر اوڈو واٹر کا خیال تھا کہ پنجاب میں انگریزی راج قائم ہونے کے  
چونسٹھ سال بعد بھی یہاں لوگوں کا جان و مال قطعاً محفوظ نہ تھا۔ اور اُسے اپنی  
حکومت کے دوران میں جو سب سے بڑا کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ اس صوبے کے  
لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے۔ اور اُن کا مال بھی اعیانہ کی دستبرد سے بچ جائے  
اگر اوڈو واٹر نے سالہ ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں آکر عمالِ حکومت کی بے بسی۔ اور ارباب  
حل و عقد کی نااہلی کا یہ دل خراش نظارہ دیکھا تھا کہ یہاں نہ کسی کا مال  
محفوظ ہے اور نہ کسی کی جان و اُبر و محفوظ۔ تو انگریزی حکومت کا جس قدر  
ماٹم کیا جائے تھوڑا ہے۔ کہ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں بھی اپنی  
منظوم و مقہور رعایا کو امن و عافیت کی اُس ابتدائی نعمت سے بھی بہرہ ور  
نہ کر سکی جس کے بغیر روٹے زمین پر کوئی حکومت چار دن زندہ رہنے کا  
استحقاق نہیں رکھتی۔

ہم جان لارنس سے لے کر ٹوئی ڈین تک اُن متعدد انگریز مدبروں کے  
متعلق کیا رائے قائم کریں۔ جو ۱۸۴۹ء سے ۱۹۱۳ء تک پنجاب کے لفٹنٹ  
گورنر رہ چکے تھے؟ کیا یہ سب کے سب اس قدر نااہل اور بے تدبیر لوگ تھے کہ  
اس صوبے کے عوام کو جان و مال کی حفاظت کا بھی اظہیان نہ دلا سکے؟ کیا  
ان میں سے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جس پر یہ نکتہ منکشف ہوا ہو کہ حکومت کا  
اصل مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے؟ ایچسین  
لائل، فٹنر سٹرک، نیگت۔ ریلواز۔ ایٹسن، ٹوئی ڈین۔ یہ چند نام پنجاب کی  
تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اور بہت سے لوگ اب بھی ان ناموں کا

احترام کرتے ہیں۔ لیکن سرمایہ کیل اور ڈائری کا خیال تھا کہ اُس کا کوئی پیش رو نہ تو حکومت کے حقیقی مقصد سے آگاہ تھا۔ اور نہ عوام کی بنیادی ضروریات ہی سے اس کو واقفیت تھی۔

۱۹۱۳ء میں سٹی آئینی اصلاحات کے اعتبار سے پنجاب ہندوستان کے اکثر صوبوں سے پیچھے تھا۔ بعض صوبوں میں لفٹنٹ گورنر کی مدد کے لئے ایگزیکٹو کونسل موجود تھی۔ جس میں اگرچہ نامزدگی کا اصول کارفرما تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں کے مقامی باشندوں کا ایک آدھ نمائندہ صوبہ کے حاکم اعلیٰ کی اعانت کے لئے کام کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں پنجاب میں بھی یہ تحریک اُٹھی کہ لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا نظم و نسق بہتر طریق پر چلانے کے لئے ایگزیکٹو کونسل قائم کرنا چاہیے۔ سرمایہ کیل اور ڈائری اس تحریک پر سخت ناراض ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اول تو صوبے کے لوگوں کو حکومت کے کاموں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دوم اُن کی اپنی ذات پورے پنجاب کے امن و عافیت اور اس کی ترقی و کامرانی کے لئے کافی ہے۔ اور ڈائری سمجھتا تھا کہ اس تحریک کے پیچھے بھی پنجاب کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ غنہ کام کر رہا ہے۔ جو بیاطن، باغیانہ خیالات رکھتا ہے۔ لیکن بظاہر آئینی اور دستوری تحریکوں کا علم بردار بنا رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے ایگزیکٹو کونسل کے قیام کی تجویز کے جواب میں ۳۱ اپریل ۱۹۱۴ء کو جو تقریر کی۔ وہ اس کی امانیت کی بڑی حد تک عکاسی کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

”مجھے یہ تجویز سن کر بے حد تعجب ہوا ہے۔ اس صوبے کے لوگ ابتدا سے لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا تنہا حاکم اعلیٰ اور یہاں کے نظم و نسق کا

پلاشرکتِ غیرے واحد ذمہ دار سمجھنے کے عادی ہیں۔ اس نظام کے تحت پنجاب نے خوب ترقی کی ہے۔ اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ضمن میں پنجاب سندھوستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا۔ پھر بتائیے کہ ایگزیکٹو کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ یہاں کے نظم و نسق میں بعض ایسی خرابیاں ہیں جن کا تدارک ایگزیکٹو کونسل کے بغیر نہیں ہو سکتا تو میں شاید اس تجویز پر غور کر سکوں گا۔“

بنا سہراؤڈو امریکا مطلب یہ تھا کہ ”جو کچھ مابعد دولت کم کورتیے ہیں۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ جو کچھ سرکار تمہارے لئے سوچتی ہے۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے اور پنجاب کے حال اور مستقبل کے بارے میں جو تجویز لاٹ صاحب کے ذہن میں آتی ہے۔ اسی میں تمہاری خیر و عافیت ہے۔ اس لئے کسی ایگزیکٹو کونسل یا کسی ایسی جماعت کی جس میں جمہور کے نمائندے شریک ہو کر نظم و نسق میں حصہ لے سکیں قطعاً ضرورت نہیں۔ نہ اس قسم کی کونسل یا نمائندہ جماعت سے صوبے کے انتظام و انصرام کو کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔“

اگر اوڈو امریکا کے اس نظریے کو تسلیم کر لیا جاتا تو سندھوستان میں آئینی اور دستوری اصلاحات ایک قدم آگے نہ بڑھا سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوڈو امریکا ذہنی طور پر اس معمولی اور بے حقیقت سی نمائندہ حکومت کا بھی حامی نہیں تھا جو نڈو مار لے اصلاحات کے تحت ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں قائم تھی۔ مسلمانوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ان کا تعلیم یا نہ شہری طبقہ ترکیباً افغانستان کے ساتھ

مل کر ہندوستان میں شورش برپا کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں اُس نے ظفر علی خاں - محمد علی - انصاری - عبید اللہ سندھی اور برکت اللہ بھوپالی وغیرہ کو نام لے لے کر مطعون کیا ہے۔ وہ یہ سبھی کہتا تھا کہ تمہاری افغانستان اور حبر منی سے ہندوستان کے شورش پسند مسلمانوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں۔ اور اس روپے کو برطانیہ کا تختہ الٹ دینے کے لئے بے دریغ ہندوستان میں خرچ کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے بائے میں ایڈوائزر کی رائے سنی کہ ان کا تعلیم یافتہ شہری طبقہ سبھی برطانیہ کے دشمن ممالک سے ساز باز کر کے ہندوستان میں باغیانہ خیالات پھیلانے اور مسلح شورش برپا کرنے میں دن رات مصروف رہتا ہے۔ لاجپت رائے - پرمانند - اجیت سنگھ - ہر دیال - ہند پر تاپ وغیرہ اس سازش کے سرغنہ ہیں۔ اور ان کے توسط سے ہندوستان میں انقلاب برپا کرنے کی تیاریاں بڑی گرم جوشی سے ہو رہی ہیں۔

ایڈوائزر نے لفٹنٹ گورنر کی کرسی پر بیٹھتے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جانزدانا جائز، سر ممکن طریقے سے پنجاب کے تعلیم یافتہ طبقہ کی ان سازشوں کو جن کا وجود حقیقتاً اُس کے نہاں خانہ دماغ سے باہر کہیں نہیں تھا ختم کر کے چین سے گا۔ مصیبت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اکثر بیشتر انگریز حکم ذہنی طور پر اس قدر خوف زدہ ہو چکے تھے کہ انہیں ہوا کے عمومی اور بے ضرر قسم کے سیاسی احتجاج سے سبھی بغاوت اور غدر کی چنگاریاں پھوٹی نظر آتی تھیں۔ اور وہ یقیناً اس قبیل کا ماؤت ذہن رکھنے والا انسان تھا۔

اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے جو تجویز اُسے سب سے آسان اور مفید نظر آئی۔  
 وہ یہ تھی کہ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو کسی نہ کسی طرح شہری آبادی کا حریف  
 بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ دیہاتی آبادی کی کثرت اور دیہات میں بسنے والے لوگوں  
 کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر سیاسی تحریکوں کو کچل سکے۔ اوڈوائٹر کو نہ لوگاؤں  
 کے لوگوں سے محبت تھی۔ اور نہ شہر کے باشندے اُس کو عزیز سمجھتے۔ وہ تو محض  
 ایک سیاسی چال سوچ رہا تھا۔ جس سے بیک وقت دو فائدے مد نظر تھے  
 ایک یہ کہ دیہاتیوں کو ممنون احسان بنا کر اُنہیں یقین دلادیا جائے کہ شہری  
 باشندے اُن کے دشمن ہیں۔ اور حکومت خود اختیاری یا آئینی اصلاحات  
 کے لئے شہروں میں جو شور اٹھ رہا ہے۔ وہ محض مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگوں کی  
 شرارت ہے۔ جس سے وہ خود آگے بڑھنا اور دائرہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔  
 دوم یہ کہ دیہاتی آبادی کو شہر کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بدگمان کرنے کے بعد وہ  
 نہایت آسانی سے آئینی اصلاحات کی تحریکوں کو ختم کر سکے گا۔ اور یہ کہنے کے  
 قابل ہو جائے گا کہ پنجاب کی انٹی فیصدی آبادی مردِ جہ آئین دو ستور میں کسی تبدیلی  
 کی خواہاں نہیں۔ لہذا کم از کم پنجاب کو مزید اصلاحات سے مستثنیٰ رکھا جائے۔  
 اوڈوائٹر کی یہ تجویز بڑی خطرناک تھی۔ اور اُس نے ایک ہوشیار شاہ  
 کی طرح اس تجویز کو بروئے کار لانے میں شطرنج کے ہر ہرے کو نہایت احتیاط  
 سے حرکت دی۔ لیکن ایک طرف تو اُس کی بدقسمتی سے خود برطانیہ میں بعض  
 اس قسم کے عناصر کارفرما ہونے لگے۔ اور وہاں ایسے افراد برسرِ اقتدار ہو گئے جن  
 کے سامنے اوڈوائٹر کو پیش نہ چل سکی۔ اور دوسری طرف اُس کا جوش اور غلو

خود اُس کے لئے دو دھاری تلوار ثابت ہوا۔ مسٹر مانٹلیگ کے وزیر ہند بننے کے بعد  
 اوڈواٹر کی سوچی سمجھی ہوئی تجویزیں اس لئے حسبِ منشا نتائج پیدا نہ کر سکیں کہ وزیر ہند  
 موصوف اور لارڈ چیمس فورڈ وائسرائے دونوں ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے  
 کے حامی تھے۔ اداہر اُس نے پنجاب میں مارشل لا جاری کر کے۔ اور جلیان والے  
 باغ کی زمین کو محبانِ وطن کے خون سے رنگین کر کے خود اپنے لئے اکیسی آرمائش  
 کھڑی کر لی تھی جو انجام کار اُس کی ساعتِ موعودہ اور طاقتِ اکبرانہ ثابت ہوئی۔  
 تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اوڈواٹر نے پنجاب میں دیہاتی  
 اور شہری آبادی میں باہمی تفرقے کا جو بیج بویا تھا۔ وہ خوب رنگ لایا۔ اور  
 اس بیج سے جو خاردار جھاڑیاں اُگیں۔ انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ریاست  
 و معاشرت کو مسلسل تین سال تک رنج و محن میں مبتلا کئے رکھا۔ اس  
 تفرقے نے مسلمانوں کے قومی مفاد کو سراسر مصنوعی اور غیر حقیقی رخنوں میں تقسیم  
 کر دیا۔ اسی تقسیم کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں کی مجموعی طاقت جس نے مستفید  
 ہونے کے وہ ہر اعتبار سے مستحق تھے۔ کبھی متحد ہو کر نعیم کے مقابلہ میں صفا آزار نہ  
 ہو سکی۔ اسی تقسیم کے ہاتھوں ہر کاری ملازمت میں مسلمانوں کا وہ بے کار عنصر  
 داخل ہو گیا جو ہمارے اُس وقت کے برادرانِ وطن کے عنصر کے مقابلے میں بید  
 مکرور اور نرزدتر تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری قوم پر نالائقی اور  
 ناپلی کا دھبہ لگا گیا اور آخر میں یہ کہنا پڑے گا کہ اسی تقسیم نے وہ گل کوٹاٹ  
 کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے پنجاب میں اسلامی وحدت کے بتیازی اور مالگیر  
 اصولوں کو بے دردی سے قبائلی عصبیت کے بتوں پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا۔



جاٹوں کی الگ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ راجپوتوں نے اپنی علیحدہ مجلسیں کھڑی کر لیں۔ اعدائوں کے اڈے الگ قائم ہو گئے۔ مغلوں، پٹھانوں اور انیسویں لے اپنی اپنی الگ ٹولیاں بنالیں۔ اور ستم یہ ہوا کہ یہ تمام انجمنیں اس غرض سے قائم نہیں کی گئی تھیں کہ مسلمانوں کی مختلف برادریوں کے سرکردہ ارکان اپنے اپنے سجھائی بندوں کی تعلیم کا بہتر انتظام کریں۔ یا اپنی معاشرت کی اصلاح فرمائیں یا غیر ضروری اور مرفرانہ رسوم کا ازالہ کر کے قوم کی اقتصادی حالت کو درست کریں۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی حقوق کے بڑھارے میں جاٹوں کا کتنا حصہ نکلے گا اور راجپوتوں کے پلے کیا کچھ پڑے گا۔ مجلس قانون ساز میں مغل اور پٹھان کتنی نشستوں پر قبضہ کر سکیں گے۔ اور اعدائوں اور ٹولوں کو کتنی وزارتیں ملیں گی۔

اس نفسانفسی میں پڑ کر ہم یہ سچھل گئے کہ سنیوں میں جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے کے لئے ہندوستان کے پینتیس<sup>۳۵</sup> منتخب مسلمانوں کا وفد شملہ گیا تھا۔ تو اس وفد کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمان من حیث القوم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں۔ اور انیسویں کی چہرہ دستیوں کے مقابلہ میں اپنی مجموعی قوت کو منظم کر کے اس ملک میں عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جائیں۔ وفد کے اراکین کو شاید خواب میں بھی یہ بات نظر نہ آئی ہوگی کہ اس جداگانہ نیابت کے طفیل پنجاب کے مسلمانوں کو جو مراعات حاصل ہوں گی۔ ان سے متمتع ہونے کے لئے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ بلکہ جاٹوں۔ راجپوتوں اور پٹھانوں۔

مغلوں اور اعدائوں کی انگ انگ لڑیاں بن جائیں گی۔ اور یہ ٹولیاں اپنے  
اپنے قبیلے کے جھنڈے اٹھا کر۔ اور اپنے اپنے قبیلے کی عزت و ناموس کا واسطہ  
دے کر اپنے نامائزے منتخب کریں گی۔ سرائیکل اوڈوائر پہلا شخص تھا جس نے  
حد درجہ ہوشیاری اور چالاکی سے پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کو شہری مسلمانوں  
کا حریف بنا کر اس صوبے میں مسلمانوں کی قومی وحدت کو سخت نقصان  
پہنچایا۔

ایک بات مجھے بہت آگے چل کر کہنی چاہیے لیکن شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی

سلسلہ مجھے یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم لاہور آئے ہوئے تھے  
اور ملک خضر حیات ٹوانہ سے گنت دشتیہ شروع تھی۔ ایک روز ملک برکت علی نے قائد اعظم کو  
لپٹے ہاں چائے کی دعوت دی۔ دعوت کا انتظام کوٹھی کے سامنے گھاس کے میدان میں کیا گیا تھا۔  
لیکن عین وقت پر بایش آگئی اور تمام سامان کمروں میں راستہ کرنا پڑا۔ قائد اعظم صوفے پر تشریف فرما تھے  
اور ملک صاحب ہر دن منٹ کے بعد ہانوں میں سے کسی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں قائد اعظم کے  
پاس بٹھا دیتے تھے اور قائد اعظم ازراہ لطف و محبت دو، ایک باتیں کرتے تھے۔ حاضرین میں  
ملک اللہ دین بیرٹھی تھے۔ انہوں نے قائد اعظم سے ملنے کی خواہش ناہر کی۔ ملک برکت  
علی ان کا ہاتھ پکڑ کر قائد اعظم کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا۔ ملک اللہ دین پاس  
بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے: "یہ بتائیے پاکستان میں اعدائوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ قائد اعظم  
کو معلوم نہیں تھا کہ پنجاب میں کسی قوم کا نام اعوان سہی ہے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا  
"اعوان کیا؟" ملک اللہ دین بولے: "اعوان پنجاب میں مسلمانوں کی ایک مشہور قوم ہے۔"  
(باقی صفحہ پر)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

مصنوعی تقسیم کے مضر اثرات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔ اور اوڈوائس کی ان مذموم  
 کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے اُس نے اس تفریق کو خوب سوا دی۔ مجھے یہ  
 عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے اقتصادی مفاد  
 کی حفاظت کا سب سے مؤثر، سب سے اہم، سب سے نتیجہ خیز اور سب سے  
 زبردست عنصر جو انگریزی راج میں ایجاد ہوا۔ وہ ایک قانون تھا جسے عرف  
 عام میں قانونِ انتقالِ اراضی کہا جاتا ہے۔

اس قانون کی رُو سے پنجاب کے ہر ضلع کی آبادی زراعت پیشہ اور غیر زراعت  
 پیشہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ غیر زراعت پیشہ لوگ زراعت پیشہ قوم کے افراد  
 کی اراضی نہ تو خرید سکتے تھے اور نہ قرض کے بدلے نیلام کر سکتے تھے۔ یہ قانون لارڈ  
 کرزن کے عہدِ حکومت میں منظور ہوا تھا۔ جس سے بلا امتیاز مذہب و ملت پنجاب  
 کے تمام ہندوؤں۔ مسلمانوں اور سکھوں نے جو زراعت پیشہ قرار دیئے گئے تھے۔  
 یکساں فائدہ اٹھایا۔ اس قانون کے نافذ ہونے سے پہلے پنجاب کے زراعت پیشہ  
 لوگوں کی زمینیں قرض اور سود و سود کے چکر میں پڑ کر دستِ مند و سامو کاروں  
 کے قبضے میں جا رہی تھیں۔ اور اگر یہ قانون عین وقت پر منظور نہ ہوتا تو اس میں  
 کوئی شک نہیں کہ پنجاب کے تمام کاشتکار اور زمیندار اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو  
 بیٹھتے۔ اور خود حکومت کو اس قسم کے لاکھوں بے کار اور خانہ بدوش انسانوں

قائد اعظم نے فرمایا: "خدا کے لئے اس قسم کی بے کار باتیں نہ کیجئے۔ پاکستان مسلمانوں کا  
 مطالبہ ہے۔ اور یہ ملک تمام مسلمانوں کا قومی وطن ہو گا۔"

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

کی معاش کا مسئلہ حل کرنا پڑتا۔ جو اپنی زندگی سے تنگ آکر بڑے بھلے ہر قسم کے سیاسی انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

قانونِ انتقالِ اراضی کی سب سے بڑی مخالفت ہندو ساہوکاروں نے کی۔ ان کے بعد اس قانون کی مخالفت کرنے والوں میں شہروں کے وہ ہندو تھے جنہوں نے تجارت اور صنعت و حرمت سے لاکھوں کروڑوں روپے کمائے تھے۔ اور جنہیں اب اس بات کی ہوس تھی کہ وہ زمیندار کہلائیں اور بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بھی بنیں۔ یہ صحیح ہے کہ وسطی اور مغربی پنجاب میں مسلمان کاشتکاروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور ان کی معاش کا دار و مدار تمام تہ زرعی اراضی پر تھا لیکن اگر قرض اور سود کے چکر میں پڑ کر ان کی زمینیں فروخت ہونا شروع ہو جائیں تو سیدھی ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جاتیں۔ یا شہری ہندوؤں کا وہ تجارت پیشہ طبقہ ان کا مالک بن جاتا جو صنعت و حرمت کے ذریعہ سے اور متعدد بنک اور بیمہ کمپنیاں قائم کر کے لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ پیدا کر چکا تھا۔ اس پوری ٹوٹ کھوٹ، اس تمام بین دین اور اس سائے بیچ و شراب میں شہری مسلمانوں کا نہ کہیں وجود تھا اور نہ کہیں ان کا ذکر آسکتا تھا شہری مسلمان جانتے تھے کہ ان کے اور دیہاتی مسلمانوں کے مفادِ حقیقتاً مشترک ہیں۔ شہری مسلمان نسبتاً تعلیم یافتہ تھے۔ اور ان کی روزی کا انحصار زیادہ تر دفتروں کی ملازمت پر تھا۔ اور جو کسی قدر زیادہ پڑھ لکھ گئے تھے ان کو مددگی، ڈاکٹری اور وکالت میں قسمت آزمائی کرنا پڑتی تھی۔ لیکن ان تمام پیشوں میں انہیں ہندوؤں سے مقابلہ درپیش تھا۔ جن کے وسائل و

ذرائع مسلمانوں سے کہیں وسیع اور جن کی جتنھیں بندیاں مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر مضبوط تھیں۔ صنعت و حرفت یا تجارت میں تو یوں کہنا چاہیے کہ شہری مسلمانوں کو سندھوؤں کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے وہ مسلمان جو غیر زراعت پیشہ تھے۔ اور شہروں میں رہتے تھے اس حقیقت سے واقف تھے کہ قانون انتقال اراضی کی حفاظت کے بغیر ان کے دیہاتی بھائیوں کی زمینیں یقیناً سندھو سرہا یہ داروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی چنانچہ اس قانون کے نفاذ سے لے کر ۱۹۲۷ء تک شہری مسلمانوں نے کبھی قانون انتقال اراضی کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ سر شادی لال نے لاہور ہائی کورٹ کی چیف ججی کے زمانے میں جب بعض ایسے فیصلے صادر کئے جن سے اس قانون کے اثر و نفوذ میں ضعف پیدا ہوتا تھا۔ تو پنجاب کی مجلس قانون ساز کے تمام مسلمان ممبروں نے، جن میں دیہاتی اور شہری دونوں شامل تھے، فوراً ان فیصلوں کے جواب میں قانون انتقال اراضی کے ان تمام پہلوؤں کو پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کر دیا جن کی کمزوری سے ہائی کورٹ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۲۷ء میں لالہ لاجپت رائے کی کوشش سے لاہور میں اگر ڈال کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ تو ایجنڈے پر ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ قانون انتقال اراضی کو منسوخ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ کانفرنس کے منتظین نے پنجاب کے تمام شہروں کے ذمی اثر مسلمانوں کو، جو اتفاق سے غیر زراعت پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اس کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ قانون انتقال اراضی کا معاملہ ایک سراسر اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس کا

اثر صوبے کی تمام غیر زراعت پیشہ آبادی پر پیکساں پڑتا ہے۔ جس طرح مجلس قانون سازی کی یونینسٹ پارٹی میں زراعت پیشہ مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہو کر محض اقتصاد کی اصولوں پر اپنے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے تمام غیر زراعت پیشہ شہری مسلمانوں اور ہندوؤں کو سبھی اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے متحد ہو جانا چاہیے۔

بات بظاہر بالکل درست معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جن مسلمان اکابر کو دعوتی خطوط بھیجے گئے تھے انہوں نے اپنے مشترکہ دستخطوں سے اعلان شائع کیا کہ انہیں اس مجوزہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ ہر صورت اور ہر حال میں قانون انتقال اراضی کی حمایت کریں گے۔

اندریں حالات دیہاتی مسلمانوں کو بھرتے دے دے کر۔ اور غلط قسم کا اشتعال دلا کر شہری مسلمانوں کا حریف بنا دینا ایک ایسی قبیح حرکت تھی جس کو کوئی ذمی ہوش اور درد مند انسان معاف نہیں کر سکتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر اوڈوائٹر کے خیال کے مطابق پنجاب کے مسلمانوں کی شہری آبادی دیہاتی مسلمانوں کی بدخواہ اور حریف تھی۔ اور شہری مسلمان اپنے دیہاتی بھائیوں کے حقوق غصب کر کے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ تو خود اوڈوائٹر نے ریلوے لفٹنگ گورنر کے دیہاتی مسلمانوں کے لئے کیا کیا؟ کیا اُس نے پنجاب کے دیہات میں سکول قائم کئے تاکہ وہاں کی بے زبان آبادی اپنے بچوں کو کم از کم ابتدائی تعلیم ہی سے بہرہ ور کر سکے؟ کیا اُس نے دیہات میں شفاخانے قائم کئے تاکہ ہر سال ہیفیم، بخار، پیش اور طاعون سے ہزاروں کی تعداد میں جو خلقت ڈھور

ڈنکر کی طرح مرتی تھی اُس کے علاج معالجہ کی نہایت ادنیٰ سہولتیں سیراجائین  
 کیا اُس نے دیہات میں مویشیوں کی بیماری کی روک تھام کے لئے ہسپتال قائم  
 کئے تاکہ دیہاتیوں کی یہ سب سے بڑی متلع جس کے سہانے وہ موت لایموت حاصل  
 کرتے تھے موت کے ناگہانی حملوں سے محفوظ ہو سکے؟ کیا اُس نے اُس تشدد اور  
 اُن مظالم کا سد باب کیا جو آئے دن سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں دیہات  
 کے باشندوں کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ اور جن کی کہیں باز پرس نہ ہو  
 سکتی تھی؟ کیا اُس نے دیہات کے لوگوں میں اتنا شعور پیدا کیا کہ وہ اپنے  
 ملک کے نظم و نسق کو سمجھ سکیں اور اس بات کا اندازہ کرنے کے قابل ہو جائیں  
 کہ ہندوستان کی سہلائی اور پرائی کا انحصار کن امور پر ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے اُن چھ برسوں کی رُوڈ اور  
 پرائی سرسری سی نظر ڈال لینا کافی ہو گا۔ جو پنجاب نے سرائیکل اوڈوائز  
 کے سایہ عاطفت میں بسر کئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس نے پنجاب کے ضلع میں  
 اپنے حسبِ مشار اور اپنی پسند کے مطابق دو دو، چار چار آدمی منتخب کر لئے تھے۔ اور  
 اُن پر انعام و اکرام کی بارشیں شروع کر دی تھیں۔ یہ لوگ اوڈوائز کے  
 نمائندے تھے۔ اوڈوائز کی تجویزوں کے ہر حال میں موید اور حامی تھے۔ اور  
 اوڈوائز ہی کی مدد و تائید کے گیت گاتے تھے۔ اوڈوائز نے انہیں  
 خطابات سے سربلند کیا۔ جاگیریں بخشیں۔ نقد انعامات دیئے۔ سرکار دربار  
 میں کرسیاں عطا کیں۔ اور جب کبھی پنجاب میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں  
 ہوئے۔ یا تعلیم یافتہ جماعت نے سیاسی مراعات کے حصول کی جدوجہد کی۔

یا حکومت خود اختیاری کی تائید میں تحریک چلی تو اوڈواٹر نے بے دریغ ان دیہاتی آقاؤں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اور ان سے لمبے چوڑے محقر نامے اور اشتہار جاری کرائے کہ پنجاب بالکل مطمئن اور خوشحال ہے۔ اُسے ان گنتی کے چند شورش پسندوں سے کوئی تعلق نہیں جو محض اپنی ذاتی منفعت کے لئے حکومت خود اختیاری یا ہوم رول کا شور مچا رہے ہیں۔

چنانچہ سالہ ۱۹۱۶ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں ہندوستان بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے۔ اور مذہب و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر ہر طبقے نے اصلاحات کا مطالبہ شروع کیا تو اوڈواٹر نے فوراً ان دیہاتی آقاؤں کے ذمہ مرتب کئے۔ جنہوں نے لاٹھیاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شہروں کے شورش پسندوں کو مطلع کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اور بار بار اعلان کیا کہ اُنہیں مسلم لیگ اور کانگریس کی اس متحدہ تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو شہری باشندوں نے شروع کر رکھی ہے اور جس سے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

میں سربراہ نیکل اوڈواٹر کے شش سالہ عہد حکومت کی تفصیلات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ تفصیلات اس کتاب کا جزو بن سکتی ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تاثر نہیں کہ سالہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی مصنوعی اور غیر حقیقی تقسیم تھی۔ اور از بسکہ اوڈواٹر اس تقسیم کا سب سے بڑا مبلغ اور خالق تھا۔ اس لئے جب تک اُس کے اعمال و افعال کا تجزیہ نہ



کر لیا جائے اس تقسیم کا صحیح خاکہ اور اُس کے اصلی حدودِ حال سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسی تقسیم نے پنجاب کی سیاسیات میں یونینسٹ پارٹی کو جنم دیا۔ اسی تقسیم نے ۱۹۳۶ء کی نشاۃِ ثانیہ میں جناح اور اقبال کی آواز کو بے اثر بنا دیا۔ اور اسی تقسیم نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کو اس فریب میں مبتلا کئے رکھا کہ مسلم لیگ شہری لوگوں کی جماعت ہے۔ جس سے دیہاتیوں کو کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۱۷ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اور یوں کہنا چاہیے کہ سر مائیکل اوڈواٹر کی فطرت کے اُس حصہ کو جو بعض وجوہ سے دبا ہوا تھا۔ اُن غیر معمولی حالات نے جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے اُبھرنے کا خوب موقع دیا۔ سب سے پہلے اُس نے شہروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ جس کے متعلق اُس کا اندیشہ تھا کہ یہ لوگ سیاسی تحریکوں کے پشت و پناہ ہیں۔ قانونِ تحفظِ ہند کے اجراء و نفوذ کی سب سے زیادہ خواہش اور کوشش اوزڈواٹر ہی نے کی تھی۔ اور جب یہ قانون منظور ہو گیا تو اُس کی آرٹیں اُس نے پنجاب کی رائے عامہ کو جس طرح کچلا اُس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اُردو اخبارات کو غمانتِ طلبی اور ضمانتِ ضبطی کے بارگراں کے نیچے لاکر ختم کر دیا گیا۔ چھاپے خانے ضبط کر لئے گئے۔ ہر قسم کے سیاسی جلسوں کا انعقاد روک دیا گیا۔ دوسرے صوبوں سے جو آزاد خیال خبا پنجاب میں آتے تھے اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ باہر کے لیڈروں کو بھی پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے سے منع کر دیا گیا۔ سیاسی ملزموں کی پیردی کے لئے پنجاب کے جو دکلاء عدالتوں میں پیش ہونا چاہتے تھے اُنہیں

ڈراد ہٹا کر اس قدر خوف زدہ کیا گیا کہ انہوں نے تنگ آ کر مقدمات کی پیروی سے انکار کر دیا۔

منظالم پنجاب کی تحقیقات کے لئے کانگریس کی قائم کردہ کمیٹی نے اس بارے میں اپنی رپورٹ میں جو لکھا ہے۔ اُس کا ایک اقتباس یہاں درج کرنا ہے  
محل نہ ہوگا سہ

سالہ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا میں پنجاب پر جو خوفناک مظالم ہوئے تھے۔ اُن کی تحقیقات کے لئے دو مختلف کمیٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ ایک کمیٹی حکومت ہند نے قائم کی تھی جس کے صدر لارڈ ہنٹر تھے۔ جو انگلستان میں سائرس جرنل رہ چکے تھے۔ ممبروں میں جسٹس رینکنز جج ہائی کورٹ کلکتہ۔ مسٹر انس ایڈیشنل ہوم سیکریٹری حکومت ہند۔ میجر جنرل سر جانج برو۔ آفیسر کمانڈنگ پشاور۔ پنڈت جگت نارائن ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔ پی۔ مسٹر ٹامس ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔ پی۔ سر عین لال ستیلواڈ۔ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ بمبئی اور صاحبزادہ سلطان احمد خاں بیرسٹریٹ لا۔ جج عدالت عالیہ گوالیار شامل تھے دوسری کمیٹی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مقرر کی تھی جس کے ابتدا میں پانچ ممبر تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ ہاتھاکا ندھی۔ عباس طیب جی۔ سی آر داس۔ اور مولوی فضل حق۔ پنڈت کے ساتھ اس کمیٹی کے سیکریٹری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جب کانگریس کے اجلاس امرتسر کے صدر منتخب ہو گئے تو ان کی جگہ کسی نئے آدمی کا تقرر نہیں کیا گیا۔ مولوی فضل حق بعض ضروری مصروفیتوں کی وجہ سے تحقیقات کے کام میں شریک نہ ہو سکے تو انکی جگہ بمبئی کے مشہور بیرسٹریٹ ایم۔ آر۔ جیکار کو نامزد کیا گیا تھا۔

دو اوڈوائرنے قانونِ تحفظِ ہند سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تینک اور پال ایسے رہنماؤں کو بھی پنجاب میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس نے حد درجہ معمولی اور پیش پا اُفتادہ عذر تراش کر سیکرٹوں آدمیوں کو جیل میں بند کر دیا۔ اُس نے اُردو اخبارات کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی کمی باقی نہ رکھی۔ اور بیرونِ پنجاب چھپنے والے قوم پرست اخباروں کی پنجاب میں درآمد روک دی گئی۔ مثلاً نیو انڈیا، امرت بازار پتر کا اور انڈیا پنڈنٹ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ عدیہ ہے کہ اُردو کے وہ اخبار جو چھپنے سے پہلے حکومت کے ہاتھوں باقاعدہ سنسر کئے جاتے تھے۔ اُن کی اشاعت بھی بند کر دی گئی۔ اس قسم کے حالات پیدا کر کے اوڈوائر نے پنجاب کے باشندوں کو باہمی تباہی کا خیال دیا اور ایک دوسرے کا رنج و غم معلوم کرنے کے ذرائع سے عملاً محروم کر دیا۔ اب پنجاب میں نہ تقریر کی آزادی باقی تھی۔ اور نہ تحریر کی آزادی کا وجود تھا اس قسم کا سکوتِ مرگ طاری کر کے۔ اور اس طرح لوگوں کے قلم اور زبان پر پیرے بٹھا دینے کے بعد اوڈوائرنے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ پنجاب کے باشندے اُس کے زیرِ سایہ بالکل مطمئن و خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور یہی تاثرات وہ پنجاب سے باہر ہندوستان کے دوسرے لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

”تنہا یہی نہیں کہ اُس نے منگامی قوانین کا ناجائز فائدہ اٹھا کر

پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں اور آرزوؤں کو کچل دیا۔ بلکہ اس سے بھی  
 ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے یہ حرکت شروع کی کہ وقتاً فوقتاً صوبے  
 کے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو بلا کر بالمشافہ ڈانٹ ڈپٹ بھی  
 کی جاتی تھی۔ چنانچہ لالہ ڈنی چند جو پنجاب کے سرکردہ رہنماؤں میں  
 سے ہیں اس قسم کے ناروا سلوک کا شکار ہوئے۔ مناسب معلوم  
 ہوتا ہے کہ ہم یہاں خود انہی کی شہادت کا وہ مزید حقد درج  
 کر دیں۔ جو اسی صورت حال پر نہایت اچھی طرح روشنی ڈالتے۔  
 (لالہ ڈنی چند کی شہادت)

”انڈین ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے اکثر پبلک  
 جلسوں کا اہتمام اور انعقاد کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جلسے کا اعلان کرنے  
 کے بعد ہر بار اور الزاماً مجھے حکومت پنجاب کا چیف سکریٹری یا لائبر  
 کا کسٹراپنے دفتر میں طلب کرتا تھا۔ اور میرے راستے میں ایسی  
 مشکلات کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور مجھے خواہ مخواہ اس قدر پریشان  
 کیا جاتا تھا کہ میری جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا۔ تو مدت ہوئی اس  
 کام سے علیحدہ ہو گیا ہوتا۔ چیف سکریٹری اور کسٹراپوں کو  
 تنبیہ کیا کرتے تھے کہ میں بیرون پنجاب کے لیڈروں میں سے  
 فلاں فلاں شخص کو تقریر کے لئے بلاؤں۔ اور فلاں فلاں کو سرگرم  
 دعوت نامہ نہ بھیجوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ ہدایات سربراہی کی  
 اور دائرہ کے ایماء سے ہوتی تھیں۔ تنہا یہی نہیں۔ جب پنجاب

کی مجلس قانون ساز کے بعض معزز ممبروں نے گذشتہ پراونشل کانفرنس میں۔ جولاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ شرکت کی توجیف سکریٹری نے انہیں اپنے دفتر میں بلا کر اس بری طرح ڈانٹا کہ آئندہ ان کو بریڈ لاہال کے کسی پبلک جلسہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی!

سیر فضل حسین نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو نیشنل کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی تھی۔ اس کے ایک حصہ کا اقتباس بھی اگر یہاں درج کر دیا جائے تو اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

کمیٹی کے ایک رکن سر چمن لال ستیلواڈ میاں فضل حسین سے یوں سوال کرتے ہیں: ”آپ نے مقامی حکومت کے اس رویہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اس نے سیاسی تحریکوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق اختیار کر رکھا تھا۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ وہ کون سا رویہ تھا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟“

جواب :- ”مثال کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کی پیش کردہ اصلاحات کو لیجئے۔ جب ان مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں لاہور میں چند جلسے ہوئے۔ تو صوبائی حکومت نے طیش میں آ کر فوراً ایک اعلان جاری کیا کہ جن لوگوں نے ان اصلاحات کا خاکہ تیار کیا ہے وہ ان باغیوں سے کم نہیں جنہوں نے امریکہ سے واپس آ کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے۔“

سوال :- یعنی غند پارٹی؟

جواب :- جی ہاں !

سوال :- یہ واقعہ کب ہوا تھا ؟

جواب :- دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے بعد۔

سوال :- کیا یہ اُس وقت کی بات تو نہیں جب امپیریل لیجسلیٹو کونسل

کے اُنیس ممبروں کا مشہور میمورنڈم شائع ہو چکا تھا

جواب :- مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میمورنڈم کب شائع ہوا تھا۔

سوال :- ۱۹۱۶ء میں

جواب :- جی ہاں ! پنجاب کی صوبائی حکومت کا اعلان جس کا میں نے

ابھی ذکر کیا ہے ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا تھا۔ میمورنڈم پر دسمبر

۱۹۱۶ء میں غور و خوض اور بحث و مباحثہ ہوا تھا۔

۱۹۱۶ء میں اُس وقت ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں شائیں غیر سرکاری

ارکان تھے۔ ان غیر سرکاری ارکان میں دو اینگلو انڈین تھے اور باقی ہندوستان کی

دوسری قوموں کے نمائندے تھے۔ ان میں سے انیس ممبروں نے مشترکہ دستخطوں سے

۱۹۱۶ء میں وائسرائے کو ایک یادداشت بھیجی تھی۔ جس کے دو حصے تھے۔ پہلے

حصے میں یہ درج تھا کہ ہندوستان اس عالمگیر نوابہ عظیم میں اسی حسلہ عمل و

تندی سے حصہ لے رہا ہے جس سے برطانیہ کے لوگ اس جنگ میں شامل ہیں۔

ہندوستان نے جنگی امداد میں کروڑوں روپے دیئے۔ اور لاکھوں جوان فوج میں بھرتی

کرانے سے دریغ نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے اختتام پر اگر برطانیہ کو فتح ہو جی تو

رہائی دے گی۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

سوال :- جب یہ میمورنڈم شائع ہوا تو کیا اُس کی تائید میں لاہور میں کوئی جلسہ بھی ہوا تھا؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- کیا اس جلسے کے بعد حکومت نے اپنا اعلان جاری کیا تھا؟

جواب :- جی ہاں۔ اصلاحات کی سکیم اور اُس کی حمایت میں جو جلسے

ہیں ہوئے۔ اُن کے بارے میں صوبائی حکومت نے اپنے رپورٹ

کا اظہار نہایت تلخ اور تند لہجے میں کیا تھا۔ اسی سکیم کے سلسلے

میں یہاں ایک پراونشل کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔

سوال :- یہ پراونشل کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی؟

مہندستانی بجا طور پر اس بات کے متوقع ہیں گے کہ اُن کی سرفروشانہ خدمات کے

بدلے میں حکومت اُن کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں مزید اختیارات عطا کرے۔ تاکہ

وہ زیادہ خلوص اور عقیدت کے ساتھ برطانیہ سے وابستہ رہیں۔

مذکورہ بالا یادداشت کے دوسرے حصے میں اُن آئینی اور دستوری اصلاحات

کا ایک سرسری سا خاکہ درج کیا گیا تھا جو اُن انیس ممبروں کے خیال میں جنگ کے

بعد ہندوستان کو عطا ہونی چاہئیں تھیں۔ یہی یادداشت آئندہ چل کر

*THE MEMORANDUM OF THE NINETEEN* کے نام سے مشہور ہوئی۔

جن اصلاحات کی اس یادداشت میں درخواست کی گئی تھی۔ کم و بیش اُنہی

خطوط پر دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگریس در مسلم لیگ نے اپنی مشترکہ سکیم تیار کی۔

(باقی صفحہ پر)

جواب :- جی ہاں !

سوال :- انیس ممبروں کے میوزنڈم کے بعد؟

جواب :- جی ہاں !

اور کسی قدر ڈوبیل کے ساتھ یہی سکیم آگے چل کر مانڈیگو چیسفورڈ اصلاحات کی بنیاد قرار پائی۔ میوزنڈم پر دستخط کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں۔

(۱) مندرچند مندی راجہ قاسم آباد۔ (۲) ڈنشاواچہ (۳) بھوپندر ناتھ باسور۔ (۴)

رائے لیشن دت شکلا (۵) پنڈت مدن موہن مالویہ (۶) کے۔ وی۔ ریگھا سوامی اٹلیگر

(۷) مسٹر منظر الحق (۸) وی۔ ایس۔ سری نواس شاستری (۹) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

(۱۰) سر ایماہیم رحمت اللہ (۱۱) مسٹر بی۔ این۔ بسرا (۱۲) خان بہادر میر اسد علی (۱۳) راجہ

کامنی کمار چند (۱۴) رائے کرشنا سہائے (۱۵) آر۔ این۔ بھنج دیو (۱۶) ایم۔ بی۔ دادا بھائی

(۱۷) رائے ستیا ناتھ رائے (۱۸) محمد علی محمد خاں (راجہ محمود آباد)۔ (۱۹) مسٹر محمد علی جناح۔

تعجب ہے کہ سرانیکل اوڈو اثران لوگوں کو باعینوں میں شمار کرتا تھا

اور میوزنڈم کو بغاوت اور بد امنی پھیلانے کا پروانہ قرار دیتا تھا۔ جن

لوگوں کے نام اوپر درج ہیں ان سے زیادہ امن پسند اور عافیت کیش لیڈر

ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ لوگ قانون کی حدود سے ہر موٹا وڑ کرنا

پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اوڈو اثران کو پنجاب میں داخل ہونے کی اجازت

دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور نہ میوزنڈم ایسی بے فکر تحریک کی حمایت میں

کسی پبلک مجلس کا انعقاد کو ارا کرتا تھا :



سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- ظاہر ہے کہ کانفرنس کے منتظین.....

سوال :- کیا آپ منتظین میں شامل تھے؟

جواب :- میں کانفرنس کا صدر تھا۔

سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- ہندوستان کے متعدد لیڈروں کو دعوت نامے ارسال کئے گئے۔

لیکن حکومت کا اصرار تھا کہ یہ لیڈر ہرگز لاہور نہ آئیں۔

اِس اِسی سے سمجھ لیجئے کہ ہماری حکومت کا رویہ کیا تھا۔

سوال :- جب آپ حکومت کے اِس رویے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا آپ کا مطلب

یہ ہے کہ اِس سلسلہ میں حکومت کے کسی رکن سے آپ کی خط و

کتابت ہوئی تھی؟

جواب :- جی ہاں۔ میری خط و کتابت ہوئی تھی۔

سوال :- کس سے؟

جواب :- چیف سیکرٹری سے

سوال :- مسٹر ٹامسن سے؟

جواب :- جی ہاں۔

سوال :- کیا آپ اِس کام کے لئے خود اُن کے پاس گئے تھے یا انہوں نے

آپ کو طلب کیا تھا؟

جواب :- انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ اِس بات کو سرگزر

گوارا نہیں کرتے کہ باہر کے این لیڈروں کو لاہور آنے کی دعوت دی جائے۔

سوال :- اُن کا اشارہ کن لیڈروں کی طرف تھا؟

جواب :- راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر جناح، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر شاستری وغیرہ۔ بعد میں مسٹر شاستری کے متعلق انہوں نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور انہیں یہاں آنے کی اجازت دے دی تھی۔

سوال :- گویا مسٹر شاستری کے علاوہ باقی تمام لیڈروں کے یہاں آنے پر انہیں اعتراض تھا؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- وہ لگ یہاں نہیں آسکے۔

سوال :- جب آپ نے ہندوستان کے لیڈروں کے بارے میں صوبائی حکومت کے رویے کا ذکر کیا تھا تو کیا یہی واقعہ اس وقت آپ کے ذہن میں تھا؟

جواب :- یہ صورت ایک مثال میں نے پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے متعدد ایسے احکام ہیں جن کی رُو سے لوگوں کو صوبے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ بہت سے اور واقعات بھی ہیں۔

سرٹائیکل اوڈوائس نے پنجاب میں جو صدر درجہ قابل اعتراض رویہ اختیار

کر رکھا تھا۔ اُس کے جوازیں اُس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ آئینی اصلاحات کا مطالبہ یا چرچا اس لئے بے محل اور غیر ضروری ہے کہ اس سے جنگی کوششوں میں خلل پڑتا ہے۔ اور شہروں کے شور و شہ پند دیہات کے لوگوں کو بہکا کر فوج میں بھرتی ہونے سے روکتے ہیں۔ یہ اعتراض سراسر لغو اور بے بنیاد تھا۔ بات اصل میں وہی تھی کہ وہ دیہات کی آبادی کو چھوٹی موٹی کے پودے کی طرح شہر والوں کی ہوا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے فوجی بھرتی میں دیہاتیوں پر جس طرح جبر و تشدد کیا۔ اور گاؤں کے غریب و بے زبان باشندوں کو جس ظالمانہ طریق سے کھینچ کھینچ کر فوج میں بھرتی کیا۔ اُس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کے سامنے اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ تھا۔ کہ ہندوستان کی دولت اور سندوستان کے خون سے برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اُستوار کی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی پُرانا مقصد تھا جو کلائو۔ دارن ایمپائرنگز اور ولزلی لے کے ہندوستان آئے تھے۔

مارشل لا کے مظالم کے بعد جب اوڈواٹر نے اپنے آپکو جملہ الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کے لئے لمبے چوڑے بیان جاری کرنا شروع کئے تھے۔ تو وہ بار بار کہتا تھا کہ اُس نے فوجی بھرتی میں کوئی تشدد نہیں کیا۔ لوگ اپنی خوشی سے بھرتی ہوتے تھے۔ اس ضمن میں کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

”جو شہادت ہم لوگوں نے جمع کی ہے۔ اور جو عدالتی دستاویزیں ہم نے ملاحظہ کی ہیں۔ اُن سے یہ بات غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو جاتی

ہے کہ رنگروٹ بھرتی کرنے اور منگی فنڈ کے لئے روپیہ جمع کرنے میں حکومت نے جو ذرائع اختیار کئے تھے۔ وہ اخلاقی یا معاشرتی دباؤ سے کہیں تجاوز کر گئے تھے۔ سرٹیکل اڈوڈائر کوہران تمام حالات کا علم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بار بار جبری بھرتی شروع کرنے کی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ اس نام نہاد رضا کارانہ بھرتی سے تو یقیناً جبری بھرتی بہتر تھی کیونکہ اس نام نہاد رضا کارانہ بھرتی کی آڑ میں لوگوں پر زیادہ تشدد ہوا ہے۔ اس طرح دیہات کے ذی ثروت اندھی اثر لوگ توجیح کئے اور سارا اعتبار بے والی ہوارث غریبوں پر پڑ گیا۔“

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ شروع ہونے سے لے کر اس کے اختتام تک ہندوستان میں جس قدر فوجی بھرتی ہوئی ہم اس کا ایک نہایت سیرسری جائزہ لے لیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ یورپ کے اس بین الاقوامی معرکے میں پنجاب کے کتنے نوجوانوں کو آگ میں جھونکا گیا۔ ۱۹۱۴ء کے آخری چار مہینوں میں ہندوستان بھر میں اٹھائیس ہزار جوان بھرتی کئے گئے جن میں سے چودہ ہزار پنجابی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں تیرانوے ہزار رنگروٹ بھرتی ہوئے جن میں سے پھیالیس ہزار پنجابی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں ایک لاکھ چار ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں سے پچاس ہزار پنجابی تھے۔ گویا ۱۹۱۶ء کے آخر تک ہندوستان میں جتنی بھرتی ہوئی اس کی کل تعداد دو لاکھ پچیس ہزار تھی اور اس میں ایک لاکھ دس ہزار درندہان پنجاب تھے۔

مئی ۱۹۱۶ء میں جب بنگ بہت نازک صورت اختیار کر گئی تھی حکومت نے

نے فوجی بھرتی کا ایک مرکزی بود ڈبنا کر فیصلہ کیا تھا کہ چار لاکھ اسی ہزار جوان اور بھرتی کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد ۱۹۱۷ء کے سات مہینوں میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار رنکروٹ بھرتی ہوئے۔ جن میں پچانوے ہزار پنجابی تھے۔ اور ۱۹۱۸ء میں تین لاکھ سترہ ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں ایک لاکھ چونتیس ہزار پنجابی تھے۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار دیکھ کر سر پنجابی کا دل فخر و مباہات کے جذبات سے لرزے ہو جاتا ہو گا کہ اُس کے صوبے کے مَن چلوں اور بہادروں نے معرکہ کانڈارا اور عرصہ پیکار میں پورے ہندوستان سے ہانسی جیت لی۔ لیکن اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کیا یہ لاکھوں یوجوان بخوشی بھرتی ہوئے تھے یا بہ جبر و اکراہ۔ کیا مادروطن کے ان سپوتوں نے بہ طیب خاطر آگ اور خون کے سمندر میں کودنا گوارا کیا تھا۔ یا زبردستی ان کو اس مذاب میں جھونک دیا گیا تھا۔ تو بہت سے امور صاف ہو جاتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مائیکل اوڈوائٹر جو آئے دن پنجاب کے مظلوم اور بے کس دیہاتیوں کی خیر خواہی میں خون کے آنسو روتا تھا۔ اپنے اس ہمدردی اور خیر خواہی کے دعوے میں کہاں تک سچا تھا۔

اس ضمن میں بے شمار شہادتیں جمع کی جاسکتی ہیں۔ اوڈوائٹر کی تقریریں اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے۔ صوبے کے مختلف علاقوں کے معززین کے بیان مجموعی

سے یہ اعداد و سابق حکومت ہند کی سرکاری رپورٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

طو پر یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ فوجی بھرتی میں ہر ممکن تشدد اور ہر نوع کا جبر و آزار لہا گیا تھا۔ اوڈو وائر اپنی اُفتادِ طبع سے مجبور ہو کر یکا یک ایک نادشاہی حکم جاری کر دیتا تھا کہ فلاں فلاں ضلع یا فلاں فلاں گاؤں سے اتنے جوان فوراً ہٹائے جائیں۔ یہ حکم صادر ہوتے ہی صوبے کی پوری حکومت کے پڑے حرکت میں آجاتے تھے۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر انسر مال کے سر پر۔ انسر مال تحصیلدار کے سر پر اور تحصیلدار بھردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد ان جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہوا ہٹیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نزع میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا جس جوان کی طرف سرکاری انگلی اٹھ جاتی تھی اُسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہ رضا کارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگرڈٹ تصور ہوتا تھا۔

حکومت کے اس جاہلانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے۔ دیہات کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے انسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا بڑے بڑے بلوے ہونا شروع ہو گئے۔ اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں جب بھرتی کے افسروں نے لوگوں پر بہت زیادہ تشدد کیا۔ تو مشتعل ہجوم نے نائب تحصیلدار ایلڈ اُس کے عملہ پر حملہ کر دیا بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جن میں سے باؤن ملزموں پر ذمہ دہ ۱۲۷۷ء التخریب سہ مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالت نے اُن کو سزا دے دی۔ لیکن سیشن جج

مسٹر کولڈسٹریم نے (جو چند سال بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بن گئے تھے) سب کو بڑی کر دیا۔ مسٹر کولڈسٹریم نے جو فیصلہ لکھا اُس کے چند فقرے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

” لوگوں کو سرکار کے خلاف سچی اور حقیقی شکایتیں ہیں۔ اور وہ اپنی تکلیفوں کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ضلع مظفر گڑھ کے ماتحت انسروں نے رینگڑ و لوٹوں کی بھرتی۔ اور جنی نڈ کے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں کمبرداروں اور ذیلداروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ چنانچہ ان کمبرداروں اور ذیلداروں کو مجبوراً ایسے قابل اعتراض طریقے اختیار کرنا پڑے۔ جن سے ضلع کے اکثر مقامات پر فسادات رونما ہوئے۔ یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قابل اعتراض طریقے جو حدودہ شدہ آئین بھی تھے حکومت کے ایما اور منشا کے خلاف تھے۔ تاہم ضلع کے دور دراز مقامات پر یہ تشدد ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔“

ضلع شاہ پور میں جب فساد برپا ہوا۔ اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے انسروں پر قاتلانہ حملے شروع کئے۔ تو بے شمار لوگوں پر منقذات چلانے گئے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کر دیتے تھے تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں کے سامنے برسنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے میں تین یا چار سبھانی تھے۔ اُن میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا

جاتا تھا۔ عورتوں کو خاندانوں سے جدا کر کے دُور کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اور جب تک اُن کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر ضامن نہیں ہوتے تھے۔ عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

کرناٹک کے ایک گاؤں میں جب زبردستی بھرتی شروع ہوئی۔ تو ایک شخص نے مجسٹریٹ کی منتیں کیں کہ اُس کا اکلوتا بچہ ہے اُس پر رحم کیجئے۔ اور بھرتی نہ کیجئے۔ لیکن مجسٹریٹ نہ مانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں میں سخت فساد ہوا۔ اور بے شمار آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ جن میں سے پانچ کو عدالت نے سزا دی۔ اپیل میں وہ بری ہو گئے۔ عدالت اپیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:-  
 "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کئے۔ اُن سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اپیل کنندگان اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوج میں بھرتی کر دیتے۔ یا خود بھرتی ہو جاتے تو اُن سے باسانی درگزر کی جاتی!"

اسی طرح پنجاب کے مختلف اضلاع میں دیہاتیوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اور جبر و تشدد سے تنگ آنے والے لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے۔ جونہی خبر اُڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے۔ گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لوٹ لیتے اور نسلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔

اسی سلسلے میں سرمانیکل اوڈوائزر کی ایک تقریر کا حوالہ دینے پر مجبور ہوں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھرتی کے بارے میں اُس کا اپنا رویہ کیا تھا۔



۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اُس نے تقریر کرتے ہوئے کہا :-  
 ”پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ درکار ہیں۔ اگر لوگ خوشی سے بھرتی  
 نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔ بعض علاقوں میں لوگ  
 بھرتی ہونے سے جی چراتے ہیں۔ ہم اس صورت حال کا اچھی  
 طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہم پنجاب سے رنگروٹوں کی ایک  
 مقررہ تعداد ہٹا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہذا اس وعدے کا ایفاد  
 ضروری ہے۔ . . . . . میں سمجھتا ہوں کہ اب کم از کم پنجاب میں اکثر  
 لوگ جبری بھرتی کے حامی بنتے جا رہے ہیں مثلاً اگر سر دس اپندرہ یا  
 بیس جوان آدمیوں میں سے ایک آدمی بھرتی کر لیا جائے۔ تو یہ شرح  
 بڑی نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت نے ہندوستان کے ہر صوبے کے  
 ذمے رنگروٹوں کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی ہے۔ میری رائے  
 ہے کہ اگر یہ تعداد رخصا کارانہ بھرتی سے ہٹا نہ ہوئی۔ تو پھر اور قسم کے  
 ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے۔“

یہ اور قسم کے ذرائع کیا تھے؟۔ ان میں سے کچھ تو سطور بالا میں بیان  
 کئے جا چکے ہیں۔ دو، ایک مزید واقعات بیان کر دینے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ  
 یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اُس شخص کے اعمال کا تجزیہ بے حد  
 ضروری ہے۔ جو اپنے آپ کو دیہاتیوں کا سہرو اور خیر خواہ کہتے ہوئے سمجھتا نہیں  
 تھا۔ اور جس نے اپنی مذموم کوششوں سے پنجاب کی مسلمان آبادی کو اس طرح  
 دو مخالفت جھٹوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ اُس کے اثرات نے ربیع صدی تک یہیں

مبتلائے رنج و محن گئے رکھا۔

گو جہانوالہ کے ایک معزز مسلمان زمیندار نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ :-

”بسیا کھی کے ہینے میں تحصیلدار ہمارے گاؤں میں آیا۔ اور رات ہی رات میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ صبح تمام لوگ ڈیرے پر حاضر ہوں ایک تو فصلوں کی کٹائی کے دن تھے۔ دوسرے یوں بھی لوگ ڈرتے تھے۔ کہ انہیں زبردستی بھرتی کر لیا جائے گا۔ صبح سوئی تو بہت کم آدمی ڈیرے پر حاضر ہوئے۔ چنانچہ تحصیلدار سخت ناراض ہوا۔ اور اُس نے ساٹھ ستر آدمیوں کو جہانوالہ کمر دیا۔ جس کی مجموعی رقم سولہ سو روپیہ تھی۔ پھر تحصیلدار نے حکم دیا کہ گاؤں کے لوگ ضلع کے صدر مقام گو جہانوالہ میں حاضر ہوں جو ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل دور ہے جب مقررہ تاریخ کو لوگ وہاں گئے۔ تو سب کو قطار میں کھڑا کر کے سات جوانوں کو فوجی بھرتی کے لئے چُن لیا۔ اور باقی آدمیوں کو مارا اور گالیاں دیں۔ اور کہا کہ بھرتی کے لئے اور جوان لے کر آؤ۔“

اگر ہم پنجاب کے مختلف اضلاع میں فوجی بھرتی کے دردِ جزر کے نقشے کا بغور مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں آٹ بھرتی معمول کے مطابق ہے تو چند مہینوں کے اندر وہاں بھرتی ایک دم اس قدر تیز ہو جاتی ، کہ معایر ہوتا ہے کہ لوگ دیوانہ وار فوج کی طرف بہک بہک کر جا رہے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر ضلع کا حاکم ناجائز ذرائع استعمال

کرنے۔ اور جبروت شدہ کو نوار کہنے کا حامی نہ ہوتا تھا تو اوڈوائس اس کو فوراً تبدیل کر کے وہاں کسی ایسے آدمی کو متعین کر دیتا تھا جو اس کے ایسے کے مطابق بھرتی میں بڑے سچے طریقوں میں امتیاز کرنے کا قابل نہ تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۶ء کے آخر میں ضلع ملتان کے رنگروٹوں کی تعداد ۷۵۹ تھی گویا ضلع کی آبادی کے ہر ۵۸۶ مردوں میں سے ایک رنگروٹ بھرتی ہوا۔ لیکن سال بھر کے اندر یعنی نومبر ۱۹۱۸ء میں رنگروٹوں کی کل تعداد ۶۳۶۳ ہو گئی گویا ہر ۹۳ مردوں میں سے ایک رنگروٹ لیا گیا۔ اسی طرح اوڈوائس نے دیکھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ رضا کارانہ طور پر بھرتی ہونے میں تامل کرتے ہیں۔ تو اس نے اپنے خاص آدمی کرنل اوبراٹن کو وہاں ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۶ء تک تو گوجرانوالہ کے رنگروٹوں کی تعداد ۳۳۸۸ تھی لیکن اگست ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد یکایک ۱۱۷۶۵ تک پہنچ گئی۔ گویا ایک ہی سال میں ساڑھے آٹھ ہزار رنگروٹ بھرتی ہو گئے۔

دیہات کے معززین کی جان غلاب میں آئی ہوئی تھی۔ نمبرداروں اور ذلیلداروں پر آئے دن سرکار کا نازیبا نہ پرستما تھا کہ اور رنگروٹ لائے۔ جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا۔ ان کی نمبرداریاں ضبط کر لی گئیں پولیس حفظ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی۔ اور جیسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انہیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے۔ اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ نہ کرتے۔ انہیں رہا نہیں کیا جاتا تھا۔ اوڈوائس نے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک آہنی پردہ ڈال

دینے کی کوشش کی تھی۔ تاکہ دیہات میں جو کچھ سو رہا تھا اُس کی سوا شہروں میں نہ پہنچنے پائے۔ لیکن جب دیہاتیوں پر پیہم تختیاں سونا شروع ہوئیں اور جگہ جگہ فساد بھوٹ پڑے۔ تو صوبے میں ایلچل سی پٹ گئی۔ بلوے کے ایک ایک مقدمے میں پولیس نے بیک وقت سو سو، دو سو سو آدمیوں کا چالان کر دیا تھا۔ جب یہ مقدمات ابتدائی عدالتوں میں سے ہوتے ہوئے صوبے کی عدالت عالیہ تک پہنچے۔ اور صفائی کی طرف سے قابل وکلار پیش ہوئے تو راز ہائے درون پر وہ کھانا شروع ہوئے۔

سرفضل حسین نے، جو خود دو مقدموں میں ملزموں کی طرف سے پیش ہوئے تھے، سنٹر کیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا :-

سوال :- "جن مقدمات میں آپ پیش ہوئے تھے، اُن کی ابتداء کیونکر ہوئی تھی؟"

جواب :- "یہ دونوں مقدمات ضلع شاہ پور سے آئے تھے۔ ایک مقدمے

میں ملزموں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ جن کے خلاف دنیا

الزام تھا کہ انہوں نے جبری بھرتی کی مخالفت کی ہے؟"

سوال :- "کیا بلوے کے ایک مقدمے میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا

چالان کر دیا گیا تھا؟"

جواب :- "جی ہاں!"

سوال :- "نافعات کیا تھے؟"

جواب :- "مجھے اس وقت گاؤں کا نام یاد نہیں۔ یہ گاؤں ضلع

شاہ پور میں ہے اور نابھہ سرگودھا سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔  
ان ڈیڑھ سو ملزموں میں سے ایک کبھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا  
اور جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے اس گاؤں  
کا صرف ایک آدمی سرکاری ملازمت میں گیا ہے۔ ملزموں پر ہر  
قسم کا دباؤ ڈالا گیا تھا۔ لیکن وہ بھرتی پر آمادہ نہ ہوئے۔

سوال :- "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود ان ڈیڑھ سو ملزموں کو بھرتی  
ہونے کے لئے کہا گیا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں، گاؤں کے تمام باشندوں پر جن کی تعداد ایک ہزار  
کے قریب ہے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔"

سوال :- "کیا ریکروٹوں کی کوئی خاص تعداد طلب کی جا رہی تھی؟"

جواب :- "جی نہیں، کوئی خاص تعداد مقرر نہیں تھی۔ چونکہ اس گاؤں  
سے کوئی آدمی بھرتی نہیں ہوا تھا۔ اور حکومت نے بددستی بھرتی  
کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور لوگ بھرتی سے بار بار انکار کرتے تھے  
اس لئے حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاؤں کے لوگوں نے سازش  
کر لی ہے۔ چنانچہ حکومت نے قانون تحفظ سند کے تحت یہ قدم  
اٹھایا۔"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ قدم گاؤں کی پوری آبادی کے خلاف اٹھایا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں، گاؤں کے چند آدمیوں کے خلاف۔"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ اقدام اس بنا پر کیا تھا کہ یہ چند آدمی

بھرتی کی مخالفت کر رہے ہیں؟

جواب :- جی ہاں! ان چند آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے

گئے۔ لیکن گھاؤں والوں نے انہیں پولیس کے حوالے کرنے سے

انکار کر دیا۔ پھر فوج بھی گئی۔ اور جب فوج نے گھاؤں میں

جا کر ادھم مچایا تو بلبوہ ہو گیا!

سوال :- "تو کیا اس بلبوے میں ان ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان ہوا تھا؟"

جواب :- "جی ہاں"

سوال :- "پھر کیا ہوا؟"

جواب :- "اپیل میں اکثر بڑی ہو گئے اور چند ایک کو سزا مل گئی۔"

انہی دنوں لاہور۔ امرتسر اور جالندھر میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہو رہے تھے

جہاں مسلم لیگ اور کانگرس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں قراردادیں منظور کی

جاتی تھیں۔ ان جلسوں میں بعض مقررین نے بھرتی کے تشدد و آمیزشوں پر

بھی اظہار خیال کیا۔ اور وہاں آبادی کے تہ ورتہ مظالم پر تہ پر تہ اُٹھائے۔

ادڈواتر کے لئے یہ صورت حال قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ یہ کیونکر گوارا کر

سکتا تھا کہ شہر کے چند تعلیم یافتہ شہر نش پسند وہاں کے معاملات میں دس

دس کر اُس دسار خود فریبی میں رشتہ وال دیں جو اُس نے حد درجہ موثر شہر نش

تیار کیا تھا۔ چنانچہ عالم سراسیمگی میں اُس سے بعض عجیب و غریب حرکات

سرزد ہونا شروع ہوئیں۔

مثلاً دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں ڈاکٹر نقاری

مرحوم نے مجلس استقبالیہ کے صدر کے حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اس کا داخلہ بغیر کسی معقول وجہ کے، پنجاب میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پنجاب کے بعض معزز اہل ذہنی اثر زمینداروں کو بلا کر تہنید کی گئی کہ کوئی شخص لیگ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے دہلی نہ جائے۔ وہاں سے مسلم لیگ کی تحریک کو دبا دینے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ اگر کوئی شخص گاؤں میں مسلم لیگ کا چرچا کرتا ہوا نظر آئے۔ تو فوراً اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن اوڈوآئر کی ان تمام کوششوں کے باوجود ظلمت اور تشدد کے بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ رائے عامہ بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں کو سو دوزیاں میں اتنی یاد کرنے کی صلاحیت عطا ہو چکی تھی۔ اور شہروں کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ بے قرار عنصر جس کو وہ شکستے ہیں وہاں باکر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ہی جہت میں زنجیروں کو توڑ کر رہا ہو گیا تھا۔ اوڈوآئر کی آنکھوں کے سامنے امرتسر کے ایک بہادر فرزند نے جس کا نام ڈاکٹر سیلف الدین کچلو تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کو سالانہ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد کرنے کی دعوت دے دی۔ اور دونوں قومی انجمنوں نے اس دعوت کو خوشی منظر کر لیا۔

اب اوڈوآئر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جس مسلم لیگ اور کانگریس کی مجوزہ اصلاحات کو وہ بغاوت سے تعبیر کرتا تھا۔ اب ان کے سالانہ اجلاس اس کی آنکھوں کے سامنے پنجاب میں منعقد ہوں۔ ہندوستان کے جن چوٹی کے لیڈروں کو وہ پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے کا روادار نہ تھا۔ اب وہی لیڈر اس کے سامنے اپنی آتش بیانیوں کے جوہر دکھائیں

سیاسی بیداری کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بچنے کے لئے اُس نے پنجاب کے چاروں طرف جو بند باندھ رکھا تھا۔ اب اُس بند میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اور کوئی دن کی بات تھی کہ عوام کی بیداری کے ایک زبردست ریلے کے سامنے وہ بند اپنی جگہ سے ہل جائے گا۔ ان یاس انگیز حالات میں اور ڈو اور کے دل و دماغ کی کیفیت کا اندازہ کمزور نا کچھ مشکل بات نہیں۔ وہ ایک طرف غصے اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اور ان لوگوں کو جی کھول کر سزا دینا چاہتا تھا جنہوں نے اُس کی تمام مخالفانہ کوششوں کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری طرف اُس پر ایک حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔ جو شکست خوردگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اس عالمِ افسوس میں اُس نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔ اور ۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو مارشل لا کا اعلان کر کے اُس نے پنجاب کو آگ اور خون کے ایک ایسے سیلاب میں غوطہ دیا۔ جس کے سحرِ آخر میں اور انقلابی نگز اثر سے ایک نیا ملک اور نئی قوم پیدا ہوئی۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



Marfat.com  
Marfat.com  
Marfat.com

### میشاق لکھنؤ کے بعد

میسٹر جناب کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی ربط و ضبط تو سال ۱۹۱۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی اتحاد پر ور کوششوں کا حقیقی اثر دسمبر ۱۹۱۶ء میں حاصل ہوا۔ جب کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی میں ملتے ہوئے۔ اور ہندوستان کی ان دو نمائندہ ایجنوں نے مل کر اصلاحات کی ایک سکیم تیار کر کے حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ اس سکیم کی تفصیلات بیان کرنے یا اس کے معائب و محاسن پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم اجمالی طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے تمذبات کو جائز تصور کرتے ہوئے کہ مخلوط انتخاب میں ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ان کے لئے مجالس قانون ساز میں جداگانہ نیابت منظور کرنی اور مسلمانوں نے اپنے حق نمائندگی سے مطمئن ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا وعدہ کر لیا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء کا یہ معاہدہ جسے عرف عام میں لکھنؤ پیکٹ یا میساق لکھنؤ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں

اور مسلمانوں کی باہمی مصالحت کا ایک یادگار واقعہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کی آئینی اور دستوری تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر جناح اس تمام کارروائی میں بطل جلیل یعنی ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اسی موقع پر سر ججنی ٹائیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے نوازا کیا تھا۔

میشاق لکھنؤ کی دیگر تفصیلات سے قطع نظر اس میں ایک مشق یہ بھی تھی کہ پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی ملے گی اور اس طرح ان دو صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت کو جو نقصان پہنچے گا۔ اُس کے معاوضے میں اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی سے زیادہ نمائندگی عطا ہوگی۔ یوپی۔ بہار۔ مدراس وغیرہ کے مسلمانوں کو اس طریقے سے جو مراعات حاصل ہوئیں۔ ان کے لئے ایک انگریزی اصطلاح "میٹیج" استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ جداگانہ انتخاب کی رو سے ہندوستان کی صوبائی کونسلوں کے نمائندوں کی جو تعداد مقرر ہوئی اُس کی شرح حسب ذیل ہے :-

پنجاب	منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کا	نصف
بنگال	" "	چالیس فیصد
یوپی	" "	تیس فیصد
بہار	" "	پچیس فیصد
صوبہ متوسط	" "	پندرہ فیصد

مدد اسس منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کا پندرہ فیصد

بیمنی

۱۲

اس فیصلے کے ساتھ یہ شرط لکھی گئی کہ عام حلقہ ہائے انتخاب میں کوئی مسلمان امیدوار کھڑا نہیں ہو سکے گا اور کوئی مسودہ قانون یا اس کا کوئی جزو یا کوئی تجویز کسی غیر ممبر کی ممبر کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ اگر اس مسودہ قانون یا اس کے کسی جزو یا کسی تجویز کی متعلقہ جماعت کے ممبر مخالفت کریں گے۔ تو وہ مسودہ یا اس کا کوئی جزو یا تجویز کونسل میں پیش نہیں ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ جس طرح صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کا انتخاب جداگانہ ہو گا۔ اسی طرح طریقے سے مرکزی قانون ساز مجلس میں بھی ہونا چاہیے۔ اور وہاں منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی مسلمان ہوں گے۔

میتھاق بکھنؤ کے بعد پورے ہندوستان میں ایک طرف تو صلح و آشتی کی خوشگوار مہم اپنی چلنا شروع ہوئی۔ اور دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے باہم مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب کانگریس اور لیگ کے جھنڈے کے نیچے جگہ جگہ جلسے منعقد ہونے چاہئیں۔ تاکہ مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ چنانچہ ہر صوبے میں نہایت پُر امن طریقے سے جلسوں کا انعقاد ہونے لگا۔ اور عوام نے بڑی گرم جوشی سے میتھاق بکھنؤ کی حمایت کی۔ جیسا کہ اس سے قبل مرض کیا جا چکا ہے۔ سر ٹیپل اودھو اور اس تحریک کا بڑے مخالف تھما۔ اُس نے میتھاق بکھنؤ کو بغاوت کا اعلان اور اصلاحات کی تنظیم کو بغاوت کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

لیکن اوڈوانز کی بد قسمتی سے اب مسٹر مائیکو وزیر ہند تھے۔ جن کی بلند خیالی اور وسیع المشرنی کا اُن کے دشمنوں تک کو بھی اعتراف ہے۔ مائیکو کا رویہ ابتداء سے ہمدردانہ تھا۔ اور انہوں نے اپنی ڈوراندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک اہل ہند کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اختتام جنگ کے بعد انہیں اپنے ملک کے نظم و نسق میں برابر کا حصہ ملے گا، موجودہ بے چینی رفع نہیں ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس بے چینی کا اثر حکومت ہند کی اُن تمام کوششوں پر بری طرح پڑے گا۔ جو نگر وٹوں کی بھرتی اور سامان جنگ کی فراہمی کے سلسلے میں سو رہی تھیں۔ چنانچہ ۲۲ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مائیکو نے اپنا وہ مشہور اعلان جاری کیا۔ جس کے متعلق بعض سیاسی نقادوں کی رائے ہے کہ جب سے برعظیم ہند میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی ایسا اہم اور نتیجہ خیز منشور اب تک جاری نہیں ہوا تھا۔

مسٹر مائیکو نے صاف الفاظ میں کہا کہ ”ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہل ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت خود اختیاری کے اداروں کو تدریجاً ترقی دی جائے تاکہ ان کا ہندوستان کا اصل ذمہ دارانہ حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن سکے۔“ آخر میں مسٹر مائیکو نے کہا ”ملکِ معظم کی رضا مندی سے اُن کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو والسرائے کی یہ دعوت قبول کر لینا چاہیے کہ میں ہندوستان جا کر ان معاملات کے متعلق والسرائے اور حکومت ہند سے پامشافہ گفتگو کروں۔ تاکہ ایک

طرف اس ملک کے وائسرائے اور وہاں کی مقامی حکومتوں کے خیالات معلوم کئے  
جاسکیں۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی نمائندہ جماعتوں کے مشوروں  
سے بھی ہیں مستفید ہو سکیں۔

اس اعلان کے ساتھ ہندوستان میں امیدوں کے چراغ روشن ہونا  
شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ حالات نامساعد کی پروا نہ کرتے ہوئے  
وزیر ہند خود ہندوستان آ رہے تھے۔ تاکہ اس ملک کے اہل الرائے لیڈروں  
سے مل کر ذمہ دارانہ حکومت کی بنیاد رکھی جاسکے۔ اوڈواٹر نے جیران تھا کہ  
یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ کیا وائسرائے (لارڈ چیچسٹر فیلڈ) اور  
اور وزیر ہند مائیکل ڈیوائس ہو گئے ہیں کہ عین اُس وقت جب یورپ کے  
مخار بہ عظیم میں برطانیہ کی تقدیر ڈالواں ڈول سو رہی ہے۔ یہ لوگ ہندوستانی  
اصلاحات ایسے بے کار اور بے مصرف کام میں وقت ضائع کرنا پسند کرتے  
ہیں۔ یہ بات بھی اُس کے فہم سے بالاتر تھی کہ جن لوگوں کو اُس نے باغی  
اور مفسد قرار دے کر پنجاب کے حدود میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔  
اب انہی فتنہ پرنازوں کے مشورے سے مستفید ہونے کے لئے وزیر ہند  
یہاں تشریف لارہے تھے۔

اوڈواٹر نے اس صورت حال پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب میں جگہ  
جگہ ایسے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جن میں ایک طرف بغض و عناد اور دوسری

INDIA AS I KNEW IT" BY SIR MICHAEL O'DWYER  
(1935)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

طرف رنج و غم کے علاوہ بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

”ستمبر ۱۹۱۶ء میں مسز بسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کی۔ اس کے چند ہفتے بعد مرکزی مجلس قانون ساز کے انیس اُمیروں نے اپنا اعلان شائع کیا۔ جس میں ایسی انقلابی انگریزی سیاسی اصلاحات کے مطالبہ کیا گیا تھا۔ جن سے پوری صورت حال کے بدل جانے کا اندیشہ تھا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے ایک متحدہ سکیم منظور کی جس میں ہوم رول تحریک کی حمایت کی گئی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مطالبات کے پیچھے جو محرکات کام آ رہے تھے۔ اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت چونکہ اس وقت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اس لئے اس سے جو کچھ منوایا جاسکتا ہے اسی منوایا جائے۔ دوسرا محرک یہ تھا کہ برطانوی حکومت نے امریکی صدر ولسن کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ محکوم اور غلام قوموں کو اُن کے حق خود ارادیت سے محروم نہیں کیا جائے گا تیسرا محرک یہ تھا کہ خود برطانیہ میں ایسے سیاست دانوں کی ایک کافی بڑی تعداد موجود ہے جنہیں حکومت کے تنظیم و نسق کا نہ علم ہے اور نہ تجربہ۔ لیکن جو محض کتابی مطالعہ کی بنا پر سیاست کے سوانحی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوستانی لیڈروں کو ان تخیلی پسند لوگوں کی مدد پر پورا بھروسہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں رباب حکومت

شملہ کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اس فکر میں نلطان و پچاپ تھے کہ  
 ہندوستان کے ترقی پسند سیاسی رہنماؤں کے مطالبات کو تسلیم  
 کرنے کی بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی  
 کہ ارباب حکومت، یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہندوستان کے یہ چند  
 ترقی پسند سیاست دان ہی گویا سائے عوام کی نمائندگی  
 کرتے ہیں۔“

پھر آگے چل کر لکھتا ہے :-

”تقریباً انہی دنوں کے رگ بھگ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر  
 مانٹیگرنے جو مسٹر آسٹن چیپرلین کی جگہ وزیر ہند مقرر ہوئے تھے  
 ہندوستانی اصلاحات کے متعلق دارالعوام میں اپنا وعدہ تاریخی  
 اعلان کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ملک معظم کی حکومت کی پالیسی  
 یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہل ہند کو زیادہ  
 سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ اور یہ بھی ضروری  
 ہے کہ وہاں حکومت خود اختیاری کے اداروں کو تدریج ترقی  
 دی جائے تاکہ انجام کار ہندوستان ایک کامل ذمہ دارانہ  
 حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جز بن سکے  
 برطانوی اہل سیاست کا یہ پیغام جو اہل ہندوستانی  
 لیڈروں کے نام بھیجا گیا تھا کسی مخالفانہ تبصرے کا محتاج نہیں ہے  
 بشرطیکہ ایک حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔“



اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو اس ملک کی آبادی میں اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی آٹے میں نمک کو ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے لارڈ چیمفورڈ اور مسٹر مانٹیگونے اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کی تجاویز پر عمل کرتے وقت اس بنیادی حقیقت کو آسانی سے نظر انداز کر دیا تھا۔

اوڈ اور چونکہ فطرتاً شہنشاہیت پسند اور آمرانہ مزاج کا آدمی تھا۔ اس لئے اُس کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ مسٹر مانٹیگونے، ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو دارالعوام میں کیوں اعلان کیا۔ اُس کے نزدیک رعیت کی تالیفِ قلب کرنے کا منصب صرف اعلیٰ حضرت ملکِ معظّم کو حاصل ہے کہ وہ ازراہِ کرم گتیری ایک منشورِ خمسہ وائے جاری کر کے اپنی ہندوستانی روایا کے قلوب کو مسخر کرتے چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

”ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے منشور کی طرح یہ اہم اعلان بھی ملکِ معظّم ہی کی ذاتِ شاہانہ کی طرف سے صادر ہونا چاہیے تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اُس کا روتے سخن ہندوستان کے سیاست دانوں کی طرف نہ ہوتا۔ بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے منشور کی مانند اُس کی مخاطب ہندوستان کی وفادار و اطاعت گزار رعایا ہوتی۔ ذمہ دارانہ حکومت۔ جس کا ذکر مسٹر مانٹیگونے اپنے اعلان میں کیا تھا۔ ایک ایسا لفظ ہے جو ہندوستان میں شرمندہ معنی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس لفظ کا کوئی مترادف ہندوستان کی کسی زبان میں موجود ہے۔“

باقی رہے حکومتِ خود اختیاری کے ادارے۔ یہ گورکھ دھندہ بھی  
 ہندوستانی عوام کے فہم سے بالاتر ہے۔ انہوں نے حکومتِ خود اختیار کی  
 سے جو مطلب اخذ کیا وہ یہ تھا کہ برطانیہ اپنی ذمہ داریوں سے  
 عہدہ برآموئے بغیر اس ملک سے اپنا پورا یا بستر اٹھا رہا ہے۔  
 ہندوستان کے لوگ بادشاہِ وقت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو  
 اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کے عادی ہیں۔ وہ اُس غیر مرئی اور  
 غیر شخصی چیز سے نطو اداقت نہیں جیسے برطانوی حکومت کہا جاتا  
 ہے۔ اُن کی تمام تر عقیدت و نیاز مندی صرف بادشاہِ سلامت  
 کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ جو اُن کے نزدیک گویا اعلیٰ سبحانی  
 ہیں۔ افسوس کہ برطانیہ کے سیاست دانوں نے اپنی کوتاہ فہمی  
 سے اس جذبہ عقیدت سے فائدہ نہ اٹھایا۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں مسٹر ہائیگ کو سندھ درستان تشریف لائے۔ اور آئندہ  
 اصلاحات کے بارے میں انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے سرکردہ ذہنوں  
 سے گفت و شنید شروع کی۔ مانٹگومر کی روئے نہایت ہمدردانہ اور سلوک سے بے حد  
 شریفانہ تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ نزاع اور لڑائی بھگڑنے کے بلکہ  
 امور کا تقسیم ہو جائے۔ اور حکومت اور عوام کے درمیان خوش و ہمدردی  
 اور خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے وزیر  
 سے ملاقات کر کے انہیں اپنے قومی معاملات سے آگاہ کیا، وہ تمام اکابر  
 شریکیت سے جن کے شانوں پر اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا پارکران ماننا

مٹھا مثلاً مسٹر جناح - سر محمد شفیع - سر فضل حسین - سر وزیر حسن - سید حسن امام مسٹر  
 منظر الحق - راجہ محمود آباد - ڈاکٹر انصاری - مولوی فضل الحق وغیرہ - محمد علی اور  
 شوکت علی چونکہ نظر بند تھے - اس لئے مسٹر مانٹگیو ان کی ملاقات سے محروم ہے  
 اوڈنائرنے اس پوری کارروائی کا حال قلم بند کرتے وقت اپنے قلم سے  
 جس طرح لُغض و عناد کا زہر ٹپکایا ہے - اُس سے یہ بات تو قطعی عیاں ہو جاتی  
 ہے کہ اُسے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے سے سخت دشمنی تھی - لیکن ستم یہ  
 ہے کہ وہ اس سلسلے میں مانٹگیو اور چیمپفورد کو بھی معاف نہیں کرتا - اُس کے  
 خیال میں وزیر ہند اور والسراٹے کا یہ قصور سرگرم قابلِ درگزر نہیں کہ انہوں  
 نے ہندوستان کے اُن لوگوں کو منہ لگانا پسند کیا جن کو وہ حدودِ پنجاب میں قدم  
 رکھنے کی بھی اجازت دینے کو تیار نہ تھا - لکھتا ہے :-

”یہ لوگ (وزیر ہند اور اُس کے رفقاء) مہینوں دہلی میں بیٹھے  
 والسراٹے اور اُس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے گفت و شنید  
 کرتے رہے - اُن کے صبر و تحمل کی داد دینا چاہیے کہ انہوں نے تجویزوں  
 کے اُس پورے انبار کا مطالعہ کیا جو ہندوستان کی مختلف انجمنوں  
 کی طرف سے اُن کو موصول ہوئی تھیں - اور پھر انہی تجویزوں کے  
 حق میں لوگوں کے دلائل بھی سنے - ہندوستان کے سیاست دانوں  
 کو سبلا اپنی زندگی میں اس سے پہلے کہاں ایسا موقع میسر آیا ہوگا  
 کہ ایک ہمارے وزیر خواہ وزیر ہند اور متحمل وزیر وبار والسراٹے  
 کے روبرو پیش ہو کر دفتری حکومت کے نقائص بیان کر سکیں

اور ساتھ ہی یہ بھی بتاسکیں کہ خود اُن کے نزدیک ہندوستان کی  
 وسیع سلطنت کو بہتر نتیجہ پر چلانے کی کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ زمانے  
 کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ ایک سکول یا ایک اخبار بھی کامیابی سے  
 نہ چلا سکتے تھے۔ اور جن کو ایک میونسپل کمیٹی کے انتظام کا بھی سلیقہ  
 نہ تھا اب وہ بڑھ بڑھ کر ایک عظیم الشان سلطنت چلانے کی  
 تجویزیں پیش کرنے میں مصروف تھے۔ بعض کو تو اپنی ہمہ گیر  
 حیثیت جاننے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک روز وہ ہندو سبھا کے  
 نمائندے کے طور پر حاضر ہو کر ایک تجویز پیش کرتے۔ اور دوسرے  
 ہی روز زمینداروں کے وفد کے ممبر بن کر بالکل الٹ مشورہ دینے  
 کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس تمام کارروائی میں شرکت کرنے  
 کے بعد یہ لوگ اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اور خود فریبی

سہ ہندوستانی لیڈروں کے متعلق اوڈووائرنے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا مقابلہ مسٹر  
 ہانٹنگو کی رائے سے کرنا چاہیے۔ وہی میں مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے بعد مانینگو نے اپنی  
 ڈائری میں جو تاثرات درج کئے تھے۔ اُن میں لکھا ہے: "..... ان لوگوں کے بعد جناح آیا۔  
 جو ایک رعب دار شخصیت اور نہایت ہندب اطوار کا مالک ہونے کے علاوہ بحث و تمحیص کے فن کا  
 بہت بڑا ماہر ہے۔۔۔۔۔۔ چیمفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کے سامنے اس کی  
 پیش نہ چل سکی۔ جناح یقیناً بڑا قابل اور ہوشیار آدمی ہے۔ اور یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایسے  
 شخص کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل حاصل نہیں۔"

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

اور غلط فہمی کی انتہا یہ ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور اُن کے رفیق بھی اُن کی  
اہمیت کے قائل ہوتے جاتے تھے

”صوبوں کے لفٹ گورنروں اور گورنروں کو بھی اکثر متوسلے کے  
نے طلب کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ہم لوگ اس سیاسی تماشے سے جو  
دہلی میں سو رہا تھا کہیں ضروری کاموں میں مصروف تھے۔ ہمارے  
سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا۔ اور جب ہمیں ایسے ضروری  
کام کو چھوڑ کر دہلی جانا پڑتا تھا۔ تو ہم لوگ دل ہی دل میں پیچ و تاب  
کھاتے تھے کہ برطانوی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نازک وقت  
میں اُس نے اصلاحات کا ڈھونگ رچا دیا ہے۔“

”دہلی میں جو معاملات طے کئے جا رہے تھے۔ اُن کے متعلق دیہاتی  
عوام سے مشورہ لینے کا نہ واسطے کو خیال آیا اور نہ وزیر ہند کو۔ اول  
تو وقت اس قدر قلیل اور ہمت اتنی مختصر تھی کہ مجوزہ اصلاحات  
کے بارے میں دیہات کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کا موقع ہی  
نہ مل سکا۔ حالانکہ یہ امر بے حد ضروری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے  
کہ میں نے دو آئین بار دہلی میں وزیر ہند اور اُن کے ساتھیوں  
سے کہا بھی کہ محض ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے بیانات  
پر اعتماد کر لینا قرین مصلحت نہیں۔ میرے ساتھ کسی اتوار کو پنجاب  
کے دیہات میں چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ کہ حکومت کا  
نظم و نسق کس قابل رشک خوبی سے چل رہا ہے۔ وہاں لوگوں سے

خود بات چیت کر کے دریافت کر لیجئے کہ آیا ان کو حکومت سے کوئی شکایت ہے۔ لیکن وزیر ہند کو دہلی میں چاروں طرف سے ہندوستان کے لیڈروں نے گھیر رکھا تھا۔ انہیں میرے ساتھ پنجاب کے دیہات میں جانے کی کہاں فرصت تھی۔

”یہ تحقیقاتی کارروائی نومبر ۱۹۱۷ء سے لے کر اپریل ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اور اول تا آخر کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ دیہات کے ان بد نصیب باشندوں سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے۔ جن کی زندگیاں صرف ہل جوتنے اور فصل بونے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ میں نے جب وہ ایک مرتبہ اس قسم کی کوشش کی تو مجھے ہندوستان کے مقبول اور سر دلعزیز قومی لیڈروں کا بدخواہ اور تعلیم یافتہ جماعت کی انگلیوں اور آرزوؤں کا دشمن تصور کیا گیا۔

”..... ۱۹۱۹ء میں جب تیلک اور ان کے رفیقوں کو ہندوستان سے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ تو یہ لوگ بھاگے بھاگے انگلستان پہنچے۔ تاکہ اصلاحات کو اور زیادہ اپنے حسبِ منشا رنگ دینے کی کوشش کر سکیں۔ لندن میں انڈیا آفس کے دروازے ان لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ اپنے اثر و رسوخ اور کچھ لیبر پارٹی کے بعض ممبروں کی اعانت سے ان لوگوں نے خاصی کامیابی حاصل کر لی اور اصلاحات کی سکیم میں بہت کچھ اپنے منشا کے مطابق اضافہ کر لیا۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

یہ لوگ بارسوخ اور منظم تھے۔ روپے کی سبھی ان کو کمی نہ تھی۔ پھر  
 طرفہ یہ کہ پر اپا گنڈے کے فن کے سبھی ماہر تھے۔ اس لئے اپنی اغراض میں  
 کامیابی حاصل کر لینا ان کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ مصیبت تو  
 بیچارے پنجاب کے دیہاتیوں کے لئے تھی جن کے پاس نہ تنظیم تھی۔ اور نہ سرمایہ  
 اور جو پر اپا گنڈے کے طور طریقوں سے بھی واقف نہ تھے۔ انہیں وہ  
 رہ کر احساس ہوتا تھا کہ اصلاحات کے اس سارے ڈھونڈنے کے  
 مفاد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے چنانچہ انہوں نے حکومت ہند سے  
 درخواست کی کہ ان کو سبھی اپنے نمائندوں کا ایک علیحدہ وفد انگلستان  
 بھیجنے کی اجازت دی جائے جو انڈیا آفس اور پارلیمنٹ کے سامنے  
 ان کے مطالبات کو بطریق احسن پیش کر سکے لیکن حکومت ہند  
 نے انتہائی بے رخی سے یہ مطالبہ رد کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے دوبارہ  
 التجا کی کہ اگر ہمارے وفد کو پارلیمنٹ یا انڈیا آفس شرف باریابی  
 بخشنے کو تیار نہیں تو کم از کم ان فوجی افسروں ہی سے ہمارے وفد کو  
 زیاں اور ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کے متعلق  
 استفسار کر لیا جائے۔ جو اس وقت جشنِ فتح کی تقریب کے سلسلے  
 میں انگلستان میں مقیم تھے لیکن حکومت نے اس گزارش کو قبول  
 کرنے سے سبھی انکار کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس سارے کھیل کے دوران میں پنجاب کی دیہاتی  
 آبادی کا ایک نمائندہ بھی انڈیا آفس تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

اور نہ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے شہادت دے سکا اسے سیاست دانوں کی شاطرانہ چال یا ان کی ہوشیاری سے تو بہر حال تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن یہ طرز عمل، یقیناً برطانوی قوم کی دیانت و امانت کے دامن پر ایک سیاہ دجھے کی حیثیت رکھتا ہے۔“

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس اس لئے درج کیا ہے کہ اس سے اوڈوائٹر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکے اور اس کے نہاں غائبہ دماغ میں پرورش پانے والی بعض سازشوں کا حال بھی عیاں ہو جائے۔ اوڈوائٹر کے نزدیک ہندوستان کا دائرہ لارڈ چیمفورڈ اور وزیر ہند مانتیگودونوں میں صرف تغل و ہوش سے عاری اور مصلحت و دور بینی سے محروم تھے بلکہ برطانیہ کے بڑے بدخواہ اور دشمن بھی تھے۔ کیونکہ عین اُس وقت جب ہندوستان کے سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا انہوں نے دہلی میں بیٹھ کر اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی کا ڈھونگ رچا دیا۔

مانٹیگو اور چیمفورڈ کے علاوہ وزیر برطانیہ کی پوری پارلیمنٹ اور کینٹاکو بھی مورد الزام اور لائق تعزیر قرار دینے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ حیران ہے کہ انگریزی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے چند شورش پسند لیڈروں سے مرعوب ہو کر وہ اس ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام اور حکومت خود اختیاری کے اداروں کو فروغ دینے کے وعدہ و پیمانہ کر رہی ہے۔ وہ اندیامنس کو بھی لعن طعن کرنے سے باز نہیں آتا کہ اس نے اپنے دروازے کیوں ہندوستانی لیڈروں کے لئے کھول رکھے ہیں۔ وہ برطانیہ کی کونیشن وزارت



کو بھی قابل الزام گردانتا ہے کہ اُس نے مانگیو ایسے شخص کو جو ہندوستان کے حقیقی مسائل سے قطعاً بے خبر ہے کیوں وزیر ہند کی کرسی پر بٹھا رکھا ہے۔

غرض ملکِ معظم کی ذاتِ والا صفات سے قطع نظر جو اس کے نزدیک ہندوستانیوں کے لئے نعلِ سجانی اہماں پناہ اور منبعِ جوہر و سجا تھی۔ وہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے لے کر ہندوستان کے وائسرائے تک ہر شخص کو "برٹش امپائر" کا بدخواہ سمجھتا ہے اور اُس کے خیال میں اگر کوئی شخص برطانیہ کا سچا سہمدار وہی خواہ امعاہل اور خیر اندیش تھا تو وہ خود سہرا نیکل اوڈواٹر تھا۔

بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جب اصلاحات کے مسودے پر لندن میں غور و خوض شروع ہوا۔ تو اوڈواٹر نے اُس وقت بھی اپنی فتنہ انگیز کوششوں کو ترک نہیں کیا۔ اُس نے پنجاب کے چند بڑے بڑے زمینداروں کو جو حقیقتاً اُس کے اپنے آدمی تھے۔ اور جن پر اُس نے دورانِ جنگ میں ہر ہانے سے دولت و حشمت اور انعام و اکرام کی بے دریغ بارش کی تھی۔ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان جا کر پنجاب کی دیہاتی آبادی کی طرف سے اصلاحات کی مخالفت کریں۔ اوڈواٹر کس درد مندی سے کہتا ہے کہ "دیہات کے اُن باشندوں سے جن کی زندگیاں صرف ہل جوتے اور فصل ہونے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ کسی نے نہ پوچھا کہ مجوزہ اصلاحات کے بلے میں اُن کی کیا رائے ہے۔"

انہی ہل جوتے اور فصل ہونے والے مظلوم انسانوں کی آڑ لے کر وہ چند ایسے متمول اور خود غرض زمینداروں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتا تھا جن کی ساری

زندگیاں اہل دل کی آستان بوسی، کاسہ لیبی اور تملق و خوشامدیں گزریں  
تھیں۔ اور جن کے نزدیک لاٹ صاحب کا گوشتہ پشم التفات عقبی کی تمام نعمتوں  
سے زیادہ قیمتی تھا اور جب دائسرا نے اس قسم کے وفد کو غیر ضروری اور نقصان  
رسان سمجھ کر یہ درخواست رد کر دی تو اوڈو وائر عزم و غصہ کے آنسو بہا بہا کر اپنے  
دامن اور صفحہ قرطاس دونوں کو داغدار کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ چیمسفورڈ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اوڈو وائر نے پنجاب  
میں ہر قسم کی سیاسی تحریکوں کو ختم کرنے کے لئے دیہاتی اور شہری آبادی میں اختلاف  
کابینج بول رہا ہے۔ چنانچہ جب اُس نے ۳۱ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مرکزی مجلس قانون  
ساز کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کو برا بھلا  
کہا۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بلاوجہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے۔ تو ایوان میں  
کھلبلی مچ گئی۔ اور آخر لارڈ چیمسفورڈ کے اصرار پر اوڈو وائر کو اپنے الفاظ  
واپس لینا پڑے اور ایوان کے تمام ممبروں سے معافی بھی مانگنا پڑی۔

جس بات پر یہ جھگڑا سہا وہ بالکل معمولی تھی۔ سر محمد شفیع نے ایک تجویز  
پیش کی تھی کہ صوبہ بہار اڑیسہ کی طرح پنجاب میں بھی قانون سازی ڈیپلٹس  
اور انتظامی (ایڈمنسٹریٹو) امور کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے بجائے  
آپس میں ملا دینا چاہیے۔

اس تجویز پر تقریر کرتے ہوئے بلاوجہ اور بغیر کسی موقع و محل کے اوڈو وائر  
نے کہنا شروع کر دیا کہ :-

” آج کل یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سے سیاسی تقریروں کا

شور سن سن کر ہمارے کان بہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور سیاسی  
 دستاویزوں اور یادداشتوں کی بھرمار دیکھ دیکھ ہاری آنکھیں  
 چندھیاتی جا رہی ہیں۔ کیا اس شور و شغب میں میرا یہ کہنا مناسب  
 نہیں کہ اس طوفانِ بے تمیزی کو ختم کر کے ہمیں اپنے دل و دماغ  
 کو لایعنی تصورات اور بے معرفت توہمات سے پاک کر دینا چاہیے  
 اور لمحہ بھر کے لئے سوچنا چاہیے کہ آخر اس ساری سیاسی شعبد بازی  
 کا اُن غریب دیہاتیوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جن کی زندگیاں ہل  
 چلائے، فصلیں بولنے اور پھر اُن فصلوں کو آفاتِ ارضی و سماوی  
 سے محفوظ رکھنے کے لئے وقف ہو چکی ہیں؟

اوڈوآئر کی یہ تقریر کافی طویل تھی۔ جس کے دوران ہی میں کونسل کے  
 مندرستانی ممبروں نے جن پر وہ بے طرح برس رہا تھا۔ اُسے بار بار ٹوکا۔ جب وہ  
 اپنی سٹ سے باز نہ آیا تو مسٹر منظر الحق۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر خلیج  
 ازراہ احتجاج اٹھ کر ایوان سے چلے گئے۔ والٹر نے خود اوڈوآئر کی اس  
 بدنامی کو محسوس کیا۔ اور اُسے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کو  
 بمشکل ایک ہفتہ گزرا سو گا کہ اُس نے ۳۰ اکتوبر کو پنجاب کی صوبائی کونسل  
 میں تقریر کرتے ہوئے پھر انہی خیالات و جذبات کا اعادہ کیا۔

اوڈوآئر کے اس سائے ہدیابان اور اُس کی تمام مخالفانہ سازشوں کے  
 باوجود مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمنفورڈ کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور اصلاحات  
 کا ایک خاکہ تیار ہو گیا۔ حکومتِ ہند نے ان اصلاحات کی حمایت میں ۵ مارچ ۱۹۱۹ء

کو اپنا اعلان شائع کیا۔ تو اس اعلان کے ساتھ اوڈو آئر نے اپنا ایک اختلاقی نوٹ بھی لکھ ڈالا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اختلاقی نوٹ اس کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ذائقہ کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اوداب وہ کسی صورت سے حالات کے دھاکے کا رخ نہیں بدل سکتا تو اس نے ایک پٹے ہوئے کھلاڑی کی طرح چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینے اور اس طرح اپنی جس انتقام کو تکین بننے کی کوشش کی۔

اس اختلاقی نوٹ میں اوڈو آئر نے نام لے لے کر مسٹر جناح۔ مسز اپنی بسنٹ۔ لوکانیہ تلک۔ پنڈت مالوی اور راجہ محمود آباد کو برا بھلا کہا۔ اس نے ان لیڈروں کی نیٹوں پر حملہ کر کے انہیں خود غرض و متورش لپیڈ قرار دیا۔ اس نے تحریک عوام رول کی جی کھول کر مذمت کی۔ اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو عوام کا بدخواہ ظاہر کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو اس نے ایک نہایت غیر سائنڈہ جماعت قرار دے کر حکومت کو متنبہ کیا کہ لیگ نے مسلمان عوام کی سائنڈگی کا جو دعویٰ کیا ہے۔ وہ سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اور آخر میں لکھا کہ :-

”یہ امر بالکل واضح ہے کہ اصلاحات کا تقاضا ملک کے عوام نے بالکل نہیں کیا۔ حالانکہ عوام ہی کے مفاد کی نگہداشت حکومت کا فرض اولیٰ ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ ہندوستان کے باشندوں کی لیگ نہایت قایل تعداد کی طرف سے پیش ہوا ہے جو محض اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اقتدار کی خواہاں اور عہدوں کی بھوک سے

اگر ہیں اپنے اُس عہد کا کچھ پاس ہے جو ہم نے ہندوستان کی بے زبان مخلوق کی حفاظت کے لئے کیا تھا۔ تو لاریب ہمارا یہ فرض ہوتا چاہیے کہ ہم اس بے زبان رعایا کے مفاد کو مقدم درجہ عطا کریں اور سیاسی لیڈروں کے شور و شغب کی کچھ پروا نہ کریں۔ خواہ وہ اس شور سے قیامت ہی کیوں نہ برپا کر دیں۔ میں یہاں ہرکت کے وہ یادگار الفاظ درج کرتے پر مجبور ہوں۔ کہ اگر میدان کے کسی ایک گوشے میں جھاڑی کے نیچے نصف درجن بڈے جمع ہو کر اپنی ٹپس ٹپس کے مکروہ شور سے آسمان سرسبز اٹھالیں اور اسی میدان میں شاہ بلوط کے اونچے اونچے سایہ دار درختوں کے نیچے سینکڑوں گائے بھینسیں اطمینان سے بیٹھی جگالی کر رہی ہوں۔ تو وہیں اس غلط فہمی میں سرگرمیتلا نہیں ہونا چاہیے کہ میدان میں صرف پیچ و پکار کرنے والے بڈے ہی آباد ہیں۔

میں دوبارہ اس امر کی یاد دہانی کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے محض یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مطالبات کی تسکین کیوں کر کی جائے۔ بلکہ سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس ملک کے عوام کی بھلائی کی صورت کیا ہونی چاہیے۔ میں عوام کی بھلائی پر بار بار اس لئے زور دے رہا ہوں کہ مجھے حکومت ہند کی موجودہ تجاویز میں اُن کی سو دہبود کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ غالباً حکومت نے عہد اس طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ہیں اپنے اُس عہد کو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھوں سے ادجھل نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر ہم بہ فرضِ محال اُس عہد سے چشم پوشی سہی کر لیں۔ تو اس سلسلے قضیے میں سے جو چیز بالکل عیاں اور واضح ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ ان مجوزہ اصلاحات کا خاکہ تیار کرنے میں ہمارے سلسلے صرف تعلیم یافتہ جماعت کے ایک محدود طبقے کی خوشنودی تھی۔ کیا ہمارا یہ فعل کسی اعتبار سے عقلمندی یا دانائی کی دلیل سمجھا جاسکتا ہے؟ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ محدود طبقہ، جس کی خوشنودی کو ہم نے ہر حال میں مقدم سمجھ رکھا ہے ادبیات کے عوام کی ناسندگی کا بھی دعویدار ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ گزشتہ چند مہینوں کے واقعات میرے اس بیان کی تصدیق و تائید کے لئے کافی ہیں۔

میرے اس قول کی صداقت کو آزمانے کے لئے آپ جو معیار چاہیں استعمال کریں۔ مذہبی فمادات کی روک تھام کا سوال ہو یا فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹانے کا مسئلہ درپیش ہو۔ فوجی بھرتی کے لئے رنگ و لٹوں کی فراہمی کا معاملہ ہو یا ملک کے دفاع کا سوال پیش نظر ہو۔ ہر حال اور ہر صورت میں شہر کے تعلیم یافتہ سیاسی لیڈر آگے آئے کی بجائے گھروں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملکِ ملت کے لئے مفید اور نفع بخش تحریکوں میں شرکت کرتا یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ ہاں جہاں فتنہ و فساد برپا کرنے یا شراہیگری کی

آگ بھڑکانے کی گنجائش ہوگی۔ آپ ان کو ہمیشہ ہمیشہ آگے آگے  
پائیں گے۔“

اوڈواٹر کی مندرجہ بالا تحریر پڑھ کر ایک عام حالات سے ناواقف شخص یہ  
سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر واقعی شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ دیہاتی آبادی  
کے دشمن اور بد خواہ تھے۔ تو حکومت ہند کو کیا ہو گیا تھا کہ سب کچھ دیکھنے سجاتے  
ہوئے اُس نے ہندوستان کی اصل آبادی کو چند درندوں اور سمیڑیوں کے  
سامنے پھینک دینے سے دریغ نہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوڈواٹر کے خیال  
میں لارڈ چیمس فورڈ اور اُن کی ایگزیکٹو کونسل کے تمام ممبر جن میں صرف ایک  
ہندوستانی (سہ سنگرن ٹائمر) تھا اور باقی چھ انگریز تھے۔ وزیر ہند مانٹینگو اور اُن  
کی کونسل کے تمام ممبر۔ جن میں صرف دو ہندوستانی (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں  
اور بھوپندر ناتھ باسو) تھے اور باقی آٹھ انگریز تھے۔ سب کے سب اس سازش  
میں شریک اور معاون تھے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے دو درجن لیڈروں کو  
خوش کرنے کے لئے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان باشندوں کو قربان  
کر دینا چاہیے۔

یہاں اس بات کا توقع نہیں کہ میں ان اصلاحات کی وضاحت کر سکوں  
جن کی مذمت میں اوڈواٹر نے تقریر و تقریر کے تمام حربے استعمال کر ڈلے ہیں! مذمت  
چند صفحات میں چونکہ اس موضوع پر مفصل بحث ہونے والی ہے۔ اس لئے سترہ سترہ  
میں آنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ جن اصلاحات کو اوڈواٹر دیہات  
کے باشندوں کی تباہی و بربادی اور شہر کے شورش پسند لیڈروں کی

نفع اندوزی کی دستاویز سے تعبیر کرتا ہے۔ اُن اصلاحات کی رُو سے جب پنجاب میں پہلی مجلس قانون ساز قائم ہوئی تو اُس کے منتخب شدہ مسلمان ارکان کی کل تعداد چونتیس<sup>۳۲</sup> تھی جنہیں سے اُنتیس<sup>۲۹</sup> دیہاتی اور صرف پانچ شہری علقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔

لیکن ہے بعض لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ وزیر ہند مانسیگو اور اُن کے رفقاءے کار چونکہ ہندوستان میں نو وارد تھے اور انہوں نے اصلاحات کے متعلق اپنی تحقیقات کا پورا دُور دہلی میں بیٹھ کر ختم کیا تھا۔ جہاں بقول اوڈوائر "اُن کو چاروں طرف سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں نے گھیر رکھا تھا" اِس لئے اُن تک دیہات کے باشندوں کی آواز نہ پہنچ سکی ہوگی۔ یاد دہاتی آبادی کی تکالیف کی صحیح تصویر وہ ملاحظہ نہ کر سکے ہوں گے۔

آئیے! اِس بارے میں اِس رپورٹ کا جو ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو وزیر ہند اور وائسرائے کے مشترکہ دستخطوں سے شائع ہوئی تھی ایک ٹکڑا مطالعہ کریں۔

"..... سب سے پہلے ہم دیہاتی آبادی کی ضروریات اور تکالیف کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ شہروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جوں جوں لوکل باڈیز کی قسم کے ادارے قائم ہوں گے اور گاؤں کے لوگوں کو اپنے ووٹ سے مقامی معاملات ٹٹے کرنے کا موقع ملے گا۔ اُن کی سیاسی تربیت کا گویا آغاز ہو جائے گا۔ جب کسی گاؤں کے باشندے یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے بچوں کی تعلیم کے لئے وہاں کوئی سکول نہیں۔ یا شہر کی منڈی تک



جانے کے لئے کوئی سٹرک موجود نہیں۔ تو وہ ان تکلیفوں کے ازالے کے لئے حسب سابق ضلع کے کلکٹر کے پاس درخواست لے کر نہیں جائیں گے بلکہ اُس امیدوار کو ووٹ دیں گے جو اس بات کا وعدہ کرے گا کہ وہ سکول کے قیام اور سٹرک کی تعمیر میں اُن کی پوری مدد کرے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ شروع میں حسبِ نثار نتائج برآمد نہ ہوں۔ لیکن صبر اور محنت سے کام آسان ہو جائے گا۔

یہ سبھی ممکن ہے کہ ابتداء میں سادہ لوح دیہاتیوں کو بہلا سچسلا کر یا ڈرا دھمکا کر اُن سے ووٹ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن انجام کار اُن پر اس حقیقت کا انکشاف یقیناً ہو کر رہے گا کہ اس زمانے میں ووٹ بہت بڑی طاقت اور قومی امانت ہے۔ جس کے صحیح استعمال سے اُن کو بے حد فائدہ پہنچنے کا امکان۔ اور جس کے غلط استعمال سے اُن کی مصیبتوں میں اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے دنیا میں جہاں جہاں دیہاتی آبادی کو ووٹ کا حق عطا ہوا ہے۔ ابتداء میں اسی قسم کی دشواریاں پیش آئی ہیں۔

جوں جوں ان کی سیاسی تربیت کے ابتدائی مراحل طے ہوئے اور دیہاتی اپنے ووٹ کے صحیح استعمال کی طاقت سے آشنا ہونگے وہ حکومت کی تعمیر و تشکیل پر بھی اثر انداز ہو سکیں گے۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ مالک اراضی یا بڑے بڑے زمیندار اپنے مزارعین

پر تشدد کرتے ہیں۔ یا ساہوکار سودور سودو کا چکر چلا کر انہیں ان کی زمینوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یا تحصیل کے سرکاری کارندے بے جا سختی سے پیش آتے ہیں۔ تو وہ لاسٹی یا کلہاڑی کی ضرب سے اپنے دشمن کا سر کھل دینے کی بجائے اپنے وردٹ سے ایسا آدمی منتخب کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو ان مشکلات کو رنج کرنے میں ان کی مدد کر سکے۔ وہ آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اگرچہ حکومت کا صدر مقام ان کے گاؤں سے بہت دُور ہے۔ لیکن حکومت کی مشین جن پرزوں سے چلتی ہے۔ ان میں سے دوا ایک پڑے وہ خود بھی ہٹیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر تمام اچھے اور کارآمد پڑے جمع ہو جائیں تو نظام ہے کہ مشین پہلے سے بہتر چلنے لگ جائے گی۔

لیکن اس ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ دیہاتیوں کی ذہنی اور سیاسی تربیت خود بخود نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے بعض خارجی عناصر کی مدد درکار ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ سرکاری حکام اور وہ لوگ جو دیہاتیوں کے وردٹ سے نیابتی اداروں میں جانا چاہتے ہیں اس فرض سے ہمراہ ہونے کی کوشش کریں گے۔

”یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب گاؤں کے لوگ دیکھیں گے کہ جو شخص ان کے وردٹ حاصل کر کے کونسل کا ممبر بنتا اور عزت و

توقیر حاصل کرتا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تو وہ یقیناً اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں گے۔ تاکہ وہ بھی آئندہ اسی قسم کے اعزاز کے مالک بن سکیں۔ آج تک دیہاتیوں نے اپنے بچوں کو اس خوف سے تعلیم سے محروم رکھا ہے کہ مبادا وہ پڑھ لکھ کر ہل چلانا اور کاشت کاری کا کام کرنا چھوڑ دیں۔ اور اس طرح انہیں مالی اور اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑے لیکن اب ان کے سامنے انہی کے بھائی بندوں میں سے ایک شخص نے تعلیم کا نیا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ گاؤں ہی کا رہنے والا ہے اور گاؤں کے لوگوں کے ووٹ حاصل کر کے انہی کا نمائندہ بن کر صوبے کی کونسل میں جا کر حکمرانی اور قانون سازی کے کاموں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ قابل تقلید مثال انہیں تعلیم کے فوائد سمجھانے اور علم کی خوبیاں ذہن نشین کرانے میں باقی تمام مثالوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔

”ہم یہاں ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی دو ایک باتیں کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خلاف بعض لوگوں کی طرف سے یہ الزام لگا یا جا رہا ہے کہ انہوں نے اب تک صرف اپنی اغراض کی پاسداری کی ہے۔ اور دیہاتیوں کے مفاد کو بہت کم درجہ اختیار خیال کیا ہے اس الزام کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں لیکن اب یقیناً ان کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے پس ماندہ بھائیوں کی مدد کے لئے

آگے بڑھیں۔ دیہات میں کام کرنے کی بے حد گنجائش ہے۔ جہالت اور توہمات کی تاریکی کو دور کرنا۔ قبیلوں اور برادریوں کی خانہ جنگی کو رُخ کر کے قومیت کا صحیح تصور پیدا کرنا زندگی اور معیشت کی معمولی آسائشیں جو شہروں میں عام ہیں اور دیہات میں غنقا۔ انہیں گاؤں کے لوگوں تک پہنچانا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صدیوں کی ذبی ہوئی مخلوق کو عزت نفس اور خود اعتمادی کے جوہر سے مالا مال کرنا۔ یہ اتنا عظیم الشان اور محنت طلب کام ہے کہ ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگوں کو فوراً اس طرف توجہ کرنا چاہیے۔“

اڈوانٹر کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران میں اصلاحات کا ذکر چھیڑ دینا وزیر ہند اور وائسرائے کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کے نزدیک حکومت کا فرض تھا کہ اصلاحات کا مطالبہ کرنے والوں کو، خواہ وہ کانگریس کے نمبر تھے یا مسلم لیگ کے، فوراً جیل میں بند کر دیا جائے۔ لیکن اس ضمن میں مسٹر ہنٹنگ اور لارڈ چیمفورڈ نے اپنی مشترکہ رپورٹ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یکسر مختلف تھے۔ مثلاً

”..... جنگ اور جنگ کی وجہ سے بیدار ہونے والے جذبات نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے مسئلہ کو بہت اہم بنا دیا ہے اہل ہند نے جب دیکھا کہ جنگ کی تمام مولنا کیوں کے باوجود پارلیمنٹ کو اس بات کی ٹہلت مل سکتی ہے کہ وہ آئرلینڈ کی گنتی کو سلجھا سکے

تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان کو اصلاحات سے محروم رکھنے کے لئے جنگ کو کیوں بہانہ بنایا جا رہا ہے..... ہم بخوشی یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ہندوستان نے بہر صورت اپنے آپ کو مزید اعتماد اور بہتر طرز حکومت کا اہل ثابت کر دکھایا ہے۔ آئندہ ہندوستان کی حکومت میں جو تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اُن کو ہندوستان کی جنگی خدمات کا معاوضہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہ تبدیلیاں صرف اس لئے کی جائیں گی کہ ہندوستان اب اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اُسے ان مراعات سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔“

اڈو وائسرائے کے پشاق لکھنے کا دشمن۔ اور تحریک ہوم رول کا بدترین مخالف تھا۔ اس نے امپیریل کونسل کے انیس ممبروں کے میمورنڈم کو شورش اور بدامنی کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کے سامنے جب مانٹیگوا اور چیمفورڈ نے ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو اپنی مشترکہ رپورٹ مرتب کی۔ تو اُس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے۔

”..... زیادہ سے زیادہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ موجودہ جنگ گویا حریت اور استبداد کی جنگ ہے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طاقت ور قوموں کی طرح کمزور قوموں کو بھی اپنی خود مختاری اور آزادی پر قرار کہنے کا حق حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف ممالک کے باشندوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے پر قادر ہو سکیں۔“

”جب ہم بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ برطانیہ محض حریت اور آزادی کے اصولوں کو برقرار رکھنے کے لئے اس جنگ میں شامل ہوا ہے تو لا محالہ ہندوستان کے لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو آزادی کی نعمت سے کیوں محروم کر رکھا ہے؟ ..... اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مداس میں باقاعدہ ہوم رول تحریک کا قیام عمل میں آیا اور مہینہ بھر کے بعد ہندوستان کی مرکزی کونسل کے اٹیس منتخب شدہ ارکان نے اصلاحات کے بارے میں اپنی تجاویز ایک میمورنڈم کی صورت میں مرتب کر کے حکومت ہند کو ارسال کر دیں۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے یادگار جلسوں کے بعد سیاسی اصلاحات کا ایک مشترکہ خاکہ تیار کیا۔ جو اپنی تجاویز کے اقتداء سے اٹیس نمبروں کے میمورنڈم کی گویا شرح و تفصیل تھی..... کانگریس اور لیگ کے اس اشتراک عمل کو سندھوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور ان دونوں قوموں کے مشترک نصب العین سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ہندوستان کا ہر ہی خواہ اس صورت حال سے خوش ہو کر میثاق لکھنؤ کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے۔ اور یہ میثاق یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔“

اوڈھاسر کی ملازمت کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ آزادی کی جس تڑپ کو مٹانے

کے لئے اُس نے ہر ممکن حربہ استعمال کر ڈالا تھا۔ وہ ٹرپ ہٹ نہ سکی۔ اُس نے لوگوں کی آنکھوں پر ٹہریں اور کانوں پر تالے لگا دینے کی کوشش کی تھی تاکہ حریت اور آزادی کے جوئے نئے بلند ہو رہے تھے۔ وہ کانوں کی راہ سے دل میں جگہ نہ پاسکیں۔ اور جوشِ عمل کی جو زندہ جاوید تصویریں فضا میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ آنکھوں کے اندر اتر کر روح کو مجلا و متورنہ کر دیں۔ اُس نے لاسور، منصور، امرتسر، گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور لائل پور وغیرہ میں مارشل لا جاری کر کے مظالم کی وہ آگ برساتی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف ۱۸۵۷ء کا کشت و خون ہی پیش کر سکتا ہے۔

ان مظالم کے ذکر سے سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں چودہ چودہ برس کے بچوں کو ٹنگٹکی میں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا گیا۔ کم از کم بیس کوڑوں کی سزا مقرر تھی۔ حالانکہ بڑے سے بڑے سخت جان کی کھال بھی چھو کوڑوں کے بعد اُدھر جاتی ہے۔ اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہر محلے سے چن چن کر معززین کو گھروں سے نکالا گیا اور انہیں برس برس پاتھکھڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر بازاروں میں پھرایا گیا۔ تاکہ کھلے بندوں ان کی تذلیل ہو۔ وہ لوگ جو اپنی قابلیت کی بنا پر آئندہ ہائی کورٹ کے جج اور صوبے کے وزیر بننے والے تھے انہیں گورنمنٹ کے سپاہیوں سے پیٹا کر پھالسی کے مجرموں کی کاسٹریوں میں بند کیا گیا۔ مئی کی گرمی میں لاسور کے کالجوں کے طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سردوں پر اپنے بستر اٹھا کر دن میں چار مرتبہ سولہ میل سافا صدمہ طے کر کے آئیں اور یونین جیک کو سلامی دیں۔ لاسور کے تمام باشندوں کو حکم مل گیا کہ وہ اپنی

موٹر کاریں - سائیکلیں - بجلی کے پنکھے اور بجلی کے لیمنپ فوج کے حوالے کر دیں۔ سکول کے بچوں کو ہر روز صوبہ میں کھڑے ہو کر، ایک فوجی افسر کے سامنے، یہ کہنا پڑتا تھا: "حضور! ہم نے کوئی مقصد نہیں کیا۔ ہماری توبہ۔ آئندہ بھی ہم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوگی۔"

ایک پوری ہرات کو جس میں دوٹھا سبھی شامل تھا بلاوجہ پکڑ کر کورٹوں سے پٹا ڈالا گیا۔ ریل گاڑیوں پر آزادانہ سفر کی ممانعت کر دی گئی اور سوائے اُن لوگوں کے جن کو فوجی حکام پاس عنایت کرتے تھے۔ اور کوئی شخص سفر نہیں کر سکتا تھا۔ عورتوں کی کھلے منہ بے حرمتی کی گئی۔ ایک گلی مقرر کی گئی۔ جس میں سے ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اوپر گورہ فوج کا سپاہی ہاتھ میں بندوق تھام کر کھڑا رہتا تھا۔ اور اگر رینگنے والا شخص ذرا دم لیتا تو سپاہی بندوق کا کُنڈا اس کی پشت پر مارتا تھا۔ شہر کے بعض معزز اور سربراہان و لوگوں کے مکانوں پر مارشل لاء کے احکام کے اشتہار چسپاں کر دیئے جاتے تھے۔ اور حکم تھا کہ اگر کسی نے اس اشتہار کو سچھاڑ دیا تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ چنانچہ صاحب خانہ کو محض اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے دن بھر اپنے مکان سے باہر دیوار کے قریب کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ تاکہ کوئی شخص اشتہار کو ہاتھ نہ لگائے۔ لاہور میں سر نفضل حسین خلیفہ شجاع الدین اور پیر تاج الدین جیسے اسیاب کے مکانوں پر بھی اس قسم کے اشتہار چسپاں کئے جاتے تھے۔ اور انہیں تمام دن مکان کے باہر کھڑے رہنے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی۔



ویاں سنگھ کا بیج کی بیرونی دیوار پر کسی نامعلوم شخص نے ایک اشتہار لگا دیا۔ جس کا مضمون فوجی حکام کے نزدیک قابل اعتراض تھا۔ اس جرم کی پاداش میں کا بیج کے پرنسپل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور آخر اس غریب کو ڈھائی سو روپے جرمانہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنا پڑی۔

حکم صادر ہو گیا کہ جو نہی کوئی انگریز نظر آئے۔ مقامی باشندوں کا فرض ہے کہ فوراً تانگے سے اتر کر کھڑے ہو جائیں۔ اور جمعک کر سلام کریں۔ ایک پچیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے کے اندر مٹی کے ٹینے میں پھینک دیوں کو بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ ہفتہ بھر مقید رہے۔ اور بول و براز کے لئے بھی انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تقویر میں منادی کر دی گئی کہ جو لوگ، اپریل ۱۹۱۹ء سے پہلے یا اس تاریخ کے بعد شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ اگر چاروں دن کا اندازہ واپس نہ آئے۔ تو ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔

جب فوجی عدالتوں کے سامنے مقدمات پیش ہونے لگے تو صفائی کی طرف سے کسی دکیل کو پیروی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور بلزموں کو پھانسی اور عمر قید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور سزا ملتی تھی۔ قصور میں تنائیں آدیوں کو پھانسی اور تیرہ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ گو جہاں الزام میں محض اس جرم میں کہ پٹوار خانہ کو آگ لگا دی گئی تھی پانچ آدمیوں کو پھانسی اور دس کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ حافظ آباد میں چار کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کی سزا ملی۔ نظام آباد میں چار کو پھانسی اور آٹھ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ امرتسر میں چونتیس کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کی سزا ملی۔ اسی طرح لاہور اور

اگر تیسرا ایسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبات تک ہیں سزاؤں کی وہ بھر پار  
 ہوئی کہ اُس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ ایک شخص کو محض اس جرم  
 میں کہ اُس نے ایک پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تم ہمارے بھائی ہو۔  
 ہم تمہارے بھائی ہیں۔" آڈہارے ساتھ مل جاؤ! جس دوام کی سزا ملی۔

یہ سب کچھ مائیکل اوڈواٹر کی آنکھوں کے سامنے، اُس کی منظوری اور

رفنا مندی سے ہوتا رہا۔ چنانچہ جب وہ ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو لاہور سے رخصت

ہوا۔ تو دل ہی دل میں خوش تھا کہ اُس نے پنجاب کی شہری آبادی اور یہاں

کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ایسا سبق سکھایا ہے۔ جس کو وہ کئی پشتوں تک

فراموش نہیں کر سکیں گے۔ مارشل لا جاری کرنے سے صرف چار روز قبل اُس

نے لاہور کے فنگری ہال میں فوجی جماعتوں کے نمائندوں کے ایک جلسے میں

تقریر کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ پنجاب کی دیہاتی اور شہری

آبادی میں باہمی منافرت پھیلانے کے لئے اُس کی سب سے آخری اور سب

سے خطرناک کوشش تھی۔ اس تقریر میں اُس نے فوجی جماعتوں کے نمائندوں

کو جو تمام تردیہات سے آنے ہوئے تھے۔ یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ

ان کے اور شہری باشندوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ بلکہ دونوں

طبقوں کے مفاد ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ باہمی تضادم کے

سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس اشتعال انگیز تقریر کا کچھ حصہ یہاں درج کرنا

لہ مقام پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (سنہ ۱۹۲۰ء)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

بے محل نہ ہوگا۔

”آپ نے گزشتہ چند مہنتوں کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں کہ ایک ایسے قانون کو جو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اور جس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ بد امنی اور بغاوت کے طوفان کا سد باب کیا جائے۔ کیوں کر توڑ مروڑ کر اور مسخ شدہ صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ کذب و افترا کے ان ستھکنڈوں سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں سانی ہو۔ یہ سب کچھ ایک ایسے طبقے کے افراد کر رہے ہیں جن کی تعداد بے حد قلیل ہے۔ لیکن جو شور مچانے اور چیخ پکار کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ یہ لوگ اس قانون کو ایک خطرناک سوا بنا کر عوام کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ غیر معمولی حالات میں عوام کے جان و مال کی حفاظت کیونکر کی جاسکے گی۔“

آپ میں سے جن لوگوں نے اس قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ تحریک کس قدر بے معنی اور غلط ہے۔۔۔۔۔ تحریک چلانے والوں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے خلاف بددیہیلیائی جائے۔ اور سرکار کے نمک خواروں کو ذلیل کیا جائے۔ حکومت کے وفادار باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اس شرانگیز تحریک کا مقابلہ کریں۔ لہذا میں آپ سے کہتا ہوں کہ عوام کے پاس جائیے۔ اور انہیں حکومت کی

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

خیر سگالی سے آگاہ کر کے اس قانون کے فوائد ان کے ذہن نشین کیجئے  
 صوبے کا شورش پسند عنصر عوام کو گمراہ کرنے۔ اور شہروں کے غنڈوں  
 کو نسا پر آمادہ کرنے پر تڑپا ہوا ہے۔ آپ ان کی کوششوں کو ناکام  
 بنا کر دم لیں۔

حکومت کی ننگا ہی آپ ایسے دغا داروں پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کے  
 سیاسی خیالات چاہے کچھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ حکومت کے دست  
 و بازو بن کر موجودہ تحریک کو کچلنے میں ہماری مدد کریں۔ اس ابتلا  
 کا مقابلہ کرنے میں حکومت آپ کے اشتراک و تعاون۔ اور آپ کی  
 امداد و اعانت کی اسی طرح شکر گزار ہوگی۔ جس طرح اُس نے جنگ  
 فتح کرنے میں آپ کی خدمات کو ہمیشہ بہ نظر تحسین دیکھا ہے۔

۱۹۱۹ء کو پشاور سے لے کر  
 رولٹ ایکٹ تھا۔ جس کے خلاف بطور احتجاج ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو پشاور سے لے کر  
 اس کھاری تک ایسی مکمل اور زبردست ہڑتال ہوئی تھی کہ اس بڑے عظیم کے باشندوں  
 نے اس کی نظیر پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور دوائر کے خیال میں یہ قانون نہایت بے ضرر  
 محقول اور ملک کے امن و عافیت کے لئے ناگزیر تھا۔ اور صرف شہروں کے پسند  
 شورش پسند آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

آئے واقعات پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ قانون  
 ملک بھر کی مخالفت کے باوجود مہاراج ۱۹۱۹ء کو ہندوستان کی (بانی صفا پر)

حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، اور فوری اقدام کے محتاج ہیں۔ اب آپ مزید تامل نہ کیجئے۔ اور فوراً کمر ہمت باندھ لیجئے۔ حکومت نے تو گو مگو کی پالیسی ترک کر دی ہے۔ آپ بھی اٹھ کھڑے ہیں۔ حکومت اس ہم میں ہر لمحہ آپ کے لئے پشت پناہ ثابت ہوگی۔ حکومت نے قانون کے نفاذ کا محکمہ امدادہ کر لیا ہے۔

(القبہ صفحہ ۱۰۵)

مرکزی مجلس قانون ساز نے منظور کیا۔ اس وقت مرکزی کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی مجموعی تعداد تیس تھی۔ جن میں سے ایک سرسنگرن ناتھ بھی تھے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ اس کے مقابل انگریز ممبروں کی تعداد چونتیس تھی جب رولٹ بل پر ایوان میں رائے شماری ہوئی۔ تو سوائے سرسنگرن ناتھ کے (جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حکومت کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور تھے) بائیس کے بائیس ہندوستانی ممبروں نے بل کے خلاف ووٹ دینے۔ مسلمان ممبروں میں راجہ محمود آباد۔ میر اسد علی۔ مسٹر جناح۔ سر فضل سبحانی کریم سبحانی۔ مسٹر مظہر الحق۔ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خاں شامل تھے۔ حد یہ ہے کہ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خاں ایسے اصحاب نے بھی جو عام طور پر حکومت کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس موقع پر بے دریغ حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ مسٹر جناح نے رولٹ بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مرکزی کونسل میں کہا تھا:

..... میرا یہ فرض ہے کہ میں حکومت کو آگاہ کر دوں کہ اگر یہ قانون

منظور ہو گیا۔ تو آپ کے اس فعل سے تمام ملک میں ایک سرے سے  
(باقی صفحہ پر)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

خواہ اس کام میں خون کی ندیاں کیوں نہ بہ جائیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس تمام خون خرابے کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ بلکہ ان لوگوں پر عائد ہوگی جو قانون شکنی کی تلبتین کر رہے ہیں۔

آپ لوگوں کو میری یہ آخری نصیحت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہ الفاظ راہنمائی نہیں جائیں گے۔ اور آپ بلا تامل اس نصیحت کو جامہ عمل پہنکانے کی کوشش کریں گے تاکہ رخصت ہونے سے قبل میں پنجاب میں امن و امان کی بحالی کا نظارہ دیکھ لوں جو جوہ شورش پلا سٹبہ خطرناک ہے۔ لیکن شکر ہے کہ عوبے کے طویل دعویٰ میں ابھی نہیں کھیلی۔ اگر آپ نے بروقت مدد کی تو میں اس نیتے کو باسانی دبا سکوں گا۔

میں ہمیشہ اس بات کو خیر سے یاد رکھوں گا کہ عالمگیر جنگ فتح

لے کر دوسرے سرے تک، ایسی خطرناک شورش اور بدامنی پھیل جائے گی۔ جس کی مثال آپ نے آج تک نہیں دیکھی۔ اور یقین کیجئے کہ یہ شورش ان نرشیگو ارتملقات کو تباہ کر دے گی جو اس وقت سکرت اور عوام کے درمیان قائم ہیں۔

جب ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو انتہائی مخالفت کے علی الرغم حکومت نے یہ قانون منظور کر دیا تو سرخناح اور سرختر قوم الریق نے بطور احتجاج مجلس قانون ساز کی رکنیت سے استعفیٰ دیدیا۔

کہنے میں کیا۔ اور ملک کو اندرونی شورش سے نجات دلانے میں  
 کیا۔ میں نے جب بھی آپ لوگوں سے اساد و اعانت کی  
 درخواست کی آپ نے کبھی نخل نہیں کیا۔ مجھے پختہ امید ہے کہ  
 آئندہ چند مفتوں میں آپ جو کچھ کریں گے۔ اُس سے آپ مجھے  
 اور حکومت کو اور زیادہ ممنون احسان بنا دیں گے۔

مائل اودھان پنجاب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ لیکن اپنے پیچھے  
 جو چیزیں یادگار چھوڑ گیا۔ اُن میں ایک شہری اور دیہاتی آبادی کی باہمی رقابت  
 بھی تھی۔ جس نے ربع صدی سے زیادہ عرصے تک پنجاب کے مسلمانوں کی  
 سیاست کو نہ صرف قسم قسم کے محصوروں میں الجھائے رکھا۔ بلکہ جس نے مسلمانوں  
 کی اکثریت کو غیر مسلم اقلیت کے سامنے کبھی سر بند و گردن افراز ہونے کا موقع  
 نہ دیا۔

سرفصل حسین نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے  
 ہوئے اس موضوع پر کہا تھا۔

جواب :- "پنجاب میں اس سے قبل شہری اور دیہاتی طبقوں کے  
 درمیان نہ تو کوئی رقابت تھی۔ اور نہ عداوت۔ یہ تفریق  
 حال ہی کی پیداوار ہے۔ آپ نے اصلاحات کی سکیم میں  
 ملاحظہ فرمایا ہو گا۔ کہ جہاں تک ہمارے صوبے کا تعلق ہے

سنہ ایسی ایڈپریس آف انڈیا کی اخباری رپورٹ مورخہ ۱۹۱۹ء -

اس تفریق کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اور اسے بہت نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔

سوال :- "میں ٹھیک طرح آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادی میں پہلے کوئی تمیز تھی؟"

جواب :- "میرا مطلب یہ ہے کہ شہری اور دیہاتی باشندوں کے مفاد و نفعاً ایک دوسرے سے مخالفت یا متصادم نہیں تھے۔ دونوں طبقوں کے درمیان نہ تو کسی قسم کی مخالفت تھی۔ اور نہ ایک طبقہ دوسرے کو اپنا بدخواہ سمجھتا تھا؟"

سوال :- "بعد میں کیا ہوا؟"

جواب :- "جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ یہ تفریق گذشتہ تین چار سال کے دوران میں عمداً پیدا کی گئی ہے۔ آہستہ آہستہ بڑی کوشش سے اس خیال کو تقویت دی گئی ہے کہ دیہاتی آبادی ہی اصل میں حکومت کی توجہ اور سرپرستی کی مستحق ہے۔ اور صرف گاؤں کے لوگ عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے کے مجاز ہیں۔ اس لئے حکومت کو چاہیے کہ ان کے مفاد کو ہر لمحہ پیش نظر رکھے نظر لفظاً ہر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی اصل آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ حکومت نے اپنی اس حکمت عملی پر اس طریقے اور ایسے انداز سے عمل کیا کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری باشندوں کو نظر انداز کر کے پیچھے پھینک دیا گیا ہے۔"



سوال :- کیونکر بچے پھینک دیا گیا ہے؟ کیا آپ کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں؟

جواب :- مثال کے طور پر صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابی حلقوں کو دیکھ لیجئے۔ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہر کا کوئی باشندہ دیہاتی حلقے سے امیدوار کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

سوال :- "آپ غالباً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت کی اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن سے شہری آبادی کی اہمیت ختم ہو جائے۔ کیا یہی مطلب ہے آپ کا؟"

جواب :- "جی ہاں! آپ نے بالکل درست فرمایا۔"

سر فضل حسین نے اپنی شہادت میں جس باہمی رقابت کا ذکر کیا ہے۔ اس رقابت کے ہاسٹوں پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ تقسیم اس قدر اسخ ہو گئی تھی کہ ملازمتوں اور کونسل کی نشستوں سے نکل کر کالج اور سکول کے کمروں تک میں پہنچ گئی تھی۔ چھ برس کے بچے کو مدرسے میں داخل کرتے وقت چھپی ہوئی درخواست کے ایک خانے میں لکھنا پڑتا تھا کہ بچہ شہری ہے یا دیہاتی زراعت پیٹہ ہے یا غیر زراعت پیٹہ۔ غرض مند لوگ اس تقسیم سے فائدہ اٹھانے میں آگے آگے تھے۔ خود انگریز نے اپنی شہنشاہیت کی گہنی ہوئی دیوار کو پستہ دینے کے لئے آخر وقت تک اس تقسیم کو برقرار رکھنے کی کوشش

کی۔ لیکن اگست ۱۹۴۶ء کے خوں چکاں واقعات نے یہ حقیقت اہم نثریہ کردی کہ دشمن کی تلوار جب مسلمان پر وار کرتی ہے تو شہری اور دیہاتی میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتی۔ تاہم اس تلخ حقیقت کو پہچانتے۔ اور حقائق کی غار دار دادی ہیں سے گذر کر تحفظ قومی کی منزل تک پہنچنے میں بہیں اٹھائیں سال لگ گئے۔ اور ستم یہ ہے کہ اس طویل مدت میں ہم مسلسل اپوں اور بیگانوں کی فریب کاریوں کا شکار ہوتے رہے۔

\*

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

## اصلاحات کا نفاذ

دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگریس۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی ان تینوں نمائندہ انجمنوں نے بالاتفاق جدید اصلاحات کو رد کر کے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا۔ اس پروگرام کے نکات پنجگانہ میں یہ چیزیں شامل تھیں۔

کونسلوں کا مقاطعہ

بدیشی کپڑے کا مقاطعہ

سرمکاری خطابات کا مقاطعہ

حکومت سے زبرداد لینے والے سکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ

عدالتوں کا مقاطعہ

کانگریس کا وہ طبقہ جسے عرف عام میں اعتدال پسند (مادریٹ) کہا جاتا تھا

دسمبر ۱۹۱۹ء ہی میں، اجلاس امرتسر کے بعد، کانگریس سے قطع تعلق کر چکا تھا

اس طبقہ میں جو لوگ شامل تھے اُن میں سر تیج بہادر سپرو۔ سی۔ وائی۔ چنتامنی۔  
 سر چمن لال ستیلواڈ۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ سہری نو اس شاستری۔ سرندا  
 ناتھ بدینرجی۔ ڈاکٹر پرنچے۔ پنڈت جگت نرائن۔ ڈاکٹر جیکر۔ این بی کیلکر  
 وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر فوراً لیبرل  
 کانفرنس کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ نئی  
 اصلاحات کو قبول کر کے جہاں تک ممکن ہو سکے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور  
 آئندہ ترقی کے لئے آئینی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔

کانگریس کے اجلاس ناگپور میں ہندوستان کے تمام حصوں سے ۸۲ ۱۲۵  
 مندوبین شامل ہوئے۔ جن میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۵۰ تھی۔ ناگپور سے  
 پہلے اند ناگپور کے بعد کانگریس کے کسی اجلاس میں مسلمان مندوبین کی اتنی  
 بڑی تعداد شامل نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ خلافت نے ہندوستان کے مسلمانوں  
 میں آگ لگا رکھی تھی۔ اور علی برادران نے ہاتھ گاڑھی کے اشتراک سے  
 ترک موالات کا لائحہ عمل اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ادھر کانگریس اور خلافت نے ڈنکے پر چوٹ لگائی۔ اور  
 کونسلوں کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ اُدھر حکومت نے ہندوستان کے تمام  
 صوبوں میں انتخابات کر کے جدید اصلاحات کے تحت مجالس قانون ساز  
 مرتب کر ڈالیں۔ مسٹر ہانٹیگر اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ وہ  
 ہندوستان کے سچے سہمرد اور ہی خواہ تھے۔ انہوں نے جس جرأت سے برطانیہ  
 کے رجعت پسند عنصر کا مقابلہ کر کے کانگریس اور مسلم لیگ کی متحدہ سکیم کو

قبول کر لیا تھا۔ وہ اُن کے حسن نیت کا ثبوت تھا۔ مانٹینگول سے چاہتے تھے کہ اہل ہند کم از کم ایک مرتبہ تو نئی اصلاحات پر عمل کر کے دیکھیں۔ اگر آزمانے کے بعد یہ نظام حکومت بے کار ثابت ہوا۔ تو آئندہ اصلاحات کی جو نئی قسط تیار ہوگی اُس میں جملہ نقائص رفع کر دیئے جائیں گے۔ لیکن مانٹینگول کے اِن قابلِ تعریف عزائم کے باوجود ہندوستان کا انتہا پسند طبقہ بیک آواز اصلاحات کو مردود و مقہور قرار دے چکا تھا۔

جب مانٹینگول نے دیکھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے وہ اعتدال پسند افراد جو ترکِ موالات کے حامی نہیں تھے۔ اپنی جماعتوں سے کٹ کر کونسلوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور اصلاحات پر عمل کرنے کو آمادہ ہیں تو انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ انہوں نے فوراً دسراٹے کو لکھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے صوبائی حکومتوں کی وزارتیں انہی لوگوں کے حوالے کی جائیں۔ اس طرزِ دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک یہ کہ کانگریس کے انتہا پسند طبقہ کو دکھا دیا جائے کہ اصلاحات اس قدر حقیر و بے معنی نہیں ہیں جیسا کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے سے ملک کو بہت کچھ فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ کے رجعت پسند عناصر پر یہ امر واضح ہو جائے کہ خود کانگریس کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اصلاحات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا اور اُن سے استفادہ کرتا ہے۔ خواہاں ہے۔

مانٹینگول کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جن لوگوں کو وزارتوں کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اُن میں

سزدرانا تھہ بدینر جی (بنگال)۔ پنڈت ہگت نرائن اوسی۔ وانی چنتا منی  
 (پو۔ پی)۔ سرچمن لال ستیلواڈ اور ڈاکٹر پر بنچے (ممبئی)۔ سید فخر الدین اور مدھو  
 سون (بہار)۔ این۔ سی۔ کیلکر (سی۔ پی)۔ میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن  
 لال (پنجاب) تھے۔

میاں فضل حسین کونسل میں داخل ہونے سے پہلے پنجاب صوبائی مسلم لیگ  
 کے جنرل سکرٹری۔ اور پنجاب صوبائی کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے میثاق  
 لکھنؤ پر پنجاب کے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ کانگریس  
 اور لیگ کی متحدہ سکیم کو مقبول بنانے اور پنجاب کی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں  
 انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انہوں نے پنجاب پرائشل  
 کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا وہ  
 سرماٹیکل اوڈووائیر کے نزدیک گویا سرماٹیکل باغیاء خیالات سے لبریز تھا۔ قطع نظر  
 اس سیاسی حیثیت سے میاں صاحب انجمن حمایت اسلام۔ پنجاب یونیورسٹی اور  
 ہائی کورٹ کے مقتدر ترین ارکان میں شمار ہوتے تھے۔

لالہ ہرکشن لال کیمبرج کے فارغ التحصیل پیرسٹر تھے۔ لیکن چند سال کی  
 پریکٹس کے بعد انہوں نے زکالت ترک کر کے صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار  
 کر لیا تھا۔ اور اب اس پیشے میں وہ ہندوستان کے کامیاب ترین آدمیوں میں  
 شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے سجات انٹرنیشنل کمپنی کے نام سے ہندوستان میں  
 پہلی ہیرے کمپنی قائم کی۔ پیپلز بینک کے نام سے پنجاب میں پہلا دیسی بینک قائم  
 کیا۔ لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی قائم کر کے لاہور کو پہلی مرتبہ برقی روشنی سے منور کیا

اس کے علاوہ وہ بے شمار کارخانوں، صنعتی اداروں اور اجارہ داریوں کے اور درآمد و برآمد کرنے والی تجارتی فرموں کے مالک تھے۔ سیاسیات میں بھی اُن کا پایا بہت بلند تھا۔ ۱۹۰۹ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو ہرکشن لال مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ انگلستان جانے والے کانگریسی وفد کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ رائل لاء میں اُن کو عبس دوام کی سزائی تھی۔ اور اُن کی تمام جائداد جس کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی، ضبط کئے جانے کا حکم صادر ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہاتھ لگا مذہبی اور پنڈت موتی لال نہرو نے اُنہیں نرک ممالات پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن انجام کار انہوں نے کونسل میں داخل ہو کر وزارت قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔

اُس وقت پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میک لگن تھے۔ جو اپنی عافیت پسند طبیعت اور صلح کیشی کے اعتبار سے اپنے پیش رو سے بالکل مختلف انسان تھے میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال کو وزارت پر آمادہ کر لینے کے لئے اُنہیں مستحق مبارک باوقرار دیا گیا تھا۔ پنجاب کے یہ دونوں وزیر قابلیت مستقل مزاجی سیاسی نہم و فراست اور کردار کی مضبوطی کے لحاظ سے صوبے کا بہترین انتخاب تھا۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگریس کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ دونوں نے سراسر ذاتی کوشش اور محنت سے دنیوی عروج حاصل کیا تھا۔ اور دونوں میں یقیناً اتنا حوصلہ تھا کہ وہ آزمائش کے وقت برطانوی حکومت کے دیر بے سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ وزارت کی تشکیل ہوتے ہی پنجاب کے



بعض انگریز افسروں نے فضا کی ناسازگاری کو محسوس کر لیا۔ اور مستعفی ہو کر چلے گئے۔ ان میں دو آدمی زیادہ نمایاں تھے۔ ایک سربائیکل اوڈوائزر کے زمانے کے پنجاب کے چیف سگریٹری جے۔ پی۔ ٹامسن اور دوسرے ہائی کورٹ کے جج لیزلی جونز۔

پنجاب کی اس پہلی لیجسلیٹو کونسل میں تیس سرکاری و غیر سرکاری نافذ ارکان۔ اور اکثر انتخاب شدہ ممبر تھے۔ انتخاب شدہ ممبروں میں پینتیس مسلمان پندرہ سکھ اور اکیس ہندو تھے۔ پینتیس مسلمانوں میں سے پانچ تہری اور تیس دیہاتی حلقوں سے آئے تھے۔ یہ لوگ کسی نوع کی سیاسی جماعت، کسی قسم کے سیاسی نظام یا کسی انداز کے سیاسی پروگرام کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص صرف اپنی ذات کا ذمہ دار تھا۔ دیہاتی حلقوں سے منتخب ہونے والے ممبر اچھے خوشحال اور بڑے بڑے زمیندار تھے۔ جن کی ذہنی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی جو سربائیکل اوڈوائزر کے سٹش سال بعد حکومت میں قائم کر دیا تھا۔ یہ لوگ سیاسیات میں رجعت پسند، تلیم میں پس ماندہ قبائلی عصبیت کی فضا کے پروردہ۔ انگریزی اقتدار کے دل و جان سے حامی اور شہری آبادی کو حریف سمجھ کر اُس سے خائف اور کسی قدر متنفر بھی تھے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کونسل کی حقیقی طاقت کا سرچشمہ ان تیس دیہاتی ممبروں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر یہ تیس ممبر متفق ہو کر کسی شخص کو اپنا لیڈر منتخب کر لیتے تو انجام کار وہی پنجاب کا وزیر بننے کا مستحق قرار دیا جاتا۔

۱۹۲۱ء میں پنجاب میں قطعاً کسی قسم کی دستوری یا آئینی روایات

موجود نہیں تھیں۔ کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ وزیر کیونکر مقرر کئے جائیں گے۔ اصلاحات کے مسودے میں صرف اتنا درج تھا کہ صوبے کے وزیر مجلس قانون ساز کے نام سے جواب دیے جائیں گے۔ اور صرف اُس شخص کو وزیر مقرر کیا جائے گا جو کونسل کے انتخاب شدہ ارکان کی اکثریت کے اعتماد کا حامل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب کونسل میں کوئی معین اور واضح پارٹی موجود نہیں تھی تو پھر یہ کیونکر طے کیا جاتا کہ اکثریت کس کو اپنا سربراہ یا لیڈر بنانا چاہتی ہے۔ اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ سینتیس<sup>۳۵</sup> مسلمان اور اکیس<sup>۲۱</sup> ہندو ممبروں سے کہدیا جاتا کہ وہ علیحدہ علیحدہ جلسہ کر کے اپنا اپنا لیڈر منتخب کر لیں۔ اور گورنر ان دونوں فرقوں کے انتخاب شدہ لیڈروں کو قلمدان وزارت سونپ دے۔

یہ طریقہ سراسر جمہوری اور عین قاعدے کے مطابق ثابت ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب کا گورنر اپنے دونوں وزیر اس طرح منتخب کرتا تو کیا میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال کے وزیر بننے کا کوئی امکان تھا؟ آج سینتیس<sup>۳۵</sup> سال گزر جانے کے بعد اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ تاہم میری حتمی رائے ہے کہ لالہ ہرکشن لال تو شاید وزیر بن جاتے۔ لیکن میاں فضل حسین کے وزیر بننے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

میاں فضل حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد خاں بہادر میاں حسین بخش سرکاری ملازمت میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ فضل حسین نے ۱۸۹۶ء میں گورداسپور کے ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔

بی۔ اے میں وہ ڈاکٹر اقبال کے ہم جماعت تھے۔ اور دونوں نے سرٹامس آرنلڈ اور مولانا محمد حسین آزاد سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں فضل حسین انگلستان چلے گئے۔ جہاں وہ دو مرتبہ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر کمبرج سے بی۔ اے کر کے اور لندن سے بیسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۱ء میں واپس ہندوستان آ گئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک انھوں نے سیالکوٹ میں پریکٹس کی۔ اور ۱۹۰۵ء میں لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

اُس زمانے میں پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پبلک زندگی سے رُوشناس کرنے۔ اور ان میں قومی خدمت کا جذبہ بیدار کرنے کا صرف ایک ادارہ تھا۔ یعنی انجمن حمایتِ اسلام۔ فضل حسین نے لاہور پہنچتے ہی انجمن کے کاموں سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اور آہستہ آہستہ انجمن کی جنرل کونسل کے ممبر اور اسلامیہ کالج کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور چند سال بعد سنڈیکیٹ کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ انھیں یونیورسٹی کی بہت سی تعلیمی اور انتظامی سب کمیٹیوں میں سبھی کام کرنے کا موقع ملنے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے حلقے سے امیدوار کھڑے ہوئے۔ یونیورسٹی کا حلقہ انتخاب کلیہ ہندوؤں کے لئے وقف تھا۔ میدانِ انتخاب میں اُس وقت تین امیدوار تھے۔ لالہ ڈرگا داس۔ راجہ سرہرام سنگھ اور میاں فضل حسین۔ راجہ سرہرام سنگھ دہا راجہ کپور تھلہ کے بھائی تھے۔ اور مدت سے مسیحی مذہب

اختیار کر چکے تھے۔

ان تینوں امیدواروں میں سے قابلیت، سیاسی بیداری اور قومی خدمات کے اعتبار سے سرفضل حسین کا پلہ یقیناً بجماری تھا۔ لیکن جب وہ اپنے ہندو دوستوں سے ملنے کے خواہاں ہوئے تو سب نے محذور می کا اظہار کیا۔ اور کھلے بندوں اعتراف کیا کہ اگرچہ ذاتی طور پر وہ سرفضل حسین کو براہ اعتبار سے یونیورسٹی کا بہترین نمائندہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک ہندو امیدوار کے مقابلہ میں کسی مسلمان کو ووٹ دینا وہ قومی غداری خیال کرتے ہیں۔ یہ واقعہ سرفضل حسین کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوا۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے ایک مرتبہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

”ایک ہندوستانی مسلمان چاہے کتنا ہی قوم پرست بنے۔ اور فرقہ وارانہ جذبہ سے مبرا ہوئے گا دعوتے کرے۔ قول و فعل کے علاوہ تمام دیگر امور میں بھی وہ پکا نیشنلسٹ کیوں نہ بن جائے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اس کی زندگی کا ایک گوشہ بھی ایسا نہ دکھائے۔ جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ لیکن جب امتحان کا موقع آئے گا تو ہندو لیڈر اور ہندو عوام اس کے خلاف ووٹ دیں گے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ مسلمان کسی قدر قابل اور دلیر بھی بنتا ہے۔“

جب انتخاب کی تاریخ قریب آئی۔ تو ہندو لیڈروں نے محسوس کیا کہ اگر وہ تین امیدواروں کے درمیان ہوا تو بیانی اور انگریز اپنا ووٹ سہ سہ نام سمجھ کر دینگے اور اس صورت میں ممکن ہے کہ سرفضل حسین تمام مسلمانوں اور کچھ ہندوؤں کے ووٹ سے لڑ کر کامیاب ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے لالہ درگا: اس کو بیٹھ جانے پر مجبور کیا

تاکہ تمام ہندو عیسائی اور انگریز متحد ہو کر سرسرنام سنگھ کے حق میں ووٹ ڈال سکیں  
 مقصد صرف یہ تھا کہ سر حال اور بصورت میں فضل حسین کو ناکام بنا یا جائے لیکن  
 عین موقع پر میاں فضل حسین کو معلوم ہو گیا کہ راجہ سرسرنام سنگھ برطانوی ہند کے  
 باشندے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی قومیت بدستور ریاست کپورتھلہ کی ہے۔ جب  
 کاغذات نامزدگی داخل ہو چکے۔ تو فضل حسین نے اپنے حریف کے خلاف یہ اعتراض  
 کیا۔ جو سرسرنامی اور جائزہ اعتراض تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرسرنام سنگھ کا نام خارج ہو گیا  
 اور فضل حسین ہلہ مقابلہ منتخب ہو گئے۔

میاں فضل حسین ابتداء سے کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبر تھے اور انہوں نے لیگ  
 اور کانگریس کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور دونوں جماعتوں کو متحد العمل بنانے  
 میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ بیرون پنجاب سے مسٹر جناح۔ مسٹر مظہر الحق۔ سید حسن امام  
 اور راجہ محمود آباد ان کوششوں کے حامی تھے۔ سر محمد شفیع چونکہ اس نوع کی  
 ترقی پسند ریاست کے خلاف تھے۔ اس لئے فضل حسین اور شفیع کے درمیان  
 اختلافات کا رونا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ میاں محمد شفیع پنجاب صوبائی لیگ  
 کے صدر تھے اور سر مائیکل اوڈواٹر نے اس جھگڑے میں میاں محمد شفیع کا ساتھ دیا  
 فضل حسین نے تہ مقابلہ بن کر اور خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ پیر  
 ملک الدین اور غلام رسول خاں کو ساتھ ملا کر پنجاب میں نئی صوبائی لیگ کی  
 بنیاد رکھی۔ جب جنگ عظیم میں شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی  
 تو شفیع لیگ نے حکومتِ محلات آمیز اختیار کر لیا۔ لیکن نئی لیگ نے فضل حسین  
 کے زیرِ صدارت ایک پہلک جلسہ میں شریف حسین کی ہزیمت کی۔ مائیکل اوڈواٹر

کو فضل حسین کا یہ نعل بھی ناگوار گذرا دسمبر ۱۹۱۶ء میں جب کانگریس اور لیگ کے درمیان  
 میثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تو سر محمد شفیع بطور احتجاج لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ اور پنجاب  
 مسلم لیگ کلینہ میاں فضل حسین اور ان کے رفقاء کے قبضے میں چلی گئی۔ اب فضل حسین  
 پنجاب کانگریس کے صدر اور پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری بنے اور اس حیثیت  
 سے وہ اپنے صوبے کی سیاسیات میں سب سے اہم اور بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ سر ہارنڈیکو  
 وزیر سند کے سامنے جب کانگریس اور مسلم لیگ کا متحدہ وفد جدید اصلاحات کی تجاویز کا  
 مسودہ لے کر پیش ہوا تو فضل حسین اس وفد کے رکن تھے۔ پیشہ وکالت میں سبھی ان کو چوٹی  
 کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اور جب سر محمد شفیع وائسرائے کی ایکڑیکو کو نسل کے رکن مقرر  
 ہو گئے تو نیشنل حسین کو لاہور ہائی کورٹ بار کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ جنگِ عظیم کے  
 اختتام پر انہوں نے ترکوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ اور تحریکِ خلافت کے ابتدائی مراحل  
 میں انہوں نے بعض بڑے بڑے پبلک جلسوں کی صدارت سنبھالی کی۔ اس کے علاوہ وہ  
 رولٹ بل کی مذمت کرنے میں بھی پیش پیش تھے۔

سر مائیکل اوڈوائر کی مذموم کوششوں سے پنجاب کی آبادی میں شہری اور دیہاتی  
 کی جو تقسیم پیدا ہو گئی تھی۔ میاں فضل حسین اس کے سخت خلاف تھے۔ اوڈوائر کی  
 موجودگی ہی میں جب چودہری لال چند نے جوڑتنگ کے باؤں کے ایک مندر  
 لیڈر بنے، پنجاب کونسل میں یہ قرارداد پیش کی کہ جدید اصلاحات میں شہری اور دیہاتی  
 آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے قائم کئے جائیں اور شہری اور دیہاتی آبادی کے  
 تناسب ہی سے کونسل میں نشستوں کی تعداد مقرر ہونی چاہیے۔ تو میاں فضل حسین  
 نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

آپ اس وقت پنجاب کے تمام انتخابی حلقوں کو شہری اور دیہاتی کے نام سے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کا یہ نظریہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ان دونوں حصوں کے مفاد ایک دوسرے کے مخالف یا متضاد ہیں۔ جب آپ شہری اور دیہاتی کے نام سے پوری آبادی کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں تو معاف فرمائیے گا، آپ اس تعلیم یافتہ طبقے کو جو اب تک صوبے میں فضیلت و برتری کا مالک خیال کیا جاتا تھا ایک ایسی ادنیٰ بلکہ غلامانہ حیثیت قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس کا وہ عادی نہیں۔ اور جس کا وہ اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے مستحق بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔۔۔۔۔ میرے نزدیک یہ بات ہرے ہی سے مذموم و ناروا ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادیوں میں تفرقہ کی دیوار اس طرح کھڑی کر دی جائے کہ بالآخر گاؤں کے لوگ شہری باستانوں پر غلبہ پا جائیں۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جوں جوں وقت گزرے گا آپ دیکھ لیں گے کہ شہری اور دیہاتی حلقوں کا یہ باہمی امتیاز کتنا چلا جائے گا۔

چودھری لال چند نے یہ تجویز سبھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی۔ تو دیہات کے انتخابی حلقوں سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانون اشغال اراضی کی رو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ فضل حسین نے اس قرار داد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا :-

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

پنجاب کی دیہاتی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ ہے۔ جس میں سے ایک کروڑ سے کچھ زیادہ زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ وہ لوگ جو بدقسمتی سے زراعت پیشگی کے نہرے سرٹی فیکٹ سے محروم ہیں۔ اب دیہاتی ہونے کے باوجود بھی دیہاتی حلقے سے نہیں کھڑے ہو سکیں گے۔ یہ کس قدر لالیعی اور ظالمانہ تجویز ہے۔ مانا کہ زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مان لیا کہ غیر زراعت پیشہ دیہاتی لوگ اراضی کے مالک نہیں ہیں۔ یہ سبھی مان لیا کہ انہوں نے فوجی بھرتی میں حصہ نہیں لیا۔ اور یہ سبھی مان لیا کہ وہ کاشتکاری کا پیشہ نہیں رکھتے۔ لیکن یہ تمام امور تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ بات کیوں مکر قبول کی جا سکتی ہے کہ اب یہ بدقسمت لوگ دیہاتی ہوتے ہوئے بھی محض اس بنا پر دیہات کی نمائندگی نہیں کر سکتے کہ انہیں زراعت پیشگی کا زریں پروانہ حاصل نہیں ہوا۔ اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زراعت پیشہ اقوام کے لوگ اپنے دیہاتی بھائیوں سے بھی خائف ہیں کہ مبادا میدان انتخاب میں ان کے ہاتھوں مات کھا جائیں۔ میری رائے میں یہ تجویز نہ تو جبرستی اور پر دیہات کے باشندوں کو نائدہ پہنچائے گی اور نہ زراعت پیشہ اقوام کے لئے مفید ہو گی۔“ لے

آگے چل کر میاں فضل حسین نے کہا :-

لے کارڈ آئی پنجاب یجلٹو کورنل نومبر ۱۹۱۸ء

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



” کونسل کی رکنیت کا اہل بننے کے لئے صرف ایک معیار ہے۔ اور وہ ہے علمی قابلیت اور ذہنی برتری کا معیار۔ جب ایک شخص کونسل کا ممبر منتخب ہوتا ہے۔ تو وہ اس قابل ہونا چاہیے کہ ایوان میں آکر باواز بلند کہہ سکے کہ میں دماغی صلاحیت کے اعتبار سے بہترین شخص ہوں میں نظم و نسق کو خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ اس لئے آپ قواعد و ضوابط اس ڈومینک سے وضع کیجئے کہ مجھے کونسل میں داخل ہو کہ اپنے ملک کے نظام حکومت میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔“

” اگر آپ دیہاتی ووٹروں کو متعدد امیدواروں میں سے بہترین آدمی منتخب کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو ظاہر ہے کونسل اعلیٰ درجے کے ممبروں سے محروم رہ جائے گی۔ ہم بطور دلیل مان لیتے ہیں کہ شہری اور دیہاتی حلقے الگ الگ ہیں لیکن اس تقسیم کے باوجود کوشش کرنا چاہیے کہ ان حلقوں کو ایسی آزادی اور سہولت میسر آئے کہ وہ اپنے اپنے ماں سے بہترین اور لائق ترین امیدوار منتخب کر سکیں“

خاندان، وطنیت، طولِ قیام، روزگار، تعلیم و تربیت، پود و پاش، عادات و اطوار، معیشت و معاشرت، تعلقات و مراسم غرضکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو سے فضل حسین دیہاتی نہیں بلکہ شہری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اور لالہ ہرکشن لالہ وزیر مقرر ہوئے۔ تو دیہاتیوں کو سخت رنج ہوا کہ پنجاب کے دونوں وزیر

۱۹۲۰ء مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

شہری طبقے سے کیوں منتخب کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جاٹ برادری کے ایک اخبار جاٹ گزٹ نے اپنی ۱۲ جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:

”دولوں وزیر شہری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں مخصوص انتخابی حلقوں سے منتخب ہو کر آئے ہیں۔ اس کے برعکس نئی کونسل میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو دیہاتی حلقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک ان ذبیروں کو دیہاتی ممبروں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ یہ لوگ سرکاری اور نافردار کان کی مجموعی تعداد سے بھی اپنی وزارت کی گڈیاں سلامت نہیں رکھ سکیں گے۔ شہر کے دو آدمیوں کو وزارت کے منصب پر فائز کر دینا پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں کی کھلم کھلا توہین کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔“

گورنر نے میاں فضل حسین کو اس لئے وزیر منتخب نہیں کیا تھا کہ پنجاب کونسل کے انتخاب شدہ مسلمان ممبروں کی اکثریت ان کی پشت پر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کو تو اپنا لیڈر منتخب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا تھا۔ منصب وزارت کے لئے میاں صاحب کا سب سے بڑا دشمن یا استحقاق ان کی بلند بالا سیاسی حیثیت تھی۔ وہ پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری۔ صوبائی کانگریس کے صدر۔ ہائی کورٹ بار کے لیڈر۔ یونیورسٹی کے سب سے ذی اثر رکن۔ انجمن حمایت اسلام کی کابینہ کمیٹی کے سکریٹری اور پنجاب کے مسلمانوں کے سب سے باوقار اور ترقی پسند رہنما تھے۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر میاں صاحب کو ایک ایسا جامع حیثیات

شخص بنا دیا تھا کہ گورنر کو، ایسے حالات میں جبکہ ترک موالات کی تحریک نے آگ لگا رکھی تھی، عوام کے اشتعال پذیر سیاسی جذبات کو سٹھنڈا کرنے کے لئے فضل حسین سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ لاہور کے سب سے بڑے کانگریسی اخبار ٹریبون نے اپنی ۲ جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:

”سمر ایڈورڈ میککن اس بات پر مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے جدید اصلاحات کے تحت بہترین وزیر منتخب کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔“

اپنی دونوں مسٹرانٹیکو وزیر ہند کے مشورے سے کرنل دیچوڈ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ کرنل دیچوڈ پارلیمنٹ کی لیبر پارٹی کے مشہور اور ذمہ دار رکن تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کے اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ وہ کانگریس کے ہند اور مسلمان لیڈروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ ترک موالات کی تحریک اختیار کرنے کی بجائے نئی اصلاحات پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے دہاتا گاندھی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے لیڈر تک ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانے کی جدوجہد کی۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں وہ ناگپور جا کر کانگریس کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ چونکہ کرنل دیچوڈ پارلیمنٹ میں ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہتے تھے اور اہل ہند اُن کو اپنا ہم در و خیر خواہ سمجھتے تھے۔ اس لئے کانگریس کی مجلس استقبالیہ میں جب ترک موالات کی قرارداد پیش ہوئی۔ تو دہاتا گاندھی کے ایسے کرنل دیچوڈ کو بھی اس مسئلہ پر اظہار خیال کی دعوت

دی گئی۔ ویجوڈ نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"آپ آزادی ہند کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور نہ ہی آپ نے خلافتِ آئین تحریک شروع کی۔ پولیس خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرنا شروع کر دے گی۔ آپ عدالتوں کا مقاطعہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہر وکیل کو پریکٹس کا لائسنس لینے وقت ملکِ معظم کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ اندریں حالات بتائیے کہ دکلا رکھیں کہ خلافتِ آئین تحریک میں شرکت کر سکیں گے۔ تو کب موالات اختیار کر کے آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ اس قسم کے تخریبی کام کی بجائے قومی تعمیر کا پروگرام وضع کریں"

کرنل ویجوڈ کی تقریر کا لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ جب انہوں نے دورانِ تقریر میں کہا کہ "آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔" تو حاضرین میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیے ہندوستان سے باہر ہمارا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔"

ویجوڈ نے پنجاب آکر ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے سبھی ملاقات کی۔ ڈاکٹر کچلو جلیاں والے باغ کے ہیرو۔ اور مارشل لارک دور کی ممتاز ترین شخصیت تھے اس لئے کرنل ویجوڈ کا خیال تھا کہ اگر وہ انہیں کسی طرح کونسل کی ممبری پر راضی کر سکیں تو پنجاب کی وزارت کے لئے کچلو سے بہتر آدمی مانا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے سر ایڈورڈ میکاکن کے مشورے سے ڈاکٹر کچلو کو کونسل کی ممبری پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس دھم میں

پاؤں رکھنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کچلو امرتسر کے رہنے والے تھے۔ اور غیر زراعت  
 پیشہ طبقہ کے آدمی تھے۔ اُسھیں زراعت پیشہ دیہاتی ممبروں کی رہنمائی کا فخر  
 کیونکر حاصل ہو سکتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سن ۱۹۲۰ء میں وزیر سندر۔ والسراے  
 اور گورنروں کی یہ منفقہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُن لوگوں کو صوبائی  
 وزارتیں دی جائیں جو کانگریسی تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ تاکہ ترک موالات  
 کے پُرشور طوفان میں جدید اصلاحات کی نادر ڈالواں ڈول نہ سونے پائے۔  
 پنجاب کونسل کے سینیٹریں دیہاتی مسلمان ممبروں میں صرف دو آدمی ایسے  
 تھے جو تعلیمی قابلیت اور قانونی صلاحیت کے اعتبار سے میان فضل حسین کے حریف  
 بن سکتے تھے۔ ایک میاں شامسوز بی۔ اے (کینیڈا) پیرسٹریٹ لاء۔ اور دوسرے  
 ملک فیروز خان لون بی۔ اے (آکسن) پیرسٹریٹ لاء۔ میاں شامسوز سن دو  
 سال میں فضل حسین کے برابر تھے۔ وہ باغبانپورہ کے مشہور میاں خاندان کے رکن۔  
 ضلع لاسپور کے دیہاتی حلقے کے نمائندہ اور سر محمد شفیق کے داماد تھے۔ لیکن اُن میں  
 سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اُن کے نامہ اعمال میں سیاسیات کا خانہ بالکل خالی  
 تھا۔ ملک فیروز خان لون کا اتروڑ سونع میاں شامسوز سے بھی زیادہ تھا۔ وہ  
 شاہ پور کے متمول ترین زمیندار گھرانے کے لورنظر تھے۔ اور اگر کبھی رائے شماری  
 کی نوبت آجاتی۔ تو مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبر جن کی جمہوری تعداد تیس تھی  
 فضل حسین اور شامسوز دونوں کو چھوڑ کر فیروز خان لون کے لئے ہاتھ کھڑے کرتے  
 لیکن فیروز خان لون کا کمزور ترین پہلو بھی یہی تھا کہ سیاسی دنیا میں کوئی شخص  
 اُن کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ یوں بھی وہ بالکل لوزر تھے بکنڈر جیا خان

جو چند سال بعد میاں فضل حسین کے سب سے بڑے اور سب سے کامیاب حریف ثابت ہونے والے تھے۔ ۱۹۲۱ء کے انتخاب میں ضلیح انک سے منتخب ہو کر آئے تو تھے۔ لیکن اُن کے خلاف انتخابی عذر داری منظور ہو گئی۔ اور وہ کونسل کی رکنیت سے برطرف کر دیئے گئے۔

پنجاب کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کو اُس وقت یہ راز معلوم نہیں تھا کہ وزارت سازی کی اصل طاقت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُن میں سے اکثر انگریزی نہیں جانتے تھے۔ سیاسیات میں اُن کا مبلغِ علم بمنزلہ صفر تھا۔ سرکار کا ہوا اُن کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ صوبے کا گورنر تو بہت بڑی چیز ہے۔ ضلیح کا ڈپٹی کمشنر اُن کا کعبہ مقصود و قبلہ عاجات تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لاٹ صاحب بہادر نے اظہارِ خوشنودی فرما کر میاں فضل حسین کے سر پر تاجِ وزارت رکھ دیا ہے۔ تو انہوں نے سبھی پوری عقیدت سے اس آستانِ عالیہ پر اپنی جبینِ نیاز جھکا دی۔

میاں فضل حسین کو اپنی اس بنیادی کمزوری کا احساس تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے شہری مسلمان تھے۔ درحالیکہ کونسل مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبروں سے ہمزی ہوئی تھی۔ جن کے اور فضل حسین کے درمیان سوائے "اسلام" کے اور کوئی چیز وجہ اشتراک نہ بن سکتی تھی۔ سالہا سال کے معاندانہ پراپاگنڈے نے شہری اور دیہاتی کی تیز اس قدر اسخ کر دی تھی کہ دیہاتی ممبر اپنی تقدیر کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے پر کبھی تیار ہو سکتے تھے۔ جو مشرقی پنجاب کے ایک شہر کا رہنے والا۔ اور پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر ہو۔ پھر یہی کافی نہیں۔ میاں فضل حسین ہمیشہ شہری اور

دیہاتی آبادی کی تفریق کو برا سمجھتے آئے تھے۔ انہوں نے سابقہ پنجاب کونسل کے ایوان میں اور سنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بار بار اس تفریق کی مذمت کی تھی۔ اور یوں بالواسطہ تعلیم یافتہ شہری آبادی کے تفوق کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے دیہاتی ممبروں کو یہ سب حال معلوم تھا۔ لیکن گورنر نے جب فضل حسین کو وزارت کی مسند پر بٹھا دیا تو وفاداری کی قدیم روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام زمیندار ممبروں نے اسی میں عافیت دیکھی کہ اب اپنے نئے آقا کے سامنے گردنیں خم کر دی جائیں۔

## پہلی وزارت کا دور

میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال پرانے رفیقِ کار تھے۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگریسی ماحول میں ہوئی تھی۔ ادراپ دونوں کانگریس سے کٹ کر کونسل میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے دونوں کو بل جمل کر کام کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لالہ ہرکشن لال بڑے دل گروے کے، زبردست ادراپ حوصلہ انسان تھے وزارت کا پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ اُن کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اُن کے گھر کا خرچ دس ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھا۔ میاں فضل حسین بڑے ذریعہ، معاملہ فہم، دور اندیش ادراپ تدریس آرمی تھے۔ اُنہوں نے بہت جلد اُن مشکلات پر قابو پا لیا۔ جو نئی اصلاحات کی دو ٹوٹی حکومت میں ذرا ر کے راستے میں حاصل ہو سکتی تھیں تاہم اُن پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہو گئی تھی کہ آئندہ پنجاب کی حکومت اس صوبے کے دیہاتی ممبروں کی خوشنودی اور سوا بید کے بغیر نہ چل سکے گی۔

فضل حسین کے پاس تجلیات اور ہرکشن لال کے پاس زراعت کا قلمدان وزارت تھا۔ کانگریس اگرچہ ترکِ موالات کا پردہ گرام اختیار کر کے پیشانی لکھنوا



سے عملاً دستکش ہو چکی تھی۔ لیکن ایک پرانے کانگریسی اور مسلم لیگی کی حیثیت سے  
 میاں فضل حسین اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس میثاق کی تمام شقوں پر حتیٰ لاکھوں  
 عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس جانب قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ  
 لاسپور کے میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کے لئے چالیس فی صد  
 نشستیں مخصوص کر دیں۔ میونسپل کمیٹیوں میں جہاں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے  
 تناسب سے کم نشستیں حاصل تھیں۔ ان کی نمائندگی تناسب آبادی کے  
 مطابق بڑھادی۔ اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا چالیس فی صد  
 حصہ مقرر کر دیا۔

سندھوں کو یہ تینوں فیصلے سخت ناگوار لگدے۔ سندھ کے نزدیک قوم پرستی  
 کا مفہوم یہ تھا کہ اُس کی ہر قسم کی اجارہ داری میں، خواہ وہ سراسر بے انصافی  
 پر مبنی ہو، حلال نہیں پڑنا چاہیے۔ میاں صاحب کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا  
 سندھ اخباروں، سندھ انجمنوں اور سندھوں کی سخی محفلوں میں فضل حسین کو  
 فرقہ پرستی کا بانی، سندھ مسلم اتحاد کا دشمن، سندھوں کا قاتل اور سندھوستان  
 کا بدخواہ قرار دیا جانے لگا۔ میاں فضل حسین نے بار بار کانگریسی لیڈروں کو  
 پکارا کہ وہ چونکہ میثاق لکھنؤ کی ترتیب میں باقاعدہ ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتے  
 تھے۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ اس جھگڑے میں حکم بن کر فیصلہ کریں کہ  
 آیا پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ جو سٹھوڑا سا انصاف کیا جا رہا ہے وہ میثاق  
 کے مطابق ہے یا مخالف۔ میاں صاحب نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر اس  
 بارے میں کانگریس کا فیصلہ ان کے خلاف صادر ہوا تو وہ وزارت سے مستعفی

ہو جائیں گے۔ لیکن کانگریسی لیڈروں نے جواب دیا کہ کیا میثاق لکھنؤ اور کیا کونسل کی ممبری۔ وہ دونوں پر لعنت بھیج چکے ہیں۔ اسے ترک ممالک کا دورہ ہے۔ اس لئے اُنہیں اپنی اصلاحات سے کوئی دلچسپی نہیں۔

جہاں تک میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کے داخلے کا سوال تھا۔ یہ جھگڑا میاں فضل حسین کی وزارت سے بہت پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ ۱۹۱۶ء تک تو یہ کیفیت تھی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ سال بہ سال جتنے مسلمان لڑکے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر کے داخلے کے لئے جاتے۔ کم و بیش سبھی کو جگہ مل جاتی۔ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار مسلمان طلبہ کو مایوسی ہوئی۔ اور بہت سے امیدوار جگہ حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ اسی سال میاں فضل حسین نے پنجاب کونسل میں یہ سوال اٹھایا کہ مسلمان طلبہ کی اچھی خاصی تعداد کو میڈیکل کالج میں کیوں داخل نہیں کیا گیا اگلے سال یعنی ۱۹۱۷ء میں خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی اور سید محسن شاہ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے ایک وفد کی صورت میں سپتالوں کے انسپکٹرز جنرل کے پاس جا کر یہ شکایت کی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں بہت سی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان مشکلات کا ازالہ کیا جائے۔ ۱۹۱۹ء میں ایک اور وفد نے لفٹنٹ گورنر کی نشست میں حاضر ہو کر یہ مسئلہ اٹھایا اور میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کی ایک مہینہ تعداد کے لئے نشستیں محفوظ کر دینے کا مطالبہ کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے وفد کے دلائل سے اتفاق کر کے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اس مطالبہ پر غور کر کے نشستوں

کی ایک خاص تعداد معین کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہی حال گورنمنٹ کالج کالج کا تھا۔ وہاں سبھی مسلمان طلبہ کی تعداد گویا آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ سن ۱۹۱۴ء میں پنجاب کے مقتدر مسلمانوں نے جن میں کم از کم بیس مختلف انجنیوں کے نمائندے شامل تھے، حکومت سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں مسلمان طلبہ کو سہولتیں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسئلہ حکومت کے سامنے تھا۔ اور مسلمان تقریباً ہر سال اس مطالبے کی تجدید کرتے تھے۔

باقی رہا سرکاری ملازمتوں کے تناسب کا سوال۔ اس ضمن میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا خیال کرتے ہوئے سن ۱۹۱۴ء میں حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا تھا کہ ماتحت ملازمتوں میں کم از کم تیس فیصد اسامیاں مسلمانوں کو ملنی چاہئیں۔ لیکن بد قسمتی سے اس فیصلے پر کبھی عمل نہ ہو سکا۔ اور سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ پوس کن حد تک قلیل رہی۔ میاں فضل حسین نے ملازمتوں میں چالیس فیصد مسلمانوں۔ چالیس فیصد سندوؤں اور بیس فیصد سکھوں کا حصہ مقرر کر دیا۔ لیکن اس فیصلے پر عمل درآمد کرتے وقت یہ تالید کر دی گئی تھی کہ یہ تناسب صرف نئے آدمیوں کا تقرر کرتے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔ پرانی اسامیاں جہاں مسلمانوں کی تعداد بے حد مختصر تھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں فضل حسین ایک زوردار وزیر ثابت ہوئے اُن میں یقیناً اتنی جرات تھی کہ وہ بوقت ضرورت آئی۔ سی۔ ایس کے انگریز

انہوں کو بیک جنبشِ قلم اپنا فیصلہ منوانے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ان دنوں تمام محکموں کے سیکریٹری انگریز تھے۔ جو بالائی کورنر کے پاس جا کر وزیروں کے خیالات کا جان بھرہتے تھے۔ میاں فضل حسین کو اس صورتِ حال کا علم تھا۔ لیکن انہوں نے ایک باوقار انسان کی طرح ان باتوں سے چشم پوشی ہی نہیں بے اعتنائی برتی تھی جہاں ان کی طے شدہ پالیسی یا جاہی کردہ احکام کی تعمیل کا سوال آتا تھا وہ کسی قسم کی چوٹ و چٹا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے فرعون صفت انگریزوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ لیکن انہوں نے ہر فرعون کی اکڑی ہوئی گردن کو جھک جلتے پر مجبور کر دیا۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سڈو لینڈ نے چالیس فیصد مسلمان طلبہ کو لینے ہاں داخل کرنے میں تامل کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ وہ اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ فضل حسین نے فوراً انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ گوجرانوالہ میں میاں فضل حسین نے ایک ورہاء منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور قسمتِ لاہور کے کمشنر ایف۔ ڈیویو کینیڈے کو حکم دیا کہ وہ خود دربار میں حاضر ہوں کینیڈے نے یہ جھٹکاوارانہ کی کہ ایک ہندوستانی وزیر تو دربارہ کی مندپہ رونق افروز ہو۔ امداد خود ایک ہمدلی ماتحت کی طرح جلسے کا انتظام کرنے پر نامور کئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ فضل حسین سے اس گستاخی اندازِ فرماؤ کی یہ سزا دی کہ کینیڈے سے فوراً استعفیٰ طلب کیا اور انہیں ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

یہ اس دور کی باتیں ہیں جب انگریز کا اقتدار ابراہیم کی طرح سنہاستان

پر چھپا یا ہوا تھا۔ اور جدید اصلاحات نے ہندوستانی وزراء کو بہت ہی محدود و مختصر اختیارات عطا کئے تھے۔ اُس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ خود ان وزیروں کو اپنے یہ محدود اختیارات استعمال کرنے کا نہ سلیقہ آتا تھا اور نہ حوصلہ تھا۔ اگست ۱۹۲۱ء میں فضل حسین کی جگہ کوئی دیہاتی مسلمان وزیر بن جاتا تو صوبے کی روایات بیکسر بگڑ جاتیں۔ غم و حوصلہ کی یہ بے باکی، اور قول و عمل کی یہ بے خوفی، جس کا فضل حسین نے بار بار منظر ہرہ کیا، کبھی ظہور میں نہ آتی، ولیٹر کی درائی ان خوبیوں کی بجائے تملق و خوشامد اور آستیاں پوسی و ناصیہ فرسانی کا سکہ چل سکتا۔ اور صوبے کا وزیر خود معمولی معمولی باتوں کے لئے گورنر کی بارگاہ میں سر بسجود ہونے سے دریغ نہ کرتا۔

اصلاحات کے تباہی کے بعد پہلے چار سال تک پنجاب کونسل کا صدر گورنر کا نام زد کیا ہوا ایک آئی۔ سی۔ ایس انگریز افسر تھا۔ جب یہ چار سال کی میعاد ختم ہو گئی تو کونسل کو آئینی طور پر یہ حق حاصل تھا کہ وہ خود اپنا غیر سرکاری صدر منتخب کرے۔ لیکن گورنر نے سر توڑ کوشش کی کہ وہی انگریز افسر (سر ہرٹ کین) جس کو پہلے نام زد کیا گیا تھا، اب منتخب کر لیا جائے۔ فضل حسین نے گورنر کی اس کوشش کی کھلے بندوں مخالفت کی اور کونسل کے تمام ممبروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ خواہ کچھ ہو کسی پنجابی ہی کو منصبِ صدارت کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ کونسل کے اکثر ارکان گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر کین کو منتخب کر لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن جب فضل حسین نے میدان میں اتر کر گورنر کے ارادوں کی مزاحمت کی۔ تو دیہاتی ممبروں کا حوصلہ بھی بلند ہو گیا اور آخر انہوں نے

سر عبدالقادر کو صدر منتخب کر لیا۔

یہ تمام امور اس بات کی شہادت دینے کے لئے کافی ہیں کہ میاں فضل حسین نے اپنی اس سیاسی تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا جو انہیں کانگریس اور مسلم لیگ ایسی جماعتوں میں کام کرنے سے حاصل ہو چکی تھی۔ فضل حسین کا یہ کمال تھا کہ ایک طرف انہوں نے اپنی رائے کی پختگی اور ارادے کی مضبوطی سے گورنر کو مرعوب کر لیا اور دوسری طرف کونسل کے دیہاتی ممبروں کو عملاً یقین دلا دیا کہ وہ جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ گورنر ان کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے دیہاتی زمیندار جنہیں انگریز کی عظمت و جبروت کے سامنے کبھی دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی فضل حسین کے ان کارناموں سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ کچھ میاں صاحب کے اثر و رسوخ سے مرعوب ہو کر انہیں کچھ اس خیال سے کہ ایک مسلمان نے پوری قوم کا نام روشن کر دیا ہے۔ تمام دیہاتی مسلمان ممبروں و جان سے فضل حسین کے حامی بن گئے۔

جوں جوں ہندو اہلکارات اور ہندو لیڈر فضل حسین کے خلاف شروع ہوئے گئے وہ مسلمانوں میں روز بروز مقبول ہوتے جا رہے تھے۔ میاں صاحب کی پالیسی کی حمایت کے لئے انہوں نے مسلمانوں کا پہلا انگریزی روزنامہ مسلم آؤٹ لٹ نکالنا شروع کیا۔ اسلامی انجمنوں نے قراردادیں منظور کر کے برٹل ان کی تائید کی۔ مسلمانوں کے متعدد وفد نے گورنر کے پاس جا جا کر ان کی پالیسی کی اعانت کی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں فضل حسین کی تدرستی اور دنازی عمر کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اپنی قوم میں فضل حسین کی

قبولیت و محبوبیت کا یہ عالم تھا جب ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو راجہ نرندر ناتھ نے پنجاب کونسل میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ یہ قرارداد پانچ شکوں پر مشتمل تھی :-

- ۱۔ اولی - پنجاب ایکیٹ میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا۔
- ۲۔ دوم - سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی داخل کر دی گئی۔
- ۳۔ سوم - میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں طلباء کا داخلہ فرقہ وارانہ اصول پر مقرر کیا گیا ہے۔
- ۴۔ چہارم - بعض میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول رائج کر دیا گیا ہے۔

۵۔ پنجم - گورنمنٹ ایکیٹ منظور کر کے سندھوں اور سکھوں کے درمیان تفریق پیدا کی گئی ہے۔

کے۔ ایل۔ گابا پیر سٹراٹھلار نے۔ اپنے والد لالہ ہرکشن لال کی سوانحی (REBEL MINISTER) میں اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے ”مجھے وہ دن خوب یاد ہے۔ جب پنجاب کونسل میں عدم اعتماد کی اس قرارداد پر بحث جاری تھی۔ تو ترازو کے دونوں پلڑے کس طرح متواری کھڑے تھے۔ لوگوں میں اس سوال پر بڑی سرگرمی سے لے لے ہو رہی تھی کہ اگر میاں فضل حسین کو شکست ہو گئی تو کیا ان کی صحت اس قابل ہے کہ وہ دوبارہ وکالت جیسا غیر یقینی اور صبر آزما پیشہ اختیار کر کے روزی کما سکیں گے۔ جب تمام دلائل

بے کار ثابت ہوئے تو میاں صاحب نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک اور طریقہ اختیار کیا جو بعد میں بہت سی مشکلات کا شانی علاج ثابت ہوا۔ انہوں نے تباہ کن خیالات کی غرض سے کونسل کے دیہاتی ممبروں کو اپنے مکان پر مدعو کیا اور یہیں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں پر آئٹس کریم نہایت اچھے اثرات پیدا کرتی ہے یہ انکشاف اس ایک تجربہ نسخہ سمجھ کر اختیار کر لیا گیا ہے، میاں صاحب نے اپنی تمام زندگی میں اس سے بہتر کام پر کبھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز جب قرارداد پر دائے شہاری ہوئی تو اس کے نتائج نمایاں اور خوشگوار تھے۔

کے ہیں۔ گلابا کے اس الفاظ کو ہم سخن طرازی سمجھ کر محظوظ ہیں یا انہیں محض پیرایہ بیان کی ایک ندرت تصور کر کے سلف اٹھائیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ عدم اعتماد کی یہ قرارداد میاں فضل حسین کی سیاسی زندگی میں ایک ایسے انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعد ان کے غور و فکر نے نئی راہیں اور ان کی حکمت عملی نئے زاویے تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ اس قرارداد کی آزمائش میں میاں فضل حسین کو تیسرا کامیابی حاصل ہوئی۔ اور ان کے حریف ناکام و نامراد رہے۔ لیکن اس معرکے میں انہوں نے حالات کی تبدیلی کو جس انداز سے دیکھا تھا۔ اس نے یہ نکتہ ان کو سمجھا دیا تھا کہ اگر مسترد وزارت کو محفوظ رکھنا منظور ہے تو اپنی پاسی میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

راہ نرندنا تھنے قرارداد پیش کرتے وقت بڑی حویل تقریر کی۔ جو



سلسل کئی گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے میاں فضل حسین کو فرقہ پرستی کا بانی، ہندو مسلم اتحاد کا دشمن اور شہداءوں کا بدخواہ قرار دیا۔ آخر میں انہوں نے میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

”اورنگ زیب مت بنو۔ اکبر بننے کی کوشش کرو“

راجہ صاحب کی تقریر کے جواب میں مسلمان نمبروں میں سے میاں احمد یار خان دولتانہ۔ ملک فیروز خان نون اور پیر اکبر علی نے تقریریں کیں۔ سر دست احمد یار خان دولتانہ اور فیروز خان نون کی تقریروں کے مختصر اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے آگے چل کر یونینسٹ پارٹی کی تعمیر و تشکیل میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ ایک تو یونینسٹ پارٹی کے چیف سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور دوسرے مسلسل نو سال تک یونینسٹ پارٹی کے نمائندہ وزیر رہے۔

احمد یار خان دولتانہ نے اپنی پڑجوش تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا:

.....راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ

”ذیہر تجلیات اورنگ زیب کی پالیسی اختیار کر رہے ہیں۔ میں اچھ صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جب کہ بہت سے سیواچی ہمارے تہ مقابل بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں اکبر پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں اورنگ زیب ہی پیدا کرنے چاہئیں۔ مجھے یہ کہنے میں مسرت اور فخر ہے کہ خواہ کتنے ہی سیواچی ہمارے سامنے آجائیں۔ میاں فضل حسین تنہا ان کا مقابلہ کرنے کو کافی ہیں۔ میں انتہائی رنج و اندوہ سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شہداءوں

کا تعصب اور اُن کی تنگدلی اب ایک ایسے نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ جس سے مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبرتی ہو گیا ہے۔ کیا اس ایوان کے مسلمان ٹیپ اور کیا اس صوبے کے مسلمان باشندے سبھی ہندوؤں کے تعصب سے نالاں ہیں۔ راجہ صاحب نے یہ اخذ فرما دیا کہ پیش کر کے ہندو مسلم اتحاد کے اُس ناتوان و کمزور قلعہ کو، جو مسلمانوں کے خون اور ہندوؤں کی محنت سے تعمیر ہوا تھا، پاش پاش کر دیا۔ میں خوش ہوں کہ یہ قلعہ گر گیا ہے۔ اور اچھا ہوا کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے گرا ہے۔“

ملک فیروز خاں لٹون نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا:-  
 ”..... اگر ہماری قوم کے ساتھ پہلے سے کسی نے انصاف کیا ہوتا۔ نو میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نشستیں دینے کے لئے موجود سرکلر جاری کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ چونکہ ہمارے ساتھ منصفانہ سلوک کبھی نہیں ہوا اس لئے اس قسم کے سرکلر کا اجراء لازمی اور ضروری تھا۔ جناب والا! میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان کیونکر ظلم اور بے انصافی کا شکار ہو رہے ہیں۔ حالیہ سرکلر کی رُو سے میڈیکل کالج میں چالیس فیصد طلبہ لازماً داخل کئے جائیں۔ لیکن ہوا کیا ہے؟ امسال ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں ممتحنوں کی اکثریت اسی وسیع القلب اور فراخ دل قوم کے فرزندوں پر

مشکل تھی جس کے ایک لونیال ہائے راجہ نرنند ناتھ صاحب  
ہیں۔ چنانچہ مسلمان طلبہ کو اس کثرت سے فیل کیا گیا ہے کہ ان  
غریبوں کی چالیس فیصد تعداد میڈیکل کالج تک پہنچ ہی نہیں  
سکتی، کیا یہی انصاف ہے جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے؟  
یونیورسٹی کے نظم و نسق کے بارے میں اور بھی بہت سے افسوسناک  
واقعات ہیں یہاں بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن اس خیال سے  
درگزر کرتا ہوں کہ اس داستان سرانی سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔  
ہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود خلیج کے وسیع ہونے  
کا احتمال ضرور ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہندو مسلم نزاع ہلکا  
جلد ختم ہو۔ اور دونوں قومیں متحد ہو کر ملک کی ترقی میں حصہ لیں  
لیکن بد قسمتی سے فریقِ مقابل کی طرف سے ایسی قرارداد پیش کی  
گئی ہے۔ جس سے یہ نزاع کم ہونے کی بجائے اور بڑھنے لگی۔  
آئرلینڈ ڈیرتھلیٹ نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان  
نساد کی آگ نہیں بجھائی۔ البتہ راجہ صاحب کی یہ قرارداد اس  
سلسلے میں آگ کو شعلوں میں تبدیل کر کے لے گئی۔“

میاں فضل حسین کی تقریر کافی طویل تھی۔ اس میں دلائل و سبب ہیں سبھی  
سنئے۔ اعداد و شمار بھی سنئے۔ اور پارلیمنٹری آداب و قواعد کی پوری پابندی ملحوظ  
رکھی گئی تھی۔ راجہ نرنند ناتھ نے اپنی تقریر میں سرکاری ملازموں کے عزت و  
نصب اور تغیر و تبدل کے بعض واقعات بھی پیش کئے تھے۔ جن سے وہ

یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وزیر تعلیمات نے سندواتیوں کو محض اس لئے  
 برطرف کیا کہ وہ سندو تھے۔ اور مسلمان امتوں کو صرف اس لئے اچھی حکمتوں  
 پر تعینات کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ اگر یہ واقعات صحیح ثابت ہو جاتے تو وزیر  
 موصوفت کے لئے عافیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن فضل حسین نے  
 ان اتہامات کو پرکھنے کی طرح اڑا کر رکھ دیا۔ انہوں نے عائد کردہ الزامات  
 میں سے ایک ایک کو لیا۔ پھر ان کا تار و پود یوں بکھیرا جیسے ایک چاکریت  
 ڈھنیا روٹی کے ڈھیر کو ڈھنک کر رکھ دیتا ہے۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی  
 تو ایوان کی فضا بالکل صاف ہو چکی تھی۔ اور شک و شبہ کے بادلوں کا  
 نشان بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس تقریر کے ایک حصے کا ترجمہ ذیل  
 میں درج کیا جاتا ہے :-

” جناب والا! میں پوچھتا ہوں کہ اس قرارداد کے محرک کس  
 چیز کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں؟ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں  
 راجہ صاحب کو جس چیز پر اعتراض ہے وہ وزیر تعلیمات کی فرقہ  
 دارانہ پالیسی ہے۔ وہ اس بات کو بھی قابل مذمت سمجھتے ہیں  
 کہ وزیر تعلیمات نے مختلف امور میں فرقہ دارانہ نیابت مقرر کر دی  
 ہے۔ مشکل یہ ہے کہ راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرقہ دارانہ پالیسی  
 کے مفہوم کی وضاحت نہیں فرمائی۔ نہ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ قابل  
 اعتراض پالیسی کن اجزاء و عناصر کا مرکب ہے۔

” حقیقت یہ ہے کہ فرقہ دارانہ پالیسی یا فرقہ دارانہ نیابت ایک

ایسا لفظ ہے۔ جس کا کوئی صاف، واضح، غیر مشتبہ اور دو ٹوک مفہوم  
 اب تک متعین نہیں کیا جاسکا۔ اگر اس لفظ سے بڑے معنی لئے  
 جائیں تو فرقہ واری کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی پالیسی جو مذہبی  
 تعصب اور مذہبی جنون کی بنا پر قائم ہو۔ اور جس کا مقصد یہ  
 ہو کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے ہم مذہب افراد کو ترقی دی  
 جائے۔ اور انہی پر انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی ہے۔ اگر فرد  
 کے محرک کے ذہن میں فرقہ واری کا یہ مفہوم ہے۔ اور ان کا مدعا یہ  
 ہے کہ میں نے حکومت کے نظم و نسق کے کسی شعبہ میں اس قسم کی  
 پالیسی پر عمل کیا ہے یا عمل کرنے کی کوشش کی ہے تو میں اس کو  
 سراسر غلط اے بنیاد اور پادریوں اور بہتان قرار دیتے کر قطعاً قابل پذیرائی  
 یا درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس اگر فرقہ وارانہ نیابت  
 یا فرقہ وارانہ پالیسی سے یہ مطلب لیا جائے کہ کسی شخص کی قابلیت  
 کا جائزہ لیتے وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی تعلیمی کیفیت  
 کس درجہ کی ہے۔ اُس کا تجربہ کس پایے کا ہے۔ اُس کا خاندان  
 کس حیثیت کا ہے۔ اس نے حکومت وقت کی کہاں تک خدمت  
 کی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان امور کے ساتھ ساتھ اس بات  
 کو بھی پیش نظر رکھنا روا ہے کہ آخر وہ شخص کس مذہب و ملت سے  
 تعلق رکھتا ہے۔

”اگر فرقہ وارانہ پالیسی ان فرقہ وارانہ نیابت کی یہی تعریف ہے

جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھ کو اس چیز کا بانی یا مؤجد قرار دینے جانے کی راہ صاحب کے پاس کیا وجوہ ہیں؟ قطع نظر اس سے کہ میں ذاتی طور پر فرقہ دارانہ پالیسی کو اچھا سمجھتا ہوں یا بُرا۔ قطع نظر اس سے کہ میں نے اس پالیسی پر عمل کیا ہے یا اُس پر عمل کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایک بات میں پورے وثوق اور کامل ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ہرگز اس پالیسی کا مؤجد یا بانی نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے ذریعہ بننے سے بہت پہلے سے یہ پالیسی ہندوستان کے دیگر حصوں ہی میں نہیں۔ پنجاب میں بھی رائج تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ میں فرقہ دارانہ پالیسی کا بانی ہوں۔ یا میں نے اس پالیسی پر عمل کر کے ہندو مسلم نفاق پیدا کیا ہے۔ میری ذات پر ایک قبیح اتہام ہے۔ جس کے جواز کی کوئی وجہ میرے مخالفین کے پاس نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کا اہل ہو سکتا ہے کہ اُس کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق قائم ہوا تو لا رہیب وہ شخص میں ہوں۔

تھارواو کے محرک کو سب سے بڑا رنج یہ ہے کہ پنجاب کے ذریعہ تعلیمات نے صرف اپنے صوبے ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے میں چند فردی امور کی طرف آپ کو

متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا امر یہ ہے کہ اس ہندو مسلم کشیدگی کی وجہ کیا ہے؟ ہم میں سے ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سال ۱۹۱۶ء سے پہلے یہ کشیدگی ہائے ہاں موجود تھی۔ پھر مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کشیدگی کے اسباب کیا تھے؟ اگر کوئی غیر جانب دار شخص ہائے ملک کی تاریخ کے اس افسوسناک باب کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت فوراً منکشف ہو جائے گی کہ اس کشیدگی کا اولین سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی روز مرہ معاشرت میں اس مذہبی نفرت و عداوت کو وٹیل کر رکھا ہے جو آج ہمارے رگ و ریشم میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور کے اکثر سیاسی کارکن اس نفرت و عداوت کا قلع قمع کرتے رہے ہیں۔ لیکن نفرت و عداوت کا یہ جذبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف کی عمارت کا بنیادی پتھر بن گیا ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس عمارت کو منزل بہ منزل اور اونچا کرتے جائیں گے یا اسے منہدم کر کے پونڈ زمین کر دینا چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں فریق مخالف کے پاس ہے۔

”نفرت و عداوت کا یہ جذبہ جس کام میں نے ابھی ذکر کیا ہے، کئی صورتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک صورت چھوٹ چھات بھی ہے۔ ہندو صرف مسلمانوں ہی سے چھوٹ چھات نہیں کرتے بلکہ

خود سہ دو سہم کے اندر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو بخش خیال کرتا ہے۔ مثلاً برہمن غیر برہمنوں سے چھوڑنا گناہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر صوبہ مدہ اس کو لپیٹتے۔ وہاں جس باہمی اتفاق سے آگ لگا رکھی ہے کیا اُس کا ذمہ دار بھی میں ہوں؟

”حکومت مدہ اس کے وزیر ارٹھے ایک قانون بنا دیا ہے جس کی رو سے کوئی برہمن غیر برہمنوں پر تشدد نہیں کر سکتا۔ اس قانون کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ موجودہ وزارت کے عہد میں کسی برہمن کو سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی سرکاری ملازم کو جو برہمن ہے اُس وقت تک ترقی نہیں مل سکے گی جب تک کہ حکومت کے تمام محکموں میں غیر برہمنوں کو اُن کا جائز حق عطا نہیں ہو جاتا۔“

”میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس تمام تفرقے کا ذمہ دار بھی میں ہوں؟ یقین فرمائیے کہ اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں بلکہ وہ قوم ذمہ دار ہے جس کی مانند گی راہجہ نہ ندرنا تھ صاحب کر رہے ہیں۔“

”باقی رہا فرقہ دارانہ نیابت کا مسئلہ۔ قطع نظر اس سے کہ میں اس قسم کی نیابت کو اچھا سمجھتا ہوں یا بُرا۔ سوال صرف یہ ہے کہ بحالات موجودہ فرقہ دارانہ نیابت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ جناب والا! میری ذاتی رائے ہے کہ ایشیا رسی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام حصوں میں مذہب انسانی زندگی کا ایک ایسا زبردست



عصر ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ کسی شخص کے لئے یہ بڑ بانکس و نیا آسان ہے کہ وہ مذہب کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن اس قول پر عمل کرنا بے حد مشکل ہے۔ ہمارا دوزخ کا یہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ بڑی شدت سے اپنے آپ کو مذہبی تعصبات سے بے نیاز ظاہر کرتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ تنگ نظر بھی نکلتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں وہ نسبتاً زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر ہوتے ہیں۔ میں نے سالہ ۱۹۱۶ء میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی انہی عقائد کا پابند ہوں۔

”لیکن اگر کوئی شخص میرے خلاف یہ الزام عائد کرتا ہے کہ میں نے (کو محض اس لئے نقصان پہنچایا ہے کہ وہ سہدو تھا اور اب کو خالصتہً اس لئے اور نچا درجہ دیا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ یا اگر راجہ صاحب میرے خلاف فرد قرار دیا اور جرم مرتب کرتے وقت یہ فرمائیں کہ میں نے نااہل مسلمانوں کو ملازمت دے کر حکومت کے نظم و نسق کا معیار پست کر دیا ہے۔ تو یقین کیجئے کہ میں اس قسم کے الزام کو بے بنیاد ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کو اس منصب و وزارت سے جس پر میں آج فائز ہوں، مذاری کے متراوت قرار دیتا ہوں۔

”جناب والا! مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر کسی خاص مذہب و ملت کے افراد کو ملازمت میں جگہ دینے سے نظم و نسق کے معیار کے پست ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے آدمیوں کو ہرگز جگہ

نہ دیکھے۔ بلکہ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہاں تک کہنے کو تیار  
 ہوں کہ اگر انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر  
 فائز کرنے سے حکومت کے نظم و نسق کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے  
 تو یہ عہدے ہرگز ہندوستانیوں کو نہیں ملنے چاہئیں۔  
 آئیے اب اس بات پر بھی کچھ عرض کر دوں کہ گورنمنٹ کا رج  
 کے داخلے میں فرقہ وارانہ نیابت کو کیوں مانع کیا گیا ہے۔ راجہ  
 صاحب اس بات پر سخت ناراض ہیں کہ میں نے گورنمنٹ  
 کا رج میں مسلمانوں کے لئے چالیس فیصد نشستیں مخصوص کر دی  
 ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو میرا یہ فیصلہ قابل اعتراض  
 نظر آتا ہے تو آپ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں  
 کے خاص تعداد میں نشستیں محفوظ کر کے پر کیوں زور دیتے ہیں؟  
 اگر گورنمنٹ کا رج میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کا تحفظ آپ کے  
 نزدیک فرقہ واری ہے تو کیا کیمبرج اور آکسفورڈ میں ہندوستانیوں  
 کے لئے نشستوں کا تحفظ مکروہ قسم کی نسلی و قومی عصبیت اور  
 فرقہ پرستی نہیں؟ میں مزید پوچھتا ہوں کہ جب کوئی طالب علم  
 گورنمنٹ کانجے میں داخل ہونے کے لئے جاتا ہے تو آپ کیوں  
 اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ سفارش کے بغیر اس لئے نہیں ہو سکتا  
 کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ سفارش بجائے خود ایک ذلیل اور  
 قابل اعتراض چیز ہے؟

”گورنمنٹ کا بیج میں داخلہ کے وقت طالب علم کے نمبروں کے علاوہ چار چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اول یہ کہ آیا امیدوار کا کوئی رشتہ دار کا بیج میں اس وقت پڑھتا ہے یا پہلے پڑھتا رہا ہے۔ دوم یہ کہ آیا امیدوار کا باپ اس وقت سرکاری ملازمت میں ہے یا پنشن لے چکا ہے۔ سوم یہ کہ آیا امیدوار نے سرکاری ڈالٹیاں کی کوئی خدمت کی ہے یا نہیں۔ چہاں آیا امیدوار کسی بڑے آدمی کی سفارش لایا ہے یا نہیں۔“

”غور فرمائیے کہ جس درس گاہ میں طلبہ کے داخلے پر اس قسم کی پابندیاں ہوں۔ وہاں مسلمانوں کی خاک شنوائی ہوگی۔ اول تو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ دوسرے مسلمان یوں بھی تعلیم میں بہت پس ماندہ ہیں۔ تیسرے عام مسلمان بے حد غریب ہیں۔ انہیں بڑے آدمیوں تک رسائی ہی ممکن نہیں وہ سفارشتیں کیوں کر ہتیا کر سکتے ہیں ان حالات میں جبکہ امیدوار کا باپ سرکاری ملازم بھی نہیں، جبکہ قوم کی عام پس ماندگی کے باعث امیدوار کا کوئی قریبی رشتہ دار گورنمنٹ کا بیج میں تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکا۔ جبکہ نکتہ ر انڈاس کی وجہ سے امیدوار کی بڑے آدمیوں تک رسائی بھی نہیں تو پھر خدا مانتائیے کہ کیا گورنمنٹ کا بیج میں مسلمان طلبہ کے داخل ہونے کا کوئی ارکان ہے؟“

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

”میں نے اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کی شکایات بالکل بجا ہیں۔ اور مسلمان طلبہ کو صوبے کی بہترین درس گاہ سے محروم رکھنا کسی صورت اور کسی حال میں جائز نہیں۔ چاروں طرف شور مچ رہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں فرقہ پرستی کے اصول کو رائج کر دیا گیا ہے لیکن ذرا غور فرمائیے کہ اس فرقہ پرستی سے کون سا آسمان گر پڑا ہے جو پچھلے سال جو مسلمان طلبہ داخل ہوئے تھے ان میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو تھے۔ اور جو ہندو امیڈ وار داخل ہوئے تھے۔ ان میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو تین تھے۔ دے کے صرف تین نمبروں کا فرق ہے جس کے لئے یہ نالہ دُجا اور نو محمد شیوں برپا ہے۔“

جب عدم اعتماد کی اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو تمام مسلمان ممبروں نے فضل حسین کے حق میں ارجحیت دے دی اور سکھوں نے فضل حسین کے خلاف ووٹ دیئے۔ ہندوؤں میں رُہتک کے جاٹ اور کانگریس کے راجپوت۔ دیہاتی اور شہری۔ زراعت پیشہ اور غیر ذراعت پیشہ سبھی شامل تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایمان کی یہ تقسیم خالص فرقہ دارانہ تقسیم تھی۔ مسلمان فضل حسین کے ساتھ اور ہندوؤں کے مخالف تھے۔ قرارداد کی ناکامی نے فضل حسین کو مسلمان عوام میں پہلے سے بھی زیادہ مقبول بنا دیا۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود میاں صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر یہ

اس وقت مسلمانوں اور سرکاری ممبروں کے تعاون سے انہوں نے یہ معرکہ تو جیت لیا ہے۔ تاہم اگر کل کو مسلمان ممبروں میں سہوٹ پڑ گئی۔ یا گورنر سے اختلاف کی بنا پر سرکاری ارکان نے اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ تو پھر کیا ہوگا؟

صوبے بھر میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ سندھوؤں اور مسلمانوں میں مناد کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ ٹھنڈی سونے میں نہ آتی تھی۔ خلافت اور ترک موالات کے ابتدائی دور کا اتحاد خواب و خیال ہو چکا تھا۔ پنجاب کے سندھوؤں کے مسلسل اور متواتر پراپا گنڈے سے سندھوستان بھر میں یہ بات عام پھیل گئی تھی کہ سندھو مسلم اتحاد کو جس شخص نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور یوں بالواسطہ ترک موالات کی تحریک کو ختم کر دیا ہے وہ فضل حسین ہے۔ "انڈین اینونٹل رچسٹر" سال ۱۹۲۳ء۔ جلد ۲ میں پنجاب کی سیاسی حالت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی گئی ہے:-

"..... جیسا کہ پہلے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اب کے بھی فرقہ وارانہ کشمکش کی چنگاری پنجاب سے سجھوٹی۔ سندھو مسلم نفاق کی سب سے زیادہ ذمہ داری جس شخص کے سر سجھوٹی جا رہی ہے وہ پنجاب کے وزیر تعلیم میاں فضل حسین ہیں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصد ہے۔ لیکن اکثریت کے باوجود وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ اور چونکہ اس باب میں سندھوؤں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ

انہیں بعض ضروری تحفظات عطا کئے جائیں۔ اس کے علاوہ یوں بھی وہ سیاست اور مذہب میں بہت پرجوش واقع ہوئے ہیں ان کا طبعی رجحان ہندوستانی قومیت کی طرف کم اور عالمگیر اخوت اسلامی کی طرف زیادہ ہے۔ ہندوؤں کی آباری چوتیس فی صد ہے۔ جو بیشتر شہری اور قصبائی ہے۔ تعلیم، دولت، تجارت اور صنعت و حرفت میں ہندو مسلمانوں سے آگے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مذہبی حسیت سے بہت ڈرتے ہیں۔ کچھ جو صوبے مجموعی آبادی کا گیارہ فیصد عنصر ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن گذشتہ دس بارہ سال سے ان میں ایک زبردست انقلاب آ گیا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں اپنی سیاسی اور عسکری اہمیت کا شعور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ان تینوں قوموں کی ہدایات اور مفاد ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ پنجاب مستقل طور پر فرقہ پرستی کا اڈہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کا عام رجحان قوم پرستی کی طرف کم اور فرقہ واری کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔

”پنجاب کے وزیر تعلیم میاں فضل حسین شریک ترک موالات سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ میں شامل تھے۔ مارشل لاء کے ایام میں یہ بھی حکومت کے تشدد کا نشانہ بنے تھے منصب

وزارت پر فائز ہو کر انہیں لامحالہ ترک موالات کی تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی ایک سابق کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈر ہونے کی وجہ سے ان پر اس میثاقِ لکھنؤ کی پابندی بھی ہوتی تھی جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگس کے درمیان طے ہوا تھا۔ یہاں تک پنجاب کی صوبائی مجلسِ قانون ساز کی ہیئتِ ترکیبی کا تعلق ہے۔ میثاقِ لکھنؤ کی جملہ شرائط کو کم و بیش جدید اصلاحات میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یعنی پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور دیگر سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو پچاس فیصد نمائندگی عطا ہوگی۔ میاں فضل حسین نے اپنی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ان شرائط کی لفظ بہ لفظ پابندی کی۔ اور جب ان کے حریفوں نے ان کے حملاتِ فرقہ پرستی کا طوفان اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ کے میثاقِ لکھنؤ پر عمل کر رہے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر رہے۔

میاں فضل حسین کی اس پالیسی کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں ترک موالات کی تحریک کا فائدہ ہو گیا۔ مسلمان خواہ وہ ترک موالات کے حامی تھے یا مخالف، یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک پرندہ جو ہاتھ میں آ گیا ہے۔ یقیناً ان دو پرندوں سے بہتر ہے جو ابھی جھاڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ دہاتا گاندھی جس مکمل سوراخ کا خواب دکھا رہے ہیں

خدا جانے وہ کب آئے گا۔ اور اگر آیا بھی تو نہیں معلوم کہ اس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ لہذا ہم اس اُدھورے سوراج ہی سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں جو میاں فضل حسین کی کوششوں سے ہمیں مل رہا ہے۔ یہ سب کچھ محسوس کر کے مسلمان من حیث القوم فضل حسین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔“

اپریل ۱۹۲۳ء میں کانگریس نے سی۔ آر۔ داس - پیٹل موتی لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد اور سروجنی نائیڈو کو بنگال بھیجا تا کہ سندھ مسلم قومی کانل تلاش کیا جائے۔ یہ وفد تین چار ہفتے پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتا رہا۔ لیکن عادات پر سے بدتر ہو گئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی وفد کی تجویزوں کو کان دھر کر سننے پر تیار نہ تھا۔ آخر سی۔ آر۔ داس نے جو وفد کے لیڈر تھے، نہایت غصہ کے عالم میں ایک بیان دیا کہ ”پنجاب اپنے جھگڑوں میں بے شک اُبھار رہا ہے۔ سوراج ان جھگڑوں کا انتظار نہیں کر سکتا۔ ہم اہل پنجاب کے باہمی فتناوات کا حل تلاش کرنے کو محض تضحیٰ اوقات سمجھتے ہیں۔ پنجاب یونہی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلتا رہے گا۔ ہمیں اس کی چنداں پروا نہیں۔ ہم کو سوراج پارٹی کا پروگرام اپنی تکمیل کے لئے بلکا رہا ہے۔ اس لئے ہم یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔“

بعض لوگوں نے یہ سوچ کر کہ ہندو مسلم فتناوات کی جڑ چونکہ جداگانہ انتخاب ہے اس لئے اگر اس قسم کا انتظام کر لیا جائے کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں ہندو مسلمان اور سکھ نشستوں کی جو موجودہ تعداد ہے۔ وہ



تو محفوظ رہے۔ لیکن انتخاب مخلوط ہو جائے۔ تو فرقہ وارانہ کش مکش کے کم ہو جانے کا بہت امکان ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی کوشش سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پنجاب کونسل میں مخلوط انتخاب کی قرارداد پیش کی گئی۔ میاں فضل حسین اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے قرارداد کے خلاف ایک طویل تقریر کی۔ جس کے ایک حصہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے :-

”آج کل ہماری سیاسی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ہر شخص صرف اپنی قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھتا اور ملک کی دوسری قوموں کے مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر ایک فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے اُسے کچھ فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ تو وہ بے دریغ جداگانہ انتخاب کا نعرو بلند کر دیتا ہے۔ اور اگر یہی طبقہ کل کو یہ محسوس کرتا ہے کہ مخلوط انتخاب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے گا تو فوراً مخلوط انتخاب کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام ہتھکنڈے صرف اپنے ادو اپنی قوم کے منافع کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ قوم پرستی کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ محض اپنے اپنے فزنیے کا خیال کرنے کے بجائے سب لوگ مجموعی طور پر سارے ملک کی بہتری کا خیال کریں تاکہ اقلیت کو اپنی تقدیر اکثریت کے ہاتھ میں دے دینے سے متاثر نہ ہو۔ اگر ماضی میں اس قسم کے باہمی اعتماد کی خوشگوار فضا موجود ہوتی۔ تو جداگانہ انتخاب کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔“

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

میں اس ایوان کی توجہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف منتقل  
 کراتا ہوں۔ جہاں انتخاب مخلوط ہے اور انتخابی حلقے بھی مخلوط  
 ہیں۔ وہاں کیا سوچا ہے؟ جس حلقے میں مسلمان ووٹروں کی تعداد  
 زیادہ ہے۔ وہاں سے مسلمان اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے  
 وہاں سے ہندو نمبر منتخب ہوتا ہے۔ یہی حال ان میونسپل کمیٹیوں  
 کا ہے جہاں مخلوط انتخاب رائج ہے۔ مسلمان ووٹر مسلمان کو  
 اور ہندو ووٹر ہندو قوم ہی کو ووٹ دیتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے  
 کہ انتخابی حلقے مخلوط ہونے کے باوجود انتخابات کی جنگیں  
 جداگانہ نیابت کے اصولوں پر لڑی جا رہی ہیں۔

”ملک بھر میں فرقہ پرستی کی وبا پھیل رہی ہے۔ اور اس بار  
 کے جراثیم پرستی اور فرقہ پرستی میں سرایت کر گئے ہیں۔ انتخابات  
 مخلوط رکھئے تو کیا اندھاگانہ رہے تو کیا۔ جب تک یہ جراثیم  
 موجود ہیں محض انتخابی طور طریقوں کے اول بدل سے مرض کا ازالہ  
 نہیں ہوگا..... یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جداگانہ انتخاب سے ہندو  
 مسلم کشیدگی پیدا کی ہے۔ ۱۹۲۲ء تک امرتسر میں ہندوؤں اور  
 مسلمانوں میں ایسا زبردست اتحاد تھا کہ سارا ہندوستان اُسے  
 رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد اس اتفاق و اتحاد  
 کی جگہ نفرت و عداوت نے لے لی ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ  
 اس کی کیا وجہ ہے؟ جداگانہ انتخاب تو وہاں گذشتہ پینتیس سال

سے رائج تھا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی اہمیت کی لہریں برابر  
 زور و شور سے چلتی رہیں۔ اب پچھلے دو سال سے اس اتفاق کا  
 شانہ تک امرتسر میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ مرض کی جڑ جداگانہ  
 انتخاب میں نہیں۔ بلکہ کسی اور جگہ پھپی ہوئی ہے۔

جب تک لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوگی۔  
 ہماری مذہبی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں انقلاب نہیں آسکتا  
 یہ دعویٰ سراسر غلط ہے کہ مخلوط انتخاب مانع کر دینے سے لوگ صرف  
 موزوں اور قابل امیدواروں کو ووٹ دینگے۔ اور اس بات کا  
 خیال نہیں کریں گے کہ آیا امیدوار ان کا ہم قوم و ہم مذہب ہے  
 یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہر طبقہ میں فرقہ پرستی کی  
 بیماری پھیل گئی ہے اور ہر شخص ہر واقعہ کو صرف اس نقطہ نگاہ  
 سے دیکھتا ہے کہ اس کو اور اس کے فرقے کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔  
 ”اس بحث کے دوران میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جداگانہ انتخاب  
 کی تردید سے پہلے فرقہ دارانہ جھگڑے ہمارے ہاں موجود نہیں تھے  
 یہ بات صریحاً غلط ہے۔ جداگانہ انتخاب جاری کرنے کی سب  
 سے بڑی وجہ یہی فرقہ دارانہ نزاع تھی۔ جیسی آج ہے۔ ایسا  
 فرقہ پرستی کے اظہار اور اس سے متعلق ہونے کے بہت سے ایسے  
 مواقع نکل آئے ہیں جو ماضی میں نہیں تھے۔ ملازمتوں کی کثرت  
 حکومت خود اختیاری کے ادارے۔ کونسل کی ممبری۔ یہ تمام

چیزیں اس شکل میں پہلے موجود نہیں تھیں۔

”یہ صحیح ہے کہ ہمارا سہم لے کر نظر ہی ہونا چاہیے کہ ملک میں مخلوط انتخاب رائج کیا جائے، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس چیز کی ہے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو تاکہ وہ اپنے اپنے فرقے اور اپنے اپنے طبقے کی بہتری کے خیال سے بند ہو کر ملک کے تمام طبقوں کی تلامذہ و بہبود کو اپنا نصب العین بنائیں۔ جس وقت یہ ذہنیست پیدا ہو گئی۔ تو ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر خود بخود اعتماد کرنے لگا جائے گا۔ اور پھر جداگانہ انتخاب کی ضرورت

بھی باقی نہیں رہے گی۔“

۱۹۲۳ء کے نومبر میں پنجاب کی پہلی مجلس قانون ساز کی سہ سالہ زندگی ختم ہو گئی۔ اور نئے انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لالہ امرکشن لال نے اعلان کر دیا کہ وہ دوبارہ انتخابات میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ سندھ امرکشن لال کو طعنہ دیتے تھے کہ اگر وہ جتنی ہونے کے باوجود محض پانچ ہزار روپے مشاہرت کی خاطر فضل حسین کی ”سندھ کش“ پالیسی میں شریک ہے۔ کونسل کے ختم ہوتے ہی لالہ امرکشن لال نے ایک پیٹک علیہ میں اپنی دندانی پیش کی۔ انہوں نے میاں فضل حسین کی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے اس دو عملی حکومت کو بھی برا بھلا کہا جو جدید اصلاحات کا نتیجہ تھی۔ اس طرح پنجاب کی اس پہلی وزارت کا خاتمہ ہوا۔ جس میں دونوں وزیر شہری تھے اور کانگریسی بھی تھے۔ امرکشن لال تو پنجاب کی سیاسیات سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن

فضل حسین نے اس تجربے سے یہ سبق حاصل کر لیا کہ آئندہ کسی کانگریسی اور کسی شہری سندھ کو اپنا رفیق کار نہیں بنائیں گے۔

---

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

# یونینسٹ پارٹی کا قیام

جنوری ۱۹۲۲ء میں پنجاب کی دوسری لیجسلیٹو کونسل مرتب ہوئی۔ اس مرتبہ ایوان میں ممبروں کی تقسیم کسی حد تک جماعت بندی یعنی پارٹی کے اصول پر تھی۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی نے چونکہ کونسلوں کے تعامل کی شرطاً اتحادی تھی۔ اس لئے پنڈت موتی لال نہرو، اور مسٹری آر۔ واس کی نیادت میں کانگریس کا ایک طاقتور عنصر سورا جیوں کے لقب سے مرکزی اسمبلی کے علاوہ ممبرانہ کونسلوں میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کونسل میں توسوہ اتنی اور تین خلافتی ارکان آگئے تھے۔ سورا جی سب کے سب ہندو تھے۔ جن کے لیڈر ڈاکٹر گوئن چند نارنگ تھے۔ خلافتی ارکان میں چودھری افضل حق، رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر شامل تھے۔ اس کے علاوہ پانچ ممبرانہ جن کے لیڈر راجہ نرنند ناتھ، اپنے آپ کو ہندو سمجھا پارٹی کہتے تھے۔ چوزاعت پیشہ ہندوؤں کا ایک الگ گروہ تھا جس کے لیڈر چودھری لال چند تھے۔ مسلمانوں میں تین خلافتی ممبروں کے علاوہ چوبیس جماعت پیشہ ارکان کا علیحدہ جگہ تھا۔ سات ممبرانہ اپنے آپ کو

مسلم لیجی کہتے تھے۔ حالانکہ الیکشن میں مسلم لیگ نے بحیثیت سیاسی جماعت کے قطعاً کوئی حقہ نہیں لیا تھا۔ سکھوں میں گیارہ ممبر شرو منی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے نمائندے تھے۔ سائے ایوان میں چھ ممبر ایسے بھی تھے۔ جو اپنے آپ کو کسی جماعت سے منسوب نہیں کرتے تھے۔

وزارت سازی کا وقت آیا تو گورنر، سر ایڈورڈ میک لگن نے حسب سابق مسلمانوں میں سے میاں فضل حسین کو منتخب کیا۔ میاں فضل حسین کا اثر گورنر پر اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ انہوں نے وزارت قبول کرنے سے پہلے یہ شرط پیش کی کہ انہیں اپنا سندور فیتق نامزد کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اور گورنر اس میں مداخلت نہ کرے۔ سر ایڈورڈ میک لگن نے یہ شرط منظور کر لی۔ میاں فضل حسین نے رتھک کے ایک جاٹ چودہری لال چند کو اپنا ساتھی منتخب کیا یہ وہی لال چند تھے جو جدید اصلاحات سے پہلے سبھی پنجاب کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ اور شہری اور دیہاتی تفریق کے اس قدر معادون تھے کہ انہی کی کوششوں سے شہری اور دیہاتی آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے مقرر ہوئے تھے۔ اور انہی کی کوشش سے شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب سے نئی کونسل میں نشستوں کی تعداد بھی مقرر کی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں چودہری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی۔ تو دیہات کے انتخابی حلقے سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانون انتقال اراضی کی رو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ میاں فضل حسین چونکہ ان دنوں اس تفریق و تقسیم کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے لال چند کی ان

تجویزوں اور کوششوں کی سخت مخالفت کی تھی۔ یہ لال چند ہی تھے جنہوں نے تین سال قبل اپنے اخبار جاٹ گزٹ میں یہ اعتراض کیا تھا کہ میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال کی وزارت "شہری وزارت" ہے۔ جو پنجاب کو نسل کے دیپاتی ممبروں کے لئے باعث توہین ہے۔

سوال یہ ہے کہ میاں فضل حسین کو کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک ایسے شخص کو اپنا رفیق کار بنائیں۔ جو سیاست میں کبھی اُن کا ہم نوا نہیں تھا اور جس کے رجعت پسندانہ اور فخر پر وازانہ عقائد سے اُنھیں ہمیشہ اختلاف رہا تھا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں۔ گزشتہ تین سال کے تجربے نے فضل حسین کو یہ سبق سکھا دیا تھا۔ کہ شہری اور کانگریسی ہندوؤں سے اب انھیں کسی قسم کے اشتراک و تعاون یا کسی نوع کی سہمدی کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ میاں فضل حسین چونکہ بڑے زریک ہوشیار آدمی تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سوراج پارٹی کے کونسلر میں داخل ہونے کے بعد سوا کارِ فتح بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ مرکزی اسمبلی میں سٹر جنگ کی پارٹی اور سورا جیوں میں کامل اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس اتحاد کی وجہ سے حکومت کو پے در پے شکستیں سہری تھیں۔ بنگال میں سی۔ آر۔ واس کی کوہ پیکر شخصیت نے مسلمانوں کے تمام خدشوں کو دور کر کے اُنھیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور اس طرح سوبے میں حکومت کا نظام اور وزارت کا قیام ناممکن کر دیا تھا۔ فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر کل کو پنجاب میں بھی کوئی موتی لال یا کوئی سی۔ آر۔ واس پیدا ہو گیا۔ جس نے مسلمانوں کے تمام اندیشوں



کو دور کر کے ایک زبردست حزب مخالف کی بنا ڈال دی۔ تو ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے گا۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر انہوں نے کونسل کے سبندو ممبروں میں سے اُس شخص کو اپنا رفیقِ کار منتخب کیا۔ جو شہری آبادی کا سب سے بڑا دشمن اور شہریوں کے تفوق کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ میاں فضل حسین کو یقین تھا کہ مسلمان تو بہر حال اُن کے ساتھ رہیں گے۔ خطرہ صرف ہندوؤں سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس خطرہ کے ازالہ کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ ہندوؤں میں سے ایک گروہ کو کاٹ کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

کونسل میں تین دیہاتی مسلمان ممبر تھے۔ اوہر جو دہری لال چند چھوڑاوت پیشہ دیہاتی ہندوؤں کے لیڈر تھے۔ اقتصادوی مفاد کے مشترک ہوجانے سے ان دونوں گروہوں میں یگانگت اور ہم آہنگی کا پیدا ہوجانا لازمی تھا۔ اس قسم کی یگانگت اس لئے بھی ضروری تھی کہ مسلمان بجائے خود اکثریت میں نہیں تھے۔ اور ایسی پارٹی بنانے سے معذور تھے جو تنہا حکومت چلانے کی قدرت رکھتی ہو۔ ہدایگانہ نیابت کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی مسائل اور اقتصادوی مفاد کے اشتراک پر کونسل میں مخلوط پارٹی بنانا قطعاً معیوب نہیں تھا۔ آخر مطلب بھاری کے لئے "سرکاری بلاک" پر کب تک انحصار ہو سکتا اور کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میاں فضل حسین نے کچھلے تین برسوں میں "سرکاری بلاک" کی غیر متزلزل اعانت سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ گورنر کی چشمِ کرم کا نتیجہ تھا۔ اور جو لوگ انگریز کی ذہنیت سے واقف تھے اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ کہ ممکن ہے یہی چشمِ کرم رات بھر

میں چشم تہر و غضب سے بدل جائے۔ یوں سبھی ملک کے ترقی پذیر سیاسی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ سرکاری اور نامزد ممبروں کی اعانت سے بے نیاز ہو کر وزارت کو اپنی پارٹی پر اعتماد کرنا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی باہمی تصادم نہیں تھا۔ شہری مسلمان غیر ذراعت پیشہ ہونے کے باوجود قانون انتقال اراضی کے حامی تھے۔ اور انھیں یہ کسی صورت سے گوارا نہیں تھا کہ دیہاتی مسلمان اس قانون کی حفاظت و عیانت سے محروم ہو جائیں۔ یا ان کی زمینیں سوڈر سوڈو کے چکر میں پڑ کر سندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جائیں چودھری لال چند کی پارٹی بھی اسی اصول کی حامی تھی۔ لہذا صوبے کے وسیع مفاد اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے میاں فضل حسین کا یہ اقدام ہرگز قابل اعتراض نہیں تھا۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ شہری سندوؤں کے اس دولت مند طبقہ کے استیلا سے، جو مختلف ذرائع آمدنی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو چکا تھا، صوبے کی غریب اور پسماندہ آبادی کو محفوظ رکھا جائے۔

فضل حسین اور لال چند کی اس مشترک پارٹی کا نام نیشنل یونینیت پارٹی رکھا گیا۔ اور کونسل کے شہری مسلمان بطیب خاطر اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن سوراچیوں اور سندو سبھائیوں کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا تھا کہ زہتک کا ایک جاٹ سندو قوم کا نمائندہ بن کر وزارت کی کرسی پر بیٹھ جائے۔ ان کے لئے تو گویا یہ منصب صرف انہی کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ چنانچہ میاں فضل حسین

کے اس فیصلے کے خلاف سو بے بھر کے شہری ہندوؤں میں ایک تلچلی مچ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جب لالہ مرکشن لال وزیر تھے، تو شہری ہندو انھیں بزدلی کا طعنہ دے کر کہتے تھے کہ یہ شخص کروڑ پتی سونے کے باوجود پانچ ہزار روپے منام کی خاطر فضل حسین کی "ہندو کش" پالیسی میں شریک ہے، جب لالہ مرکشن لال رخصت ہو گئے اور وزارت کو کیا انہوں نے کونسل کے دروازہ کی طرف بھی رخ کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اب یہی شہری ہندو اس بات پر دوا دیا کر رہے تھے کہ فضل حسین کا رفیق کار خود ان کی جماعت میں سے کیوں نہیں لیا گیا۔ اور یہ اعزاز ہتھک کے ایک زراعت پیشہ دیہاتی کو کیوں عطا ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی اس ناکامی اور محرومی کا انتقام لینے کے لئے انہوں نے ایک بہت بڑی ہتھیار جمع کر کے چودھری لال چند کے اُس حریت کو دی۔ جو گذشتہ الیکشن میں ان سے شکست کھا چکا تھا۔ اور اُسے لال چند کے خلاف انتخابی عذر داری دائر کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اگر دینیسٹ پارٹی ذات پات کی تفریق اور قبائلی عصبیت کے جذبے سے بلند ہو کر۔ صرف انہی خطوط پر کام کرتی جو اُس نے اپنے لئے وضع کئے تھے۔ تو کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ لیکن مصیبت یہ آ پڑی کہ چودھری لال چند اور ان کے رفقا یہ نقطہ نگاہ نے کرائے تھے۔ کہ پنجاب میں اگر کوئی طبقہ مظلوم ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کوئی طبقہ حکومت کی اعانت و سرپرستی کا محتاج ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کسی طبقہ کو ملازمتیں۔ جاگیریں اور عہدے حاصل کرنے کا استحقاق ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اور اگر کوئی طبقہ اغیار کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے اب تک

اپنے جائز حق سے محروم رہا ہے۔ تو وہ صرف جاٹ ہیں۔ چنانچہ اگر پنجاب کونسل کی صرف سزہ کی کارگزاری پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ تو یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

یہاں پنجاب کونسل کی صرف فروری ۱۹۲۷ء سے نومبر ۱۹۲۷ء تک کی تعداد میں سے چند سوال نکال کر درج کئے جاتے ہیں۔ جن کے جواب کونسل کے ممبروں نے ذیروں سے طلب کئے تھے۔

چودھری دلی چند : (۱) "کیا یہ واقعہ ہے کہ پی۔ اے۔ ایس کی ملازمتوں میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ اس ملازمت میں کتنی اسامیوں پر ہندو جاٹ متعین ہیں؟

(ب) کیا مہربانی کر کے حکومت آئندہ پی۔ اے۔ ایس کی اسامیوں پر براہ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟

چودھری دلی چند : (۱) "کیا یہ واقعہ ہے کہ پی۔ اے۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ اس ملازمت پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟

"(ب) کیا مہربانی فرما کر حکومت آئندہ پی۔ اے۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں براہ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟

چودھری دلی چند : "رہا کیا مہربانی کر کے حکومت اکیلیسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مندرجہ ذیل اسامیوں پر کتنے زراعت

پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمان۔ کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ ہندو اور  
کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھ متعین ہیں۔

۱:- انسپکٹر پولیس

۲:- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

۳:- سب انسپکٹر آبداری

۴:- انسپکٹر آبداری

۵:- اسٹنٹ جیلر

۶:- جیلر

۷:- اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

۸:- ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

۹:- سب جج

۱۰:- اکسٹرا اسٹنٹ کنزرویٹر جنگلات

۱۱:- ریجر جنگلات

۱۲:- ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت

۱۳:- پنجاب سول سکریٹریٹ کے کلرک

”سب) کیا ہر بانی کے حکومت بتلے گی کہ مذکورہ بالا سامیوں میں سے ہر

سامی پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟

”ج) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ پے در پے سرکار جاری کرنے کے باوجود

کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد بڑھانی جائے۔ اب تک ان

کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا؟

” (د) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ وہ آئندہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کو ان کا پورا حصہ دینے کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ چودھری دلی چند: ” (ا) کیا ہر بانی کر کے حکومت ایسی ہی نہرست پیش کرے گی جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ ضلع ریتک کے ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ سول سرجن کے دفاتر میں اور ریتک اور کرنال کی جملہ تحصیلوں کے دفاتر میں کتنے آدمی ملازم ہیں اور وہ ملازم کین اقوام سے تعلق رکھتے ہیں؟ ” (ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ ان تمام دفاتر میں ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد تلیل ہے؟“

” (ج) اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا حکومت ان اضلاع کے حکام کے نام اس قسم کی ہدایات جاری کرے گی کہ وہ اپنے دفاتروں میں ہندو جاٹوں کی تعداد میں ان کی آبادی کے مطابق اضافہ کریں؟“

چودھری چھوڑ رام: ” کیا ہر بانی کر کے حکومت ایسی نہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مجموعی طور پر مندرجہ ذیل ملازمتوں میں سے ہر ملازمت کی کتنی اسامیاں اس وقت صوبے بھر میں موجود ہیں اور ایسی ہر اسٹی پر کتنے ہندو جاٹ اور مسلمان جاٹ۔ ہندو را جپوت اور مسلمان را جپوت متعین ہیں؟“

۱۔ اکثر اسسٹنٹ کمشنر

۲۔ سب جج

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

- ۳۔ تحصیلدار  
۱۱۔ ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت  
۱۲۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس  
۱۳۔ اسسٹنٹ رجسٹرار  
۱۴۔ انسپکٹر پولیس  
۱۵۔ ڈپٹی کلکٹر انہار  
۱۶۔ سب انسپکٹر پولیس  
۱۷۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس  
۱۸۔ ضلعدار  
۱۹۔ گنر اسسٹنٹ کنٹریوٹری جنرل  
۱۰۔ ریجنل جنرل  
۱۱۔ ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت  
۱۲۔ اسسٹنٹ رجسٹرار  
۱۳۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ  
۱۴۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر  
۱۵۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس  
۱۶۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس  
۱۷۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر  
۱۸۔ سب انسپکٹر بکاری  
۱۹۔ انسپکٹر بکاری  
۱۰۔ سب انسپکٹر بکاری

چودھری چھوٹو مرام : "کیا ہر بانی کر کے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں پنجاب کی نو آبادیات میں سے ہر نو آبادی کے متعلق مندرجہ ذیل امور واضح کئے گئے ہوں؟

"(ا) مرتبہ جات اراضی کی کل تعداد کتنی ہے؟

"(ب) ایسے مرتبہ جات کی تعداد کتنی ہے جن کو ایک معینہ مدت کے لئے

متاجری پر دیا گیا ہے۔ اور وہ معینہ مدت کب ختم ہو رہی ہے؟

"(ج) ایسے مرتبہ جات کی تعداد کتنی ہے جن پر ذراعت پیشہ و غیر ذراعت

پیشہ مسلمان۔ ذراعت پیشہ و غیر ذراعت پیشہ سیکھ۔ ذراعت پیشہ و غیر ذراعت پیشہ

ہندو اور دیگر اقوام کے لوگ

۱۔ مالکانہ حقوق رکھتے ہیں۔ یا

۲۔ قابض کاشتکار ہیں۔ یا

۳۔ غیر قابض کاشتکار ہیں۔ یا

۱۲۔ پتہ دار ہیں؟

چودھری چھوٹو مرہم : ”کیا ہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ قسمت انبالہ میں کتنے مربع جاہت اراضی سندو جاٹوں کو عطا کئے گئے ہیں؟“

چودھری چھوٹو مرہم : ”کیا ہربانی فرما کر حکومت ایک ایسی نہرست پیش کرے گی۔ جس میں مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہو؟“

”ا) جب سے حکومت نے ریزولیشن منظور کیا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں زمینداروں کو ایک خاص معینہ تعداد میں ملازمتیں دی جائیں گی۔ اس وقت سے لے کر اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کُل کتنے آدمیوں کا تقرر ہوا ہے۔ اور ان تقرریاقتہ امیدواروں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے؟“

۱۶۔ انسپکٹر پولیس

۱۔ ایگزیکٹو کمنڈنٹ

۱۷۔ سب انسپکٹر پولیس

۲۔ سب جج

۱۸۔ ضلعدار

۳۔ تحصیلدار

۱۹۔ پی۔ ای۔ ایس

۴۔ نائب تحصیلدار

۱۱۰۔ جیلر

۵۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

”ب) مذکورہ بالا ریزولیشن منظور ہونے سے تین سال پیشتر انہی اسامیوں میں سے ہر ایک اسامی پر کتنے زمیندار امیدواروں کا تقرر ہوا تھا؟“

چودھری چھوٹو مرہم : ”کیا ہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ پنجاب



سول سکرٹریٹ کے کلرکوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟  
 چودھری چھوٹو سرام: ”کیا ہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ جب سے  
 یہ ریٹزیویشن منظور ہوا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں جاٹوں کی تعداد میں اضافہ  
 کیا جائے گا۔ اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کتنے امیدواروں  
 کا تقرر ہوا ہے اور ان تقرریاؤں میں سے ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟“

۱۔ سب جج ۶۔ انسپکٹر پولیس

۲۔ ایگزیکٹو سٹنٹ کلرک ۷۔ سب انسپکٹر پولیس

۳۔ تحصیلدار ۸۔ ضلعدار

۴۔ نائب تحصیلدار ۹۔ جیلر

۵۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ۱۰۔ پی۔ ای۔ ایس

چودھری چھوٹو سرام: ”کیا ہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گذشتہ  
 پانچ سال میں حکومت پنجاب نے کتنے آدمیوں کو ڈیوڈون کے فارسٹ کالج  
 میں ایگزیکٹو سٹنٹ کلرک یا ریٹزیویشن کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے  
 اور ان میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟“

”ب) کیا ہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ یہ بات صحیح ہے کہ اس کالج میں  
 ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد قلیل ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت اس درسگاہ  
 میں ہندو جاٹ طلبہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی؟“

چودھری چھوٹو سرام: ”(ا) کیا ہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ  
 یہ واقعہ ہے کہ جب حکومت نے مختلف سرکاری محکموں میں اسامیوں کی ایک

خاص تعداد زمینداروں کے لئے مخصوص تھی۔ تو اس ریپوزیشن کے ذریعے سے یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ پینتہ دراندہ ریپوزیشنل اور ٹیکنیکل درس گاہوں میں زمیندار امیدواروں کو داخلے کی خاص سہولتیں بہم پہنچانی جائیں گی؟

"(ب) اگر شق (ل) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا ہریانہ کے حکومت بتائے گی کہ لاہور کے میڈیکل کالج - ڈیٹری کالج - سینٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں داخلہ کے وقت ذمہ دارانہ سرورسوں نے یہ تحقیقات کی تھی کہ آیا داخل ہونے والے امیدوار زمیندار ہیں یا غیر زمیندار؟ -

"(ج) اگر اس قسم کی تحقیقات نہیں کی گئی تو کیا حکومت ہریانہ کے متعلقہ درس گاہوں کے انسرورس کے نام احکام جاری کرے گی کہ آئندہ داخلہ کے وقت اس قسم کی تحقیقات ضرور کی جائے۔ تاکہ حکومت کے منظور کردہ ریپوزیشن پر لفظاً و معنیاً عمل درآمد ہو سکے؟

"(د) کیا ہریانہ کے حکومت بتائے گی کہ امسال لاہور کے میڈیکل کالج - ڈیٹری کالج - سینٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں کتنے مسلمان سہارا اور سکھ امیدوار داخل کئے گئے ہیں۔ امدان تینوں فرقوں کے طلبہ میں سے ہر فرقہ کے زمیندار طلبہ کتنے ہیں اور غیر زمیندار کتنے؟

چودھری چھوٹو سرام: کیا ہریانہ فرما کر حکومت بتائے گی کہ ۱۹۱۵ء سے لے کر اب تک کتنے سرکاری ملازموں کو ان کے حسن خدمات کے اعتراف میں کتنے مراعات اراضی عام مروجہ شرائط پر (قیمتا) عطا کئے جا چکے ہیں امدان سرکاری ملازموں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے اور غیر زمینداروں کی تعداد کیلئے؟

چودھری دلی چند : ” (ا) کیا منگلپورہ انجینیئرنگ کالج کے جملہ معارف  
صوبے کے محاصل میں سے ادا کئے جاتے ہیں؟

” (ب) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ صوبے کی آمدنی کا بیشتر حصہ زراعت پیشہ  
طبقہ کی جیبوں میں سے نکل رہا ہے۔ اور ریوے کا محکمہ صوبائی محاصل میں ایک  
پیسہ بھی ادا نہیں کرتا؟

” (ج) کیا یہ صحیح ہے کہ اس کالج کے داخلے میں زراعت پیشہ طبقہ کے افراد  
کو کوئی ترجیح نہیں دی جاتی؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ وہ امیدوار جن کو ریوے  
کا محکمہ نامزد کرتا ہے۔ اس کالج میں سائی سے داخل ہو سکتے ہیں؟

” اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ تو کیا حکومت ہر بانی فرما کر  
داخلے کے قواعد کو فوراً تبدیل کرنے کی کوشش کرے گی؟

چودھری دلی چند : ” (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے  
سے اوپر سالانہ آمدنی رکھنے والے اشخاص کے بچوں سے سکولوں میں اول گریڈ  
فیس وصول کی جاتی ہے؟ اور کیا یہ بھی واقعہ ہے، کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اوپر  
سالانہ آمدنی سے مراد زرعی آمدنی بھی لی جاتی ہے؟

” (ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت ہر بانی کر کے دو ہزار یا دو  
ہزار روپے سے اوپر کی سالانہ زرعی آمدنی کو آمدنی کی اس تعریف سے مستثنیٰ  
تعداد دے گی؟

چودھری دلی چند : ” کیا یہ واقعہ ہے کہ کالج کی تعلیم حاصل کرنے  
کے لئے ہر سال فرقہ دارانہ اصول پر مختلف طلبہ کو تیس دن و نوائے دیئے جاتے ہیں؟

کیا یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان وظائف کے عطا کئے جانے کا تعلق ہے زراعت پیشہ ہندو جاٹوں اور زراعت پیشہ ہندو راجپوتوں کو ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کیا گیا ہے؟

”کیا ہریانہ کی حکومت ہندو گوجروں کو بھی ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کرے گی۔ اور ان وظائف میں سے جو ہندو قوم کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ ہندو گوجروں کے لئے الگ تعداد مخصوص کر دے گی؟“

چودھری دلی چند : ”کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈیرہ غازی خان۔ جام پور مظفر گڑھ اور قسمت راولپنڈی کے تمام گورنمنٹ سکولوں کی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف تعلیمی فیس وصول کی جاتی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت ہریانہ کے کرناٹک۔ روستک۔ گورگالوہ اور حصار کے گورنمنٹ سکولوں میں بھی اسی قسم کی رعایت کا نفاذ کرے گی۔ تاکہ وہاں بھی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف فیس وصول کی جائے؟“

چودھری دلی چند : ”کیا ہریانہ کی حکومت بتائے گی۔ کہ اب تک حکومت پنجاب کی سفارش پر۔ کتنے طلبہ کو ڈیرہ و دون ملٹری کالج میں بھیجا گیا ہے؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ ان طلبہ میں ایک ہی ہندو جاٹ نہیں؟ اگر یہ درست ہے تو کیا حکومت آئندہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے گی۔ جس سے کافی تعداد میں ہندو جاٹ طلبہ کو اس ملٹری کالج میں بھیجا جاسکے؟“

چودھری دلی چند : ”کیا ہریانہ کی حکومت بتائے گی کہ گزشتہ دس سال میں حلقہ مشرقی (ایسٹرن ریجن) سے کتنے پروڈیشنر سب انسپکٹر پولیس

بھرتی کئے گئے ہیں؟ اور ان ہندو پیشینہ سب انسپکٹروں میں کتنے نداعت پیشہ افراد  
ہتھے؟ اور ان نداعت پیشہ افراد میں سے کتنے جاٹ ہتھے؟

چودھری دلی چند : ”کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ سینٹرل  
ٹرنڈنگ کا ریج لاہور کی جو نیو اینگلو رینیکلر کلاس، سینٹر اینگلو رینیکلر کلاس انڈی-ٹی  
کلاس میں کتنے طلبہ داخل کئے گئے ہیں۔ اور ان داخل ہونے والے طلبہ میں زراعت  
پیشہ وغیر زراعت پیشہ مسلمانوں۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ ہندوؤں  
زراعت پیشہ وغیر زراعت پیشہ سکھوں اور دوسری قوموں کی تعداد کتنی ہے؟  
نیز حکومت یہ بھی بتائے کہ ان کلاسوں میں داخلے کے لئے کتنے ہندو جاٹوں نے  
درخواستیں دی تھیں۔ اور ان میں سے کتنے امیدواروں کو لیا گیا ہے؟

چودھری دلی چند؛ ”کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ

(ا) کیا اس وقت انڈین ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ب) کیا اس وقت پبلڈنشل ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ج) اگر جواب اثبات میں ہے تو ان انسروں کی تعداد کتنی ہے؟

(د) اگر جواب نفی میں ہے تو کیا حکومت کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ کرتی

ہے جس سے ان دونوں ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی کمی پوری ہو سکے؟

چودھری چھوٹو رام اور چودھری دلی چند نے اس خیال سے کہ آج حین افغان

سے وزارت کی کرسی لال چند کے قبضہ میں ہے۔ اور ادھر میاں فضل حسین اپنی حکومت

کو سلامت رکھنے کے لئے ہندو جاٹوں کے محتاج ہیں یہ لغو نہ گادیا کہ سبکوں کی

فیس معاف کرنے کا سوال ہو۔ یا کالیموں میں طلبہ کے داخلے کا قضیہ۔ نوآبادیوں

میں مریجے لینے کا مسئلہ ہو یا دلائمتوں میں حقے بخرے کرنے کا معاملہ۔ سندھ جاٹوں کے سوا اور کسی فرقے کے مفاد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ پنجاب میں جاٹوں کے علاوہ اور قومیں بھی آباد تھیں۔ اور ان میں سے ہر قوم آگے بڑھے کہ خوانِ نعمت پر ہاتھ مارنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ چنانچہ جونہی سندھ جاٹوں نے انا دلا غیر (کالغیر) کا نعرہ بلند کیا۔ سندھ را جپوت بھی سینہ تان کر اٹھے۔ اور انہوں نے سندھ را جپوتوں کے حقوق کی تحفظ کی جنگ شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۴ء ہی کے چند مہینوں میں پنجاب کونسل میں حکومت سے جو استفسارات کئے گئے۔ ان کے دو ایک نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں:

چودھری سرام سنگھ:

"کیا ہر بانی نرما کر حکومت بتائے گی کہ ضلع کانگرہ میں کتنے مربع جاٹ اراضی سندھ را جپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟ اگر انہیں کوئی اراضی نہیں دی گئی تو کیا حکومت اس کی وجوہ بیان کر سکتی ہے؟"

چودھری سرام سنگھ:

"کیا ہر بانی کر کے حکومت بتائے گی کہ نہر باری دو آب اور دوسری نہر ہی نو آبادیوں میں کتنے مربع جاٹ اراضی ضلع کانگرہ کے سندھ را جپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟"

چودھری سرام سنگھ:

"(ر) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع ہوشیار پور۔ کانگرہ۔ گوہاڑ پور۔ حصار اور یالکوٹ کے سندھ را جپوتوں کی اقتصادی و مالی حالت روز بروز خراب

ہوتی جا رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کی تعداد سبھی پہلے سے کم ہو گئی ہے؟  
 ”ب) اگر شق ۱ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت مندرجہ ذیل تجاویز کو  
 معرض عمل میں لانے کی کوشش کرے گی؟

۱۔ مذکورہ بالا اضلاع کی تمام سرکاری ملازمتوں میں ہندو راہبوتوں کو  
 زیادہ تعداد میں بھرتی کیا جائے۔

۲۔ مذکورہ بالا اضلاع میں کوآپریٹو انسپیکٹرز اور ذراعتی اسٹنٹ کی سامیوں  
 پر ہندو راہبوتوں کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے ہم قوموں کو اقتصادی مسائل  
 اور ذراعت کے سائنٹیفک طریقوں سے اچھی طرح آگاہ کر سکیں۔“

جب ہندو راہبوت اور ہندو جاٹ بڑھ چڑھ گہرا اپنی اپنی قوم کا حق نمائندگی  
 ادا کر رہے تھے۔ تو مسلمان کیونکر غاموش رہتے۔ چنانچہ جوہنی پچھینا جھپٹی مشرع  
 موہنی۔ چودھری شہاب الدینؒ۔ اور بعض دوسرے لوگ بھی اس میدان میں کود  
 پڑے۔ ان لوگوں نے اپنی بصیرت کو کام میں لاکر۔ حکومت سے جس قسم کے استفسارات  
 کرنا شروع کئے۔ اس کے چند نمونے مشن از خردارے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں  
 چودھری شہاب الدین :

” (۱) کیا ہریانہ کی حکومت بتائے گی کہ علی الترتیب سال ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء  
 اور ۱۹۲۳ء میں اہما و راست فوجی کمیشن کے لئے حکومت نے کتنے آدمیوں کی

---

سال بعد میں سر شہاب الدین بنے۔ اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک پنجاب ایجنٹ کوئل کے صدر اور  
 ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک پنجاب اسمبلی کے سپیکر رہے۔

سفارش کی تھی۔ اور ان اشخاص میں سے جاٹ اور راجپوت کتنے تھے؟  
 ”اب کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ تین سال کے عرصے میں براہِ راست فوجی کمیشن  
 کے لئے کسی راجپوت یا جاٹ کی سفارش نہیں کی گئی؟“  
 ”(ج) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ آئندہ وہ راجپوتوں اور جاٹوں  
 کو براہِ راست فوجی کمیشن بلانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟“

چودھری شہاب الدین :

”ر“ کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ آیا ان سرکاری درس گاہوں میں جو  
 کٹیہ یا بیشتر سبائی خزانے سے چلائی جا رہی ہیں، تعلیم حاصل کرنے کے لئے ازراعت  
 پیشہ اقوام کے طلبہ کو خاص مراعات یا سہولتیں عطا کی جاتی ہیں یا نہیں؟

”ب“ کیا حکومت کے پیش نظر ایسی کوئی سکیم ہے جس سے گورنمنٹ کالجوں میں  
 اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ازراعت پیشہ اقوام کے لڑکوں کو خاص مراعات عطا  
 کی جاسکیں؟

چودھری شہاب الدین :

”کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق پنجاب  
 کے ہائی سکولوں، ٹیل سکولوں اور پرائمری سکولوں میں شہری اور دیہاتی طلبہ کی  
 تعداد کتنی ہے اور ان تمام طلبہ میں ازراعت پیشہ اقوام کے لڑکے کتنے ہیں؟“

چودھری صاحب داد خاں :

”کیا یہ واقعہ ہے کہ حلقہ مشرقی (ایسٹرن ریجن) میں رتھکا درجہ صاف کے نسلخ  
 کے کسی مسلمان راجپوت کو سب انسپکٹر پولیس بھرتی نہیں کیا گیا؟ اگر یہ صحیح ہے



تو کیا حکومت ان اضلاع کے مسلمان راجپوتوں کو بہاؤ راست سب انسپکٹر پولیس  
بھرتی کرنے کی کوئی تدبیر اختیار کرے گی؟

چودھری صاحب دادخاں:

”کیا حکومت بتائے گی کہ اس وقت حلقہ مشرقی (ایسٹرن ریج) میں اضلاع  
حصار ورتھک کے کتنے مسلمان راجپوت انسپکٹریل پولیس کی اسامی پر کام کر رہے ہیں؟

چودھری علی اکبر:

”ہاں کیا یہ واقعہ ہے کہ ضلع گورداسپور کے جاٹوں اور انہوں اور غیر مسلم

راجپوتوں کو نوآبادیات میں اراضی عطا ہوتی ہے؟

”ہاں، اگر شق ۱ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے

گی کہ ضلع گورداسپور کے مسلمان راجپوتوں کو اب تک اراضی کیوں عطا نہیں

کی گئی؟“

محمد سیف اللہ خاں:

”کیا ہر بانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں زراعت پیشہ

اقوام کے کتنے آدمیوں کو ضلع میاوالی کے ہسپتالوں میں کیاؤنڈر اور ڈیکینیئر

کی اسامیاں عطا کی گئی ہیں؟“

میاں فضل حسین نے تو ۱۹۲۲ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ گورنمنٹ کالج اور

میڈیکل کالج میں چالیس فیصد مسلمان داخل کئے جائیں گے اور سرکاری ملازمتوں

میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نمائندگی حاصل ہوگی۔ لیکن اب چاروں طرف یہ شور

اٹھنے لگا تھا کہ اس چالیس فیصد نیابت میں جاٹوں کا کتنا حصہ ہے اور راجپوتوں

کا تناسب کتنا ہوگا۔ گوجروں کے پلے کیا پڑے گا۔ اور گکھڑوں کو کیا عطا ہوگا۔  
 زراعت پیشہ لوگوں کے حقے میں کیا آئے گا اور دیہاتیوں کو کیا ملے گا۔

یونینسٹ پارٹی کے درخت کا یہ پہلا سچل تھا۔ جس کی سمیت نے آگے چل کر  
 پوری قوم میں تشقت و افتراق اور بے اعتمادی و بدگمانی کا ایسا زہر سچایا دیا۔ جس  
 کا تریاق رُبح صدی کی جدوجہد کے بعد سچی حاصل نہ ہو سکا۔ ستم یہ ہے کہ یہ سب  
 کچھ میاں فضل حسین کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ جنہوں نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں  
 ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سرٹامیکل ادوڈاٹر کی پالیسی پر سب سے  
 بڑا اعتراض یہ کیا تھا۔ کہ اُس نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا  
 کر کے صوبے کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ جنہوں نے سن ۱۹۲۰ء میں  
 چودھری لال چند کی تجاویز کی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ ان تجویزوں پر  
 عمل کرنے سے صوبے کی تعلیم یافتہ آبادی پر دیہاتیوں کا ناروا تفوق قائم ہو جانے  
 کا اندیشہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میاں فضل حسین نے حریفوں کے حملوں سے بچنے کے  
 لئے اپنے گرد جو حصار بنا لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک زنداں کی صورت  
 اختیار کرنے لگا تھا اور اہل نظر محسوس کر رہے تھے کہ چند سال میں میاں  
 فضل حسین اس زنداں میں ایک قیدی کی حیثیت اختیار کریں گے۔

اس مسموم فننا کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری اور دیہاتی طبقوں کے درمیان دو زبرد  
 بد اعتمادی بڑھنے لگی۔ دیہاتی سمجھتے تھے کہ صوبے کے محاسل میں شہریوں کا  
 حق کم ہے۔ لیکن وہ فائدہ زیادہ اٹھا رہے ہیں۔ شہری مسلمان یہ کہتے تھے کہ  
 ایک طرف تو وہ قانون انتقال اراضی کی پابندیوں کی وجہ سے زمینداری نہیں کر سکتے

دوسری طرف تجارت اور صنعت و حرفت پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اس لئے ان کی معاش کا دارومدار لے دے کے سرکاری ملازمت ہی پر ہے۔ اب ملازمتوں کے ہٹارے میں بھی دیہاتی و شہری۔ زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ۔ زمیندار و غیر زمیندار کا سوال پیدا کر کے ان کے لئے روزگار کی تمام راہیں بند کی جا رہی ہیں یہ قبائلی تفریق اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنی خطرناک تھی کہ آگ کی مانند ہوا کے ایک ہی جھونکے سے اس کے شعلے دور دور تک پہنچنے لگے۔

پنجاب کونسل میں شہری مسلمان صرف پانچ تھے۔ ظاہر ہے پورے ایوان میں ان پانچ ممبروں کی آواز کیا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ تاہم یہ لوگ قومی اتحاد کو قائم رکھنے کی غرض سے یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ چودھری شہاب الدین ایسا شخص بھی جس کی تمام عمر لاہور میں بسر ہوئی تھی۔ اور جولاہور کے شہری مسلمانوں کے ووٹ سے میونسپل کمیٹی کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اس روم میں بے تکلف بہ گیا ہے۔ اور اب جاٹ اور راجپوت کی قبائلی تقسیم۔ اور شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تفریق کھڑی کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ تو انہوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس دبا کی روک تھام کا بظاہر ان کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ جو نہی موقع ملا۔ انہوں نے شدت سے اس عصبیت کے خلاف آواز بلند کی۔

نومبر ۱۹۲۲ء میں جب کونسل میں پنجاب اسٹامپ بل کی ترمیم پیش ہوئی تو شہری اور دیہاتی رقابت نے، اس جذبہ عناد کا جام تک سینوں میں پرورش

پانا آرام کھلے بندوں مظاہرہ کیا۔ چودھری شہاب الدین نے شہری ممبروں کو  
 براڈ کاسٹ کر کہا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شہری باشندے کون کون سے ٹیکس  
 ادا کر رہے ہیں؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ سوائے انکم ٹیکس کے اور کسی قسم  
 کا ٹیکس نہیں دیتے۔ جب فوج میں بھرتی ہوتے کا سوال آتا ہے تو شہری نہیں  
 بلکہ دیہاتی لوگوں کو رننگروٹ بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے لوگ  
 میونسپل کمیٹی کو کچھ ٹیکس ضرور ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ٹیکس سرسراؤن کی  
 ذاتی سہولت اور آرام کے لئے ہے۔ جناب والا! میں یہ عرض کئے بغیر نہیں  
 رہ سکتا کہ سو بے کے سرکاری محاصل میں زیادہ رقم گلاؤں کے باشندوں کی  
 جیب سے نکلتی ہے۔ شہر والوں کی ہمایوں سے نہیں آتی۔"

ملکسائیر وزخاں لوزن نے فرمایا: "میں شہری باشندوں سے پوچھتا ہوں کہ  
 کیا ان کے لئے جائز ہے کہ اس ٹیکس کی مخالفت کر کے اس رقم کا بوجھ بھی دیہاتی  
 آبادی کے کندھوں پر پھینک دیں؟ مجھے امید ہے کہ اس ایوان کے شہری ممبر  
 فرض شناسی کا ثبوت دیں گے۔ اور اس ٹیکس کو دیہاتیوں کے سر پر ڈالنے  
 کی کوشش نہیں کریں گے۔"

شیخ محمد صادق پیرسٹریٹ لار۔ جو امرتسر کے شہری حلقے سے منتخب ہو کر  
 آئے تھے۔ یونینمٹ پارٹی میں شامل تھے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شہری اور  
 دیہاتی کی تفریق ایک ایسی دودھاری تلوار ہے۔ جس سے اگر ہندوؤں کو نقصان  
 پہنچنے کا امکان ہے۔ تو خود مسلمانوں کے سینے پر بھی اس سے گہرا زخم لگ جانے  
 کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے اس ردش کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جناب والا! اس ایوان میں پہلے ہی سے کافی اختلاف موجود ہے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسالوں کا جھجکاؤ چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف کانگریوں اور غیر کانگریوں کا قضیہ جاری ہے۔ اب شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک اور پناہ فساد قائم کی جا رہی ہے۔ جو لوگ دیہاتیوں کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں۔ انہوں نے آبیانے میں تخفیف کر کے اپنے دیہاتی بھائیوں کے بوجھ کو تو کم کر دیا ہے۔ لیکن اب انہی کی کوشش سے شہریوں پر اسٹامپ ڈیوٹی نافذ کی جا رہی ہے۔ کیا دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود حاصل کرنے کا یہی ڈھنگ ہے؟ اور کیا آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محض اس لئے مسکراتے رہیں گے۔ کہ چلو چھٹی سوئی۔ یہ چھ لاکھ کی رقم تو مشہریوں کی جیب پر پڑ گئی ہے۔"

مولوی منظر علی اظہر خلافتی تھے۔ ماور پنجاب کے مشرقی و مغربی شہروں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے سبھی اس روش کے خلاف آواز بلند کی۔ اور فرمایا: "ہمیں اس سوال پر محض شہری اور دیہاتی نقطہ نگاہ سے غور نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ مجموعی طور سے صوبے کی پوری آبادی پر کیا اثر پڑے گا اگر آپ نے غور و فکر کا یہ انداز اختیار نہ کیا۔ تو وہ خلیج جو ہندو مسلم نزاع۔ اور زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ کی باہمی چپقلش نے پہلے ہی کافی وسیع کر رکھی ہے اب اس میں شہری دیہاتی تفریق سے اگے اختلاف کا اضافہ ہو جائے گا ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے کی آبادی کا ہر طبقہ، حریفانہ جذبے سے متاثر ہو کر، اس بات کی کوشش کرے گا۔ کہ ٹکیوں کا بوجھ خود اس پر نہیں بلکہ دوسرے طبقے پر پڑے۔ اور یوں آہستہ آہستہ روز بروز ٹکیوں میں

اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا۔“

اس قسم کی چند متفرق آوازوں کے باوجود شہریوں اور دیہاتیوں کا باہمی اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔ شہری مسلمان ایک عجیب منحصرے میں گرفتار تھے اگر وہ یونینسٹ پارٹی کو چھوڑ دیتے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے کونسل میں مسلمانوں کے سزاوار اعظم سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ انقطاع انہیں گوارا نہیں تھا۔ کونسل کے باہر صوبہ کی آبادی میں بھی اس نزاع کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ملازمتوں میں اگر براہ راست تقریباً نامزدگی کا سوال آتا تھا تو ایک ایم۔ اے پاس شہری مسلمان پر ایک ایسے دیہاتی مسلمان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو محض میٹرک یا ایف۔ اے تک تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

مثلاً اگر مقابلے کے امتحان کے ذریعہ سے پرائیمنٹ سول سروس کی دس اسامیوں کو پُر کرنے کا موقع آتا تھا۔ تو حکومت اعلان کر دیتی تھی کہ ان دس اسامیوں میں سے چار اسامیاں مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اور جب امتحان کا نتیجہ نکلتا تھا۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں جو سب سے پہلے دس امیدوار ہیں۔ ان میں صرف دو مسلمان آئے ہیں۔ اس صورت میں بقیہ دو اسامیوں کو پُر کرنے کے لئے حکومت اپنے اختیارِ خاص سے نامزدگی کا طریقہ اختیار کرتی تھی۔ قاعدے کی رُو سے چاہیے تو یہ تھا کہ کامیاب امیدواروں میں سب سے فہرست جن دس امیدواروں کے نام تھے۔ ان کے معاً بعد علی الترتیب جن دو مسلمانوں کا نمبر تھا انہیں نامزد کر دیا جاتا۔ تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے

پاتی۔ لیکن حکومت اس قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر۔ محض اپنی خوشنودی اور  
صوابدید سے ایسے لوگوں کو نامزد کر دیتی تھی۔ جو تعلیمی قابلیت میں پست ہونے  
کے باوجود بعض مصلحتوں کی وجہ سے حکومت کے منظور نظر ہوتے تھے۔ اس  
طرز عمل کا ایک بڑا لیکن بے حد تلخ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں  
کا ایسا عنصر داخل ہونا شروع ہو گیا جو منہ و اہل کاروں کے مقابلہ میں بے استعداد  
کم سواد اور نا اہل تھا۔ انجام کار اس کا تیارہ پوری قوم کو جھگڈنا پڑا۔ اور انبار  
سے قوم کی قوم پر نالائقی کا الزام تھوپ دینے سے دریغ نہ کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پنجاب کونسل، اپنی مذموم کارروائی سے،  
صوبے کی پوری آبادی کو شہری اور دیہاتی۔ جاٹ اور راجپوت۔ زراعت  
پیشہ اور غیر زراعت پیشہ حصوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی قومی وحدت کو  
پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ تو مسلمانوں کے صاحب الرائے  
سیاسی لیڈروں کا طرز عمل کیا تھا؟ کیا یہ سیاسی لیڈر، جو اکثر و بیشتر  
شہری آبادی سے تعلق رکھتے تھے، رد عمل کا شکار ہو کر شہری مسلمانوں کی پشت  
و پناہ بن گئے تھے؟ اور کیا وہ دیہاتیوں کے حریف کی حیثیت سے ان کی خدان  
صفا آراہ ہونا جائز سمجھتے تھے؟ یا ان کی نظریں ان مصنوعی حد بندیوں سے  
بلند ہو کر قوم کی مجموعی حالت کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے یہاں صرف دو مثالیں پیش کر دینا کافی  
ہوگا۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کے آخری ہفتے میں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا خلافت  
 کمیٹی کے سالانہ اجلاس بلگام (عاطلہ بھٹی) میں ہوئے۔ کانگریس کے صدر

ہاتما گاندھی اور خلافت کے صدر ڈاکٹر سیف الدین گچلو تھے۔ ڈاکٹر گچلو نے  
خلافت کانفرنس کے پنڈال میں جہاں ہاتما گاندھی۔ سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت  
موتی لال نہرو۔ لالہ لاجپت رائے اور دلہہ بھائی پیشہ کے پائے کے لوگ موجود  
تھے۔ اپنے خطبہ صدارت میں علی الاعلان فرمایا:

”..... جہاں تک سیاست کا تعلق ہے۔ میں ذاتی طور پر میاں  
فضل حسین کی اس روش کو سرگرم پسند نہیں کرتا۔ کہ اسٹھوں سے  
حکومت سے تعاون کر کے ترکہ موات کے قومی پروگرام کی خلافت  
زندگی کی ہے۔ با اس ہمہ مجھے اس مجمع کے رُزبُرد یہ اعلان کر دینے  
میں قطعاً کوئی تامل نہیں۔ کہ میاں فضل حسین اس کے سوا اور  
کوئی قصود نہیں۔ کہ وہ مسلمانوں سے کسی قدر انصاف کی توقع کرتے  
ہیں۔ مسٹری۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر جنتا منی  
اور آخر کار ہاتما گاندھی ایسے بلند پایہ لیڈر میاں فضل حسین کے  
کام کا بغور جائزہ لے چکے ہیں اور ان سب کی متفقہ رائے ہے کہ  
فضل حسین کی پالیسی حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں  
میاں صاحب کے خلاف پنجاب کے ہندوؤں نے جو شور و غوغا مچا  
کر رکھا ہے وہ بالکل نامناسب اور خود غرضانہ ہے۔ گذشتہ الیکشن  
کے بعد پنجاب میں جو سوراج پارٹی بنی تھی۔ اس نے اپنے عمل  
سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ سراسر ایک ہندو پارٹی ہے۔ پنجاب  
کی مصیبتوں کا اصل سبب اقتصادی ہے۔ کیونکہ ایک طرف



صوبے کی ساری تجارت پر ہندوؤں کا اجارہ ہے۔ اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کی بیشتر تعداد بھی انہی کے قبضہ میں ہے۔“

جون ۱۹۳۷ء میں حکومت ہند نے اس امر کا محاکمہ کرنے کے لئے کہ صوبوں میں دو عملی حکومت کیونکر کام کر رہی ہے۔ اس نظام میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا بُرائیاں ہیں۔ اصلاحات کی دوسری قسط صوبوں کو ملنی چاہیے یا نہیں وزیر اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ جس کے صدر حکومت ہند کے ہوم ممبر سر الگزنڈر ڈی مین تھے۔ ممبروں میں سر محمد شفیع۔ مسٹر جناح۔ سر بیج بہادر سپرو۔ بہار اہم بردوان۔ ڈاکٹر پرنبھے۔ سر آر تھرفروم وغیرہ شامل تھے۔ اس کمیٹی کے اجلاس ہندوستان کے ہر صوبے میں ہوئے۔ ادرائے عامہ کی ترجمانی کرنے والے ذمہ دار افراد نے کمیٹی کے روبرو پیش ہو کر شہادتیں دیں۔ مثلاً بنگال سے مولوی فضل الحق۔ سر عبدالرحیم ادنی۔ سی بیٹر۔ بمبئی سے پرشوتم داس سٹھاکر داس اور سر پین لال ستیلواڈ۔ صوبجات متوسط سے مسٹر کیلکر۔ یو۔ پی سے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور مسٹر حنیامنی۔ پنجاب سے لالہ ہرکشن لال اور ملک برکت علی پیش ہوئے۔

حکومت ہند کے رجعت پسند عنصر کی خواہش تھی کہ صوبائی حکومتوں کی کمزوری اور خانہ جنگی کو ایسے مبالغہ آمیز طریقے سے بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے

جس سے صوبوں کے وزیر لا محالہ نا اہل اور بے تدبیر ثابت ہوں۔ تاکہ برطانوی حکومت اصلاحات کی نئی قسط دیتے سے انکار کر دے۔ پنجاب میں ہندوؤں نے یہی روش اختیار کی تاکہ میاں فضل حسین کو زیادہ سے زیادہ بدنام کیا جا سکے۔ لالہ ہرکشن لال نے اپنی شہادت میں فضل حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی شہری اور دیہاتی کی باہمی چپقلش اور فرقہ دارانہ انتخاب کی سخت مذمت کی لیکن جب ملک برکت علی پیش ہوئے تو انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے جن باتوں پر زور دیا۔ وہ یہ تھیں۔

۱۔ پنجاب میں دو عملی حکومت کا نظام بہ صورت کامیاب رہا ہے اور وزیروں نے اپنی کارگزاری سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری نبھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

۲۔ ہندو مسلم نزاع ایک عارضی چیز ہے۔ جب صوبائی خود مختاری ریپبلش (ٹاموٹی) مل گئی تو دونوں قوموں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائیگا اور وہ آپس کے جھگڑوں کو نمٹا کر بار حکومت اٹھانے پر تیار ہو جائیں گی۔

۳۔ مسلم لیگ گورنر کے اختیارات ختم دہی پر قانونی پابندیاں عائد کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتی ہے کہ اس دہم کی دستوری روایات قائم کر دی جائیں۔ جن کے تحت گورنر ان زیروں کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرنے پائے۔ ہاں اگر وزیروں کو مجلس قانون ساز کا اعتماد نہیں ہے۔ تو گورنر ان کی رائے پر عمل کرنے کا بھی

مجاز نہیں ہوگا۔ بلکہ اس صورت میں تو اس کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مجلس قانون ساز کو توڑ کرنے انتخابات کرائے۔

۴:- مسلم لیگ اس بات کی شدت سے حامی ہے کہ اگر صوبوں میں حکومت خود اختیاری کا نظام رائج کیا گیا۔ تو اس کے ساتھ ہی مرکز میں بھی ذمہ دارانہ حکومت قائم کر دینی چاہیے۔

۵:- مسلم لیگ اس کی رائے ہے کہ وزیر ہند (لندن) کی کونسل کو توڑ دیا جائے

۶:- اصلاحات کی جو قسط آئندہ عطا ہوگی اس میں تمام ٹکٹے وزیروں کے

سپر و کر دینے چاہئیں۔ کونسل میں سرکاری بلاک کو ختم کر دیا جائے۔

پارلیمنٹری انڈر سکرٹری متبرکے جائیں اور چھوٹی بڑی تمام ملازمتوں کو

ذرائع کی منتقلی میں دے دیا جائے۔

۶:- مسلمان اصلاحات کی ایسی کسی سیکم کو سرگز قبول نہیں کریں گے جس

میں مفعولہ ذیل امور کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو:

۱:- صوبے کی موجودہ حدود میں ایسا کوئی رد و بدل نہ کیا جائے جس

سے پنجاب - بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں

کی اکثریت کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہو۔

ب:- جداگانہ انتخاب پر قرار رکھا جائے۔

ج:- مذہبی عبادات درسوم ادا کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے

ح:- شمال مغربی سرحدی صوبے میں ذمہ دارانہ حکومت قائم

کی جائے۔

جب ملک ہرکت علی سے، دورانِ شہادت میں، یہ سوال کیا گیا کہ "کیا لالہ ہرکشن لال اور میاں فضل حسین کے تعلقات کشیدہ تھے؟"

گو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ قطعاً غلط ہے۔ لالہ ہرکشن لال تین سال تک فضل حسین کے ٹریک کارر ہے۔ اور اس ترجمے میں انہوں نے ایک بار بھی اُن کی پالیسی سے اختلاف نہیں کیا۔ وزارت قبول کرنے سے پہلے پر دونوں کانگریس میں اکٹھے کام کرتے تھے"۔

حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی پیدا کی ہوئی قبائلی عصبیت کا زہر پھیل جانے اور مسلمانوں میں شہری دیہاتی کی دیوار کھڑی ہو جانے کے باوجود میاں فضل حسین کے پرانے رفقائے کار اب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ انہیں اب بھی اعتماد تھا کہ فضل حسین سے بہتر آدمی ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ انہیں یقین تھا کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کا تعلق جن امور سے ہے وہ جاٹوں اور اچھوتوں کے بٹوارے، یا زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ طبقوں کی یاہمی رفاہیت سے کہیں بالاتر ہیں۔ اور انہی امور کو اغیار کی دستبرد سے بچانا ان کا سب سے بڑا قومی فرض تھا۔ پنجاب کے تمام اسلامی اخبار اور اسلامی ادارے فضل حسین کی پشت پر تھے۔ مسلمانوں کی اسی غیر مشروط حمایت کی بنا پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے فضل حسین کو صدارت کا اعزاز بخشا:

۱۔ انڈین ایڈول رجسٹر (۱۹۲۲ء) جلد ۲ - شمارہ ۲۲

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

## تجاویز دہلی

شہری سہروؤں کی کوشش سے چودہری ال چند کے خلاف جو انتخابی سہرواری دائرہ کی گئی تھی۔ وہ منظور ہو گئی اور ال چند کو نہ صرف وزارت بلکہ کونسل کی کیفیت سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن یہ واقعہ میاں فضل حسین کی پالیسی پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکا۔ انہوں نے گورنر سے کہہ کر نومبر ۱۹۲۲ء میں چودہری چھوٹو رام کو وزارت کے منصب پر فائز کر دیا۔ چودہری چھوٹو رام ضلع رشتک کے ہندو جوڑا تھے اور رشتک ہی میں ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ وکیل بننے سے پہلے وہ پبلک پراسیکیوٹر کی اسامی کے لئے کوشاں تھے۔ چودہری چھوٹو رام شہری دیہاتی تفریق کے بہت بڑے حامی ہونے کے علاوہ بڑے صاف گو آدمی تھے۔ ان کی صاف گوئی بعض وقتوں تلخ کلامی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک بھی پہنچ جاتی تھی۔

جون ۱۹۲۲ء میں سر ایڈورڈ میک لگن اپنی بیعاد پوری کر کے چلے گئے تو ان کی جگہ پنجاب کے نئے گورنر سر میکم ہیلی تشریف لائے۔ میکم ہیلی اپنے پیشرو سے

مختلف آدمی تھے۔ وہ بڑے ٹھٹھے اور رعب داب کے حاکم تھے۔ اور وہ کر رہنا نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ابتداء میں میاں فضل حسین سے تعرض نہیں کیا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد انہوں نے فضل حسین کو پنجاب کا ریونیو ممبر بنا دیا اور جب جنوری ۱۹۲۶ء میں نئی کونسل مرتب ہوئی۔ تو وزارت کی ترتیب میں رد و بدل کر کے مسلمانوں میں سے ملک فیروز خاں نون۔ سندھوں میں سے مسٹر منوہر لال اور سکھوں میں سے سروار جو گندر سنگھ کو لے لیا۔ منوہر لال شہری سندھوں کے نمائندے تھے۔ جو گندر سنگھ سکھوں کی نمائندگی کے دعویدار تھے لیکن بظاہر کونسل کے سکھ ممبروں کی اکثریت ان کی پشت پر نہیں تھی۔ فیروز خاں نون کو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان عنصر کے نمائندے کی حیثیت سے لیا گیا تھا۔ وزارت کی تشکیل کرتے وقت میلکم ہیلی کی پلیسی کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ یعنی "سرکاری بلاک" ان کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جب اور جہاں چاہتے اس بلاک کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے۔ اب یونینسٹ پارٹی کی قیادت چودہری چھوٹو رام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ چھوٹو رام کو وزارت سے محروم ہو جانے کا یقیناً رنج تھا اور وہ اس محرومی کی وجہ سے سراسر سمجھتے تھے کہ گورنر نے شہری سندھوں کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر۔ وزارت کا منصب ان سے چھین کر ایک شہری سندھ کے حوالے کر دیا ہے۔

میلکم ہیلی کے اس فعل کو خواہ مخواہ رنگ میں دیکھا جائے یا اس پر ہم ردائے نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے، ایک بات بہر صورت واضح ہو جاتی ہے

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

وہ یہ کہ سزا کی اصلاحات کے تحت صوبائی وزارت کا بینہ کے اصولوں پر ترتیب نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ وزیروں کا تقریریں گورنر کے ایما اور مصلحت سے ہوتا تھا۔ میکس ویلی نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ پنجاب کے ہندوؤں کا طاقتور، دولت مند، ذمی اثر اور بلند آہنگ عنصر چھوٹو رام کو اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس بنا پر انہوں نے ہندوؤں کے ستھری طبقے کے ایک شخص کو وزارت بخش دی۔ اگر اس طریق کار کو تسلیم کر لیا جائے کہ دہلیوں کی ترتیب و تشکیل فرقہ وارانہ اصول پر ہوتی تھی۔ تو میکس ویلی کا طرز عمل قابل اعتراض نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہندو اور مسلمان ممبروں کا نہ نیابت کے تحت منتخب ہو کر کونسل میں آئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کی اکثریت کو، آئینی نہ سہی، اخلاقی، حق حاصل تھا کہ وہ ایسے شخص کو وزارت کے منصب پر مقرر نہ ہونے دے۔ جو اُس کے سیاسی عقائد کی ترجمانی نہیں کر سکتا تھا۔

ریونیو ممبر بن جانے کے بعد اگرچہ میاں فضل حق کا یونینسٹ پارٹی سے کوئی آئینی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ اس جماعت کی فلاح و بہبود اور اُس کے مستقبل سے کبھی غافل نہ ہوئے تھے۔ باضابطہ نہ سہی بے ضابطہ، اُن سے پارٹی کے ہر کام میں مشورہ لیا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ چودھری چھوٹو رام اور ملک فیروز خاں نون بلکہ سبھی اُس خلا کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ جو فضل حسین کے بیکل جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ چودھری شہاب الدین کونسل کے صدر بن چکے تھے۔ لیکن اُن کے اور فیروز خاں نون کے تعلقات کشیدہ تھے۔ چودھری صاحب خود وزارت کے خواہاں تھے لیکن فضل حسین کی



کوشش سے یہ اعزاز فیروز خاں لون کے حصے میں آ گیا تھا۔ چودھری چھو لٹورام جس یونینسٹ پارٹی کی قیادت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اُس کے پچانوے فیصد ممبر مسلمان تھے۔ چھو لٹورام کو اپنی اس بنیادی کمزوری بلکہ مفحکہ انگریز حیثیت کا بخوبی احساس تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتے تھے۔ اس دُکھ کا مداوا خود اُن کے پاس کبھی نہیں تھا۔ راجہ نرندر ناتھ کی سندھو پارٹی جو اب نیشنل پروگریسو پارٹی کے بلند بانگ نام سے پکاری جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری چھو لٹورام کے سندھو فقار ایک ایک کر کے یونینسٹ پارٹی سے کٹ کر نیشنل پروگریسو پارٹی میں شریک ہونا شروع ہوئے۔ چھو لٹورام شہری اور وہیاتی تفریق کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اس لئے وہ اپنی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے صرف ایک تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ یعنی موقع ہویا نہ ہو۔ وہ بے دریغ شہری طبقے پر برسنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے عزم و عفتہ کا اولین ہدف شہری سندھوؤں کا وہ طبقہ تھا جس نے اُن کو ذلت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی آتش بیانی پر اترتے تو سندھو مسلمان کی کوئی تیز روانہ رکھتے۔ اور پنجاب کی ساری شہری آبادی کو ایک لاشی سے ہانکتے چلے جاتے تھے۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو پنجاب کونسل میں بحث پر تقریر کرتے ہوئے

چودھری چھو لٹورام نے فرمایا:

..... اس ایوان کے شہری ممبر آئے دن میری سرگرمیوں اور

میرے سیاسی عقائد کا تمخراڑا تے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ طرز عمل مجھے

تاریخ ہند کے ایک مشہور واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ وہ واقعہ نادر شاہ کا حملہ ہے۔ جو ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر ہوا تھا۔ نادر شاہ دکن کی سرحدوں کو عبور کر کے۔ پنجاب کے میدانون کو روند کر۔ آندھی کی طرح مغلیہ حکومت کے دارالسلطنت دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا محمد شاہ کو اس حادثہ کی اطلاعیں برابر پہنچ رہی تھیں۔ لیکن اسی عیش پرست مشہنشاہ نے اس سارے واقعہ کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ نادر کو نال پہنچے گیا۔ جہاں سے اُس نے بادشاہ دہلی کو آخری خط لکھا۔ اور چند شرائط پیش کیں جن کو اگر قبول کر لیا جاتا تو کسی قسم کی خونریزی نہ ہونے پائی لیکن محمد شاہ نے اس خط کو بھی ایک مذاق یا لطیفہ تصور کیا۔ اور عالم سرخوشی میں کاغذ کے اُس ٹکڑے کو یہ کہہ کر شراب کے پیالہ میں پھینک دیا کہ : ع۔

این دفتر بے معنی غرقِ مینابِ ادلے

میں اپنے حریفوں، مخالفوں اور معترضوں سے یہ کہتا پر مجبور ہوں کہ وہ ان ہوناک نتائج پر ضرور غور کریں جو محمد شاہ کے مٹھکے چیز طرزِ عمل سے پیدا ہوئے تھے۔ دیہاتیوں کے جائز مطالبات کا تمسخر اڑا کر میرے مخالفین بھی وہی خطرہ مول لے رہے ہیں۔ جو محمد شاہ پر ایک عذاب بن کر نازل ہوا تھا۔ وہی دن کے اندر محمد شاہ کے ہوش بھوس درست ہو گئے تھے۔ اور اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ نہ تو نادر شاہ کی

بلغار کوئی ہنسی مذاق سستی۔ اور نہ ان کا تہدیداً مینر خط ہی کوئی لطیفہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ایوان کے شہری ممبر جو دولت اور دولت سے پیدا ہونے والے پیار کے نشے سے بدست ہیں (ایک آواز، تمام شہری بدست نہیں ہیں) آپ کی اس اصلاح کا شکریہ! ان بچوں پر بیٹھنے والے (بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) لوگ جو زیادہ تر شہری مفاد کی نماندگی کرتے ہیں۔ جنہیں اپنی دولت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ اور جو اپنی اعلیٰ تنظیم و تعلیم کے نشے میں سرشار ہیں دیہاتیوں اور زمینداروں کے مطالبات کو ایک مذاق سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ممکن ہے کچھ مدت کے لئے وہ اپنی اس خیالی دنیا میں غافل و بے ہوش رہیں۔ لیکن وہ گھڑی آنے والی ہے جب دیہاتیوں اور زمینداروں کی تحریک پوری قوت سے اٹھے گی۔ اور اپنی بلغار میں ان لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گی۔ قبل اس کے کہ وہ گھڑی آئے۔ میں ان لوگوں کو ان کے انجام پر مستنبہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

کونسل کے وہ دو چار مسلمان ممبر جو شہری حلقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ سب کچھ سنتے اور دیکھتے تھے۔ لیکن قوم کے وسیع مفاد کے پیش نظر خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ انہیں یہی اندیشہ تھا۔ کہ اگر انہوں نے بھی زبان کھولی۔ تو مسلمانوں میں خانہ جنگی کی ایک نئی بنیاد گھڑی ہو جائے گی۔ چودھری چھوٹو رہے جب پے در پے اپنی آتش بیانی کے جوہر دکھانا شروع کئے۔ اور دائیں بائیں دُ

آگے پیچھے سے صوبے کی شہری آبادی کو اپنی دشنام طرازی کی لپیٹ میں لے لیا۔ تو شیخ  
دین محمد نے مجبور ہو کر اپنی ایک تقریر میں کونسل کے مسلمان شہری نمائندوں کی حیثیت  
کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

..... ہماری بد قسمتی ہے کہ اس ایوان میں ہر موضوع پر بحث کرتے ہوئے  
شہری اور دیہاتی کی تیز پیدا کردی جاتی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنے ہیں ہرگز  
کوئی تامل یا تکلف نہیں کہ شہریوں کے اور دیہاتیوں کے باہمی مفاد  
ہیں قطعاً کسی قسم کا تضاد یا عداوت نہیں ہے (نعرہ ہائے تحسین) اگر بعض  
خود غرض لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک دوسرے  
سے جدا جدا اور الگ الگ ہیں۔ تو میں اس خیال کی تردید کرنا اپنا  
فرض سمجھتا ہوں۔ دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کرنے والے لوگ جو  
چاہیں سمجھیں، اور جو نقطہ نگاہ چاہیں پسند کریں۔ انہیں اس بات کا  
اختیار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک ہی قسم کے  
توانین کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دونوں پر ایک ہی قسم کی پابندیاں  
عائد ہوتی ہیں۔ اور دونوں ایک ہی قسم کی مجبوریوں اور مصیبتوں سے  
پریشان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تہذیب جدید کے جملہ فوائد سے

۱۰ شیخ دین محمد اس زمانہ میں گوجرانوالہ میں پریکٹس کرتے تھے۔ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج  
بنے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں بونڈری کمیشن کے ممبر بنے۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ کے گورنر ہوئے  
تھے۔ بعد میں حالات کشمیر میں حکومت پاکستان کے مشیر ہو گئے تھے۔

شہری باشندوں نے نسبتاً جلد متحمت ہونا شروع کر دیا تھا اور یہ فوائد  
دیہاتی آبادی تک دیر میں پہنچے ہیں۔

"جناب والا! اس ایوان کے اُن تمام ممبروں نے جو شہری حلقوں کی نمائندگی  
کرتے ہیں۔ کم از کم اُن شہری ممبروں نے جو ایوان کی اس سمت بیٹھے ہیں  
قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک دیہاتیوں کے مفاد کی پوری  
نگہداشت نہ ہو جائے گی۔ وہ اپنے ذاتی مفاد و آرام کو ترک کرنے رکھیں  
گے۔ ہم جانتے ہیں کہ دیہاتیوں کی ترقی میں ہماری ترقی کا راز منفرستہ  
اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب تک دیہاتیوں کے مصائب رفع نہیں  
ہوں گے۔ ملک کو نجات نہیں ہو سکتی۔"

شیخ دین محمد عزیز زراعت پیشہ تھے۔ شہری حلقے سے منتخب ہو کر آئے تھے اور یو۔  
پارٹی کے ممبر تھے۔ جو کچھ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا۔ اُس کے ایک ایک نکتے پنجاب  
کے مسلمان اعلیٰ پائے شہری آبادی کو اتفاق تھا۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب کے  
مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق شدت سے زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس  
تفریق کا سب سے بڑا اثر اُن شہری مسلمانوں پر پڑا۔ جو تعلیم حاصل کرنے کے  
بعد محض اس لئے مکے مکے پھرتے تھے کہ اُن کا خاندان تالون انتقال اراضی  
کے تحت زراعت پیشہ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اور نہ اُن کی پشت پر کسی بڑے زمیندار  
کی سفارش تھی۔ جب ملازمتوں کے بڑا حصہ میں بھی جاٹ، راجپوت، اعران اور  
گکھڑ کی تمیز دار کہی جانے لگی۔ اور وزراء سے آئے دن اس موضوع پر جواب  
طلب کئے جانے لگے۔ تو اس بدلے ہوئے ماحول میں محض اول درجہ کی تعلیمی سند کو

کامیابی کا پروانہ سمجھ لینا حاققت سستی چنانچہ ۱۹۲۸ء میں سروراء جو گندرسنگھ نے اپنے محکمے کے جو اعداد و شمار پیش کئے ان میں ملازمتوں کا تناسب یہ تھا :-

پرادنشل ایگریکلچرل سرورس میں کل چودہ مسلمان تھے۔ جن میں سے تیرہ  
زراعت پیشہ دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھا۔  
ایگریکلچرل اسٹنٹ کی چونسٹھ اسامیاں مسالوں کے پاس تھیں  
جن میں سے تیرہ زراعت پیشہ دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری  
مسلمان تھا۔

پرادنشل ڈیڑنیری سرورس میں کل وس مسلمان تھے۔ جن میں سے آٹھ  
زراعت پیشہ دیہاتی اور دو غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھے۔

اس کے برعکس انہی ملازمتوں میں سندوؤں کا تناسب حسب ذیل تھا :-  
پرادنشل ایگریکلچرل سرورس میں کل گیارہ سندو تھے۔ جن میں سے چار  
زراعت پیشہ دیہاتی اور سات غیر زراعت پیشہ شہری سندو تھے۔  
ایگریکلچرل اسٹنٹ کی چھپن اسامیاں سندوؤں کے پاس تھیں  
جن میں سے انیس زراعت پیشہ دیہاتی اور سات غیر زراعت پیشہ  
شہری سندو تھے۔

پرادنشل ڈیڑنیری سرورس میں کل پانچ اسامیاں سندوؤں کے پاس  
تھیں اور یہ پانچوں غیر زراعت پیشہ شہری سندو تھے۔

تجارت، صنعت و حرفت اور کاروبار میں شہری مسلمانوں کی قدامت کوئی  
حیثیت نہیں سکتی۔ یہ تمام پیشے کلیتہً سندوؤں کے قبضے میں تھے۔ بیمہ کمپنیوں، بنکوں

اور در آمد پر آمد کے اداروں میں مسلمان ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ کاشتکاری اور زمینداری کے دروازے بھی شہری مسلمانوں پر بند ہو چکے تھے۔ ان حالات نامساوی میں لے دے کے صرف سرکاری ملازمت رہ گئی تھی۔ جس سے شہریوں کے تعلیم یافتہ مسلمان روٹی کما سکتے تھے۔ لیکن یہاں یونیورسٹی پارٹی نے ان کے راستے میں ایک سنگین دیوار کھڑی کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ شہری مسلمانوں میں بے کاری بڑھنے لگی۔ اور روز افزوں بے کاری کے ساتھ اضطراب۔ انتشار اور پریشانی میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا۔

عین اُس وقت جب پنجاب میں شہری اور دیہاتی کی تفریق آہستہ آہستہ اپنے نقطہ عروج کی طرف جا رہی تھی۔ ہندوستان کی سیاسیات میں ایک ایسا انقلاب آیا تھا۔ جس نے پنجاب کے مسلمانوں کو بالواسطہ متاثر کرنا شروع کیا۔ فضل حسین اور جناح کے تعلقات میں اب تک کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ دونوں کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں یثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تھا۔ دونوں نے ترک موالات کی تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ دونوں آئینی جدوجہد کے قائل اور آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔ لیکن اب حالات نے اکیلیسی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ جس سے فضل حسین اور جناح کے تعلقات کشیدہ ہوئے۔ فضل حسین نے آل انڈیا مسلم لیگ سے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا پرانا چھین لینے کی پوری کوشش کی۔ اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ فضل حسین کے حیرت انگیز اثر و رسوخ نے جناح کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا۔ اور آخر اس یاس و حرماں اور شکست خوردگی کے احساس ہی نے انھیں وطن ترک کرنے

اور انگلستان میں مستقل اقامت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فضل حسین اور جناح کی یہ کشیدگی آخر وقت تک قائم رہی۔ اور اسی کشیدگی کی وجہ سے فضل حسین نے ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں جناح اور مسلم لیگ کے پاؤں نہ جھنے دیئے۔ اس تمام عرصے میں فضل حسین نے میا تیات کے ایک بہت بڑے ماہر اور چابکدست شاطر کی طرح پس پردہ رہ کر جو کھیل کھیلا۔ اس کو دیکھ کر ان کے حریفوں کو بھی اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ یہ شخص اپنے فن میں یگانہ روز گار ہے۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں کانگریس کے اجلاس گواہٹی کے صدر سری نواس آئنگر تھے آئنگر مدراس کے ایک مشہور قانون دان اور مرکزی اسمبلی میں سورما پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات سخت خراب ہو چکے تھے اور آئے دن فرقہ دارانہ فساد ہر جا پھوٹ رہے تھے۔ سری نواس آئنگر چونکہ بڑے درد مند اور نیک نیت آدمی تھے۔ اس لئے انھیں اس صورت حال سے سخت رنج پہنچ رہا تھا۔ انہوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے درپے درپے درخواست کی کہ آپس میں صلح و صفائی سے رہنا چاہیے سری نواس آئنگر اور مسٹر جناح کے تعلقات آپس میں بہت دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ دونوں مرکزی اسمبلی میں پوری یگانگت اور اتفاق سے کام کرتے تھے ۱۹۲۷ء کے اجلاس بھٹکے دوران میں جنرل اور آئنگر غیر رسمی طور پر ایک دوسرے سے ملنے اور ملک کے سیاسی حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ دونوں اس بات کے دل سے خواہاں تھے کہ فرقہ دارانہ کشیدگی کا کوئی مستقل اور پائیدار حل تلاش کرنا چاہیے تاکہ یہ ہر روز کا خون خرابہ ختم ہو۔



آخر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح کی دعوت پر سندھ وستان کے تین سربراہوں اور مختلف خیال مسلمان لیڈروں کے ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے تاکہ فرقہ دارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے اور مندروں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل مفاہمت پیدا کرنے کی کوئی تجویز سوچی جائے۔ اس مجمع میں مسٹر جناح کے علاوہ ہمارا جہ محمود آباد، سر محمد شفیع صاحبزادہ، سر عبدالقیوم، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، سر محمد یعقوب، مولوی شفیع داؤدی، نواب اسماعیل خاں، میاں شاستہاڑ، سر عبدالرحیم، سردار محمد نواز خاں عبدالمتین چودھری، سر عبدالعزیز، نواب سر ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر ایل کے حیدر، مولوی سید مرتضیٰ، امام صاحب جامع مسجد دہلی، ڈاکٹر سر عبداللہ اللہ، سہروردی، سید آل نبی، شاہ محمد زبیر وغیرہ شامل تھے۔ مسٹر جناح کی صدارت میں اس اجتماع نے سری نواس آننگز کی ان تجویزوں پر غور کیا۔ جہاں انہوں نے باضابطہ مسٹر جناح کو ارسال کی تھیں۔ یہ تجویزیں اس نقطہ نگاہ سے مرتب کی گئی تھیں کہ ۱۹۱۶ء کے پشاور لکھنؤ میں ترمیم و ترمیم کرنے کے ملک میں محفوظ انتخاب جاری کیا جائے۔

کافی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد یہ قرار پایا کہ اگر (۱) سندھ کو احاطہ بحسبیت سے الگ کر کے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے (۲) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات سندھ کی طرح اصلاحات رائج کر دی جائیں (۳) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایوان کی کم تعداد سے کم نہ ہو (۴) پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے (۵) مسلمانوں کی اولیت کے صوبوں میں ان کا دلچسپی

برقرار رکھا جائے۔ تو مسلمان سندھوستان کے مرکز اور تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔

۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو مسٹر جناب نے ان تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے۔ ایک

اخباری بیان میں فرمایا کہ :

معلوم ہوتا ہے کہ سندھوؤں اور مسلمانوں نے ان تجاویز کے جلد پہلوؤں

پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ مجالس قانون ساز میں نشستوں کے تحفظ

کے ساتھ مخلوط انتخاب مسلمان بھی قبول کریں گے کہ پہلے سندھوؤں کی

یہ شرطیں تسلیم کر لیں۔ کہ سندھ کو اعطاء بمبئی سے علیحدہ کیا جائے اور

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ جب سندھ

یہ شرطیں منظور کر لیں گے۔ اور ہمارے مطالبات کی تائید کریں گے

تو مسلمان اپنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کرنے

پر راضی ہو جائیں گے۔ اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جو

ویٹج حاصل ہے۔ اس کے بدلے میں۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں

سندھو اقلیتوں کو ویٹج دیا جائے گا۔ اس ویٹج کی صحیح تعداد معین

کرنے اور باہمی افہام و تفہیم کے لئے سندھو اور مسلمان اپنی الگ الگ

کمیٹیاں بنائیں گے۔ پنجاب اور بہار میں دونوں قوموں کی آبادی

کے تناسب سے نمائندگی مقرر کی جائے گی۔ یعنی نشستوں کے تحفظ

کے ساتھ انتخاب مخلوط ہوگا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی

پورے ایوان کی لئے تعداد سے کم نہ ہوگی۔ اور یہاں بھی نشستوں

کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب رائج کیا جائے گا۔ ہماری اس پیشکش کی تمام شقیں ایک دوسرے سے ملتی اور لازم و ملزوم ہیں اگر فریقِ ثانی اس پیشکش کو قبول کرتا ہے تو کئی اور مجموعی حیثیت سے قبول کرے۔ اور اگر رد کرتا ہے تو سبھی کئی اور مجموعی حیثیت سے رد کرے ” اس پیشکش کا جو نتائج کے اعتبار سے بڑی دُور رس ہے، سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ جداگانہ نیابت سے چھٹکارا پانے کا حرفت یہی ایک حل ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ حصہ ترک کرنے پر بخوشی رضا مند ہو جائیں۔ اور مجھے امید ہے کہ ان تجاویز پر رواداری اور فرارح دلی سے غور کیا جائے گا۔ جہاں تک طریقِ انتخاب کا تعلق ہے۔ وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں۔ انتخاب جداگانہ ہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی کے تحفظ و بقا کا پورا یقین ہو جاتا چاہیے۔ اور انہیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر ان کے حقوق یا مال نہیں کر سکے گی۔ اور اس بات کا بھی یقین ہو جائے کہ سندھوستان میں مکمل ذمہ دارانہ قومی حکومت قائم ہونے تک کا جو درمیانی وقفہ ہے، اس میں وہ اکثریت کے جو رواسنبداد سے بالکل محفوظ رہیں گے۔ اس لئے اس سلسلے قبیہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کے حفظ و بقا کا کیونکر اطمینان دلایا جائے۔ مذکورہ بالا تجاویز مرتب کرتے

وقت یہی نکتہ ہلکے پیش نظر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جونہی یہ بنیادی مسئلہ حسبِ خاطر طے ہو گیا۔ باقی تفصیلی اور جزوی معاملات آسانی سے طے کر لئے جائیں گے۔

”میرا ارادہ ہے کہ جب ہندو لیڈروں کی طرف سے اس پیشکش کا جواب موصول ہوگا۔ تو میں بہت جلد ایک مشترکہ اور نمائندہ اجلاس منعقد کروں گا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی کے اراکین، خلافت کانفرنس اور جمعیتہ العلماء کی مجالسِ عامہ کے اراکین، کونسل آف سٹیٹ اور مرکزی اسمبلی کے مسلمان اراکین شامل ہوں گے۔ اور پھر ان تمام نمائندہ حضرات کے مشورے سے ایک منتخب کمیٹی بنائی جائے گی۔ جو اس بارے میں کانگریس، ہندو سبھا اور ملک کی دوسری سیاسی انجمنوں کے نمائندوں سے گفت و شنید کر سکے گی۔ اس ستم کے مذاکرات کے بعد جو آخری تجاویز مرتب ہوں گی۔ وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکیں گی جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی جملہ نمائندہ انجمنیں ان پر اپنی اپنی تصدیق و توثیق کی ٹہر ثابت نہ کر دیں گی۔ آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملک بن نازک حالات میں سے اس وقت گذر رہا ہے۔ اس کے پیش نظر ہمیں مناسبت و مصلحت میں قطعاً دیر نہیں کرنا چاہیے۔“

۱۵ مئی ۱۹۲۶ء کو سری نواس آئنگر کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی

کا اجلاس پہلی میں ہوا۔ جس میں مسٹر جناح کی تجاویز کو مین و عن منظور کر لیا گیا اور سارا ہندوستان تہنیت و مبارک باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ صدر کانگریس سری لو اس آئنگر نے اس صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا:

”عرصہ دراز کے بعد یہ موقع پیش آیا ہے کہ ہندوستان کے سربراہ اور وہ مسلمان رہنماؤں نے پہلی مرتبہ اس دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں حقیقی اور پائیدار بنیادوں پر قومی زندگی استوار کی جائے۔ یہ تجاویز جو اب تجاویز پہلی کے نام سے ہمارے ملک کی تاریخ میں مشہور ہو چکی ہیں۔ ہمارے مسلمان احباب کی اسی خواہش کی آئینہ دار ہیں۔ ان تجاویز پر بعض حلقوں میں نظری اعتراض کئے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تجاویز اس وقت ہمارے درمیان ایک نہایت محفوظ اور معقول مناسبت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ جس پر آگے چل کر مستقبل میں مکمل و مستحکم قومیت کی عمارت کھڑی کی جاسکے گی!“

پنڈت موتی لال نہرو نے کہا: ”ملک میں اس وقت جو افسوسناک فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو چکی ہے اس کو دور کرنے کے لئے ان تجاویز سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔“

ڈاکٹر انصاری نے فرمایا: ”چند آدمیوں کو چھوڑ کر مسلمان قوم کی تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی عقیدوں کے رہنماؤں نے گذشتہ مہینے میں جناح کا نعرہ میں شرکت کی تھی۔ یقین کیجئے کہ جن لوگوں نے متحد و متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا ان کے

سامنے ایک سخت کٹھن منزل تھی۔ یہ فیصلہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور آپ کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ فیصلہ ہر اعتبار سے انصاف، حُبِ وطن اور عزت و آبرو پر مبنی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس سپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو جنرل کانفرنس میں جاری دساری تھی۔ وہ سپرٹ یہ تھی کہ ملک کے وسیع مفاد کے پیش نظر ہمیں سے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ترک کرنا چاہیے۔

سروجنی ٹائیڈ نے کہا: "کانگریس نے مسٹر جنرل کی اجماعی مشورہ کو کھلے بندہ مسلم اتحاد کا بہترین سفیر کہا کرتے تھے، تجاویز منظور کر کے ثابت کر دیا ہے کہ یہ جماعت ہندوستان کی نائندگی کا دعویٰ کرنے میں بجا اور مخلص ہے۔ میں متحدہ قومیت ہند کی طرف سے کانگریسی لیڈروں کی خدمت میں ان کے اس کارنامے پر مدیہ تشکر و تہنیت پیش کرتی ہوں۔"

مولانا محمد علی نے فرمایا: "دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں مسلمان رہنماؤں کی جو کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں ہر نوع کا سیاسی عقیدہ رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ جب آذربائیک تصفیہ کی کوئی صورت

نظر نہ آئی . تو ہم نماز مغرب کے لئے اٹھے . اور ہم نے بارگاہِ  
 بقی میں خلوصِ دل سے دعا کی . کہ اس وقت فرقہ دارانہ  
 کشیدگی سے ملک میں جو تاریکی چھا رہی ہے اُس میں  
 ہمیں منزلِ مقصود کا صحیح راستہ دکھا . معلوم ہوتا ہے  
 کہ وہ قبولِ دعا کی گھڑی تھی . کہ نہ نماز کے فوراً بعد جب  
 ہم دوبارہ جمع ہوئے . تو مرکزی اسمبلی کے نائب صدر  
 (سر محمد یعقوب) کی تحریک پر مخلوط انتخاب کی تجویز منظور  
 کر لی گئی . اور یوں اس قضیے کا فیصلہ ہو گیا . مجھے یقین ہے  
 کہ آنے والی نسلیں ہمارے اس فیصلے پر ہمیشہ فخر کریں گی .  
 عین اُس وقت جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں تجاویز دہلی پر خوشیاں منانی  
 جا رہی تھیں . سر محمد شفیع نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے ان تجاویز کو قبول  
 کرنے سے انکار کر دیا . اور اعلان کیا کہ وہ جداگانہ انتخاب کو کبھی ترک نہیں کریں گے  
 سر محمد شفیع . ۲ مارچ کی جناح کانفرنس میں شریک تھے . اور اُس وقت انہوں نے  
 ان تجاویز کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا . معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ لاہور  
 واپس پہنچے تو میاں فضل حسین نے اُن سے صاف کہہ دیا کہ وہ مخلوط انتخاب پر  
 رضامند نہیں ہیں . سر محمد شفیع کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ  
 وہ تجاویز دہلی سے روگردانی کریں .

اُنہی دنوں اس امر کی تحقیقات کے لئے کراچیاں سندھوستان اصطلاحات کی  
 دوسری قسط حاصل کرنے کا مستحق ہے یا نہیں . برطانوی پارلیمنٹ نے ایک

کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ جس کے صدر سر جان سائمن تھے۔ اور اس کمیشن میں کسی سندھستانی کو شامل نہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے اس فیصلے کے خلاف سندھستان کے طول و عرض میں عزم و عقیدہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں میں سے مسٹر جناح، سر عبدالرحیم، سر علی امام، سر محمد یعقوب اور بہا ماجہ محمود آبادیہ لوگوں نے اس کمیشن کا مقاطعہ کرنے کی تجویزیں پیش کرنا شروع کیں۔ لیکن ایک اور طبقہ جس کے ایڈر سر محمد شفیع تھے مقاطعہ کا حامی نہیں تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی تجاویز دہلی کے موید اور سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے علم بردار تھے۔ ادھر سر محمد شفیع اور ان کے ساتھی تجاویز دہلی سے منحرف اور سائمن کمیشن سے تعاون کے حامی تھے۔ میاں فضل حسین نے اپنی زبردست شخصیت کا سارا وزن تیراڑو کے اُس پلڑے میں ڈال دیا۔ جس میں سر محمد شفیع بیٹھے تھے۔ وہ خود تو حکومت پنجاب کے ریویژنر ممبر کی حیثیت سے سیاسیات میں کھلم کھلا حصہ لینے سے معذور تھے۔ لیکن اس کل کے تمام پُرزے انہی کے اشاروں سے حرکت میں آ رہے تھے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصے نے، جس کے صدر سر محمد شفیع تھے، دسمبر ۱۹۲۴ء میں اسلامپور کانج لاہور کے حبیبیہ ہال میں اپنا جلسہ منعقد کیا۔ اور دوسرے حصے نے، جس کے کرتا وپ تمام مسٹر جناح تھے، انہی دنوں سر محمد یعقوب کی صدارت میں اپنا اجلاس کلکتہ میں کیا۔ اجلاس کلکتہ میں شرکت کرنے والوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ملک برکت علی، ڈاکٹر بیف الدین کچلو، ڈاکٹر مستدر علم



مولانا ابوالکلام آزاد۔ سر عبدالرحیم۔ سر علی امام۔ بہا صاحبہ محمود آباد۔ سٹراہم۔ سی  
چھاگلا۔ مولوی فضل الحق وغیرہ شامل تھے۔ اجلاس لاہور میں سر محمد شفیع کے  
علاوہ جن قابل ذکر لوگوں نے شرکت کی۔ ان میں علامہ اقبال۔ نواب  
سر آید الغفار علی خاں اور مولانا حسرت موہانی موجود تھے۔

لاہور کے اجلاس میں تجاویز دہلی کی مخالفت اور سائمن کمشن سے تعاون  
کی قراردادیں پاس کی گئیں۔ تجاویز دہلی کی حمایت میں ملک بھر کی برکت علی نے اور سائمن  
کمشن سے مقابلہ کی قرارداد مسٹر چھاگلا نے پیش کی۔ تجاویز دہلی کی حمایت میں  
جب قرارداد پیش ہوئی تو تائید کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت  
علی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جناح شامل تھے۔ مسٹر جناح نے تائید کرتے  
ہوئے فرمایا:

”..... یہ تجاویز بہت سے دماغوں کی مجموعی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔  
آپ یہ توقع نہ رکھیے کہ ہر شخص کو اس طویل قرارداد کے ایک ایک  
لفظ یا ایک ایک جملے سے اتفاق ہوگا۔ لیکن جہاں تک اس روح  
کا تعلق ہے جو اس قرارداد میں جاری و ساری ہے۔ میں یقین کے  
ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجویز ہندوستان کی دونوں قوموں کے  
لئے جائز، محقول اور منصفانہ ہے۔ اس بیان کی اکثریت ہمارے

میں مسٹر محمد علی کریم چھاگلا بیرسٹریٹ لاء۔ اس وقت بمبئی صوبہ مسلم لیگ کے سکریٹری تھے  
آج کل آپ بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔

ساتھ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ملک کی اکثریت کو بھی اپنے  
ساتھ شامل کر سکیں گے؟ اگر قوم کی اکثریت بھی ہماری ہم نوا بن  
جائے۔ تو مجھ سے بڑھ کر اور کسی کو مسرت نہ ہوگی بہر حال یہ امر بھی  
تصنیع طلب ہے۔ اور آئندہ ہمارا فرض ہو گا کہ ہم عوام کو اس  
قرارداد کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کریں۔ اور انھیں اس کی صداقت  
کا یقین دلا کر اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں  
تک عرض و حمایت اور مفاد کا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانان  
ہند کی فلاح و بہبود کے لئے اس قرارداد سے بہتر اور کوئی تجویز  
نہیں ہو سکتی۔“

جب کلکتہ اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی دو شاخیں علیحدہ علیحدہ  
آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ڈاکٹر  
النصاری کی صدارت میں، اور اس میں منعقد ہوا اور وہاں بھی تجاویز دہلی کی  
حمایت میں ایک زبردست قرارداد منظور کی گئی۔ اب اگرچہ مسلم لیگ میں  
بھڑت پڑ گئی تھی۔ بایں ہمہ لیگ کا فریق غالب، جو اپنے فریق مخالف سے  
زیادہ طاقتور، ذی اثر اور فعال تھا، کانگریس کا ہم نوا بن چکا تھا۔ ترک  
موالات اور خدائنت کا زور ختم ہو جانے کے باوجود ملک میں ان مسلمان  
لیڈروں کا وقار سنہ ز قائم تھا۔ جنہوں نے ابھی چند سال قبل ہندوستان  
کی سب سے بڑی سیاسی تحریک چیلانی تھی۔ اور جنہوں نے مغلیہ سلطنت  
کے زوال کے بعد پہلی بار پشاور سے لے کر اس کماری تک کے مسلمانوں کو

ایک ہی قومی نظام کے تحت لاکھڑا کیا تھا۔ سر محمد شفیع جانتے تھے کہ ایسے لوگوں کے سامنے ان کا پیمانہ نہیں چل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی لاسپور تشریف لائے۔ اور انہوں نے موچی دروازہ کے باہر ایک جلسے میں سر محمد شفیع کو لٹکا کر کہا۔ کہ اگر وہ سامن کمنشن سے تعاون کے حامی اور تجاویز دہلی کے مخالف ہیں تو اسلامیہ کالج کے جیبیہ ہال سے نکل کر یہاں آئیں تاکہ کھلے میدان میں لوگ ان کے دلائل سن سکیں۔ تو سر محمد شفیع کو سر فزادش محمد علی کی یہ دعوت مبارزت قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یوں بھی سالہا سال اور عرصہ دراز سے مسلم لیگ اور مسٹر جناح ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملحق و پیوست۔ اور آپس میں اس طرح لازم و ملزوم ہو چکے تھے کہ لیگ کو جناح یا جناح کو لیگ سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ سر محمد شفیع اور سر فضل حسین کی کوشش سے اگرچہ لیگ کی ایک شاخ کا اجلاس جیبیہ ہال میں ہو چکا تھا۔ لیکن عوام کے نزدیک حقیقی مسلم لیگ وہی تھی جس کے سرگرم مسٹر جناح تھے۔ مسلم لیگ کا ماضی اس کی پوری تاریخ اور ساری جدوجہد اسی مسلم لیگ سے وابستہ تھی جس کی قیادت جناح کے ہاتھ میں تھی۔ یہ حقیقت عوام و خواص کے علاوہ خود دار کان حکومت کو بھی معلوم تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جب سامن کمنشن سندھوستان میں وارد ہوا تو شفیع لیگ نے اس کا خیر مقدم بھی کیا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات بھی پیش کئے۔ اور اسے اپنے اشتراک و تعاون کا یقین بھی دلایا۔ لیکن یہ ایک عارضی چیز تھی۔ جو ہوا کے بھونکے کی طرح دوسرے اُدھر نکل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ سامن کمن کے رخصت ہوتے ہی اس کی سرگرمیوں پر ادس پڑ گئی۔ اور سر محمد شفیع پھر گوشہ عافیت میں جا کر بیٹھ گئے۔ سر محمد شفیع اپنی اعتدال پسندی اور عافیت کیٹی کے اقتاباً سے طبیب اس قابل نہ تھے کہ مستقل طور پر مسلم لیگ کے حریف بن سکیں۔ جس کی پشت پر جناح۔ محمد علی۔ شوکت علی۔ ظفر علی خاں۔ کچیلو۔ تصدق شرنانی اور انصاری جیسی شخصیتیں کار فرما تھیں۔ میاں فضل حسین اس راز سے واقف تھے۔ اس لئے جیبیہاں کے جلسے کے بعد ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جناح کے اثر کو زائل کرنے کی سب سے بہتر تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ سامن کمن کی تحقیقاتی کارروائی ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے لئے جدید اصلاحات کے خاکہ کی ترتیب و تدوین شروع ہو نیوالی تھی۔ اس کام میں میاں فضل حسین سراسر اپنی رائے اور صوابدید سے مسلمانوں کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے جب تک جناح اور فضل حسین ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ فضل حسین کو نہ لیگ پر اعتماد ہو سکتا تھا۔ اور نہ وہ جناح کے ہاتھ میں مسلمانوں کا ہاتھ دینے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

چند ہی مہینوں کے اندر حالات میں خود بخود ایک ایسا تغیر آنا شروع ہوا جس سے تہذیب فضل حسین کا کام آسان ہوتا چلا گیا۔ مئی ۱۹۲۶ء میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تجاویز دہلی کی منظوری کا اعلان کیا تھا۔ تو اس کے ساتھ یہ تحریک بھی شروع ہو گئی تھی کہ ہندوستان کا ایک دستور اساسی وضع کرنا چاہیے۔ تاکہ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کا منہ بند کیا جاسکے۔ جو آئے دن یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک کا دستور رکاسٹیٹیشن وضع کرنے سے معذور ہیں۔ یہ تحریک سال بھر چلتی رہی۔ آخر ۱۹۲۸ء کو کانگریس کی کوشش سے مہی

میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس نے دستور وضع کرنے کا کام ایک سب کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ جس کے یہ دس ارکان تھے۔ سر علی امام۔ شعیب قریشی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ ایم ایس اینے۔ ایم آر جیکار۔ جی آر پودھان۔ سردار منگل سنگھ۔ سر تیج بہادر سپرد۔ ایم این جوتشی اور سبھاش چندا بوس۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے۔

۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل پارٹیز کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ جہاں سب کمیٹی نے اپنے وضع کئے ہوئے دستور اساسی کی رپورٹ جے آئی آئی نہرو رپورٹ کا نام دیا جانے والا تھا، پیش کی۔ اس رپورٹ میں تجاویز دہلی سے صریحاً اخراج کیا گیا تھا۔ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے سے انکار کر دیا گیا اور اس کی بجائے بالعموم کو حق رائے دہندگی عطا کر کے، بلا تخصیص، مخلوط انتخاب رائج کر دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مرکز میں سبھی مسلمانوں کو الٹ نشستیں دینے سے انکار کر کے مخلوط انتخاب کی سفارش کر دی گئی تھی۔ مولانا محمد علی افسر وقت بخرض علاقہ یورپ گئے ہوئے تھے۔ مسٹر جنرل بھی انگلستان میں تشریف فرما تھے البتہ مولانا شوکت علی اجلاس میں موجود تھے۔ انہوں نے ان تجویزوں کی مخالفت کی۔ لیکن کانفرنس نے اس شرط کے ساتھ منظور سی عطا کر دی کہ دسمبر میں جب کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوگا تو ایک کنونشن منعقد کر کے نہرو رپورٹ پر آخری ہر تصدیق ثبوت کی جائے گی۔

پنجاب میں میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع نے اس صورت حال سے

پہلے فائدہ اٹھایا۔ اور یہ پراپاگنڈہ شروع ہو گیا۔ کہ اگر مسلمان مارچ ۱۹۲۴ء میں  
تجاویز دہلی پیش کر کے اپنے قومی موقف سے روگردانی اختیار نہ کرتے اور کسی شرط پر بھی  
حدیگانہ انتخاب کو ترک کرنے کی حامی نہ بھرتے۔ تو آج نہرورپورٹ مرتب کرنے  
والوں کو مسلمانوں کے قومی مطالبات کے ساتھ یہ استہزاء کرنے کی جرأت نہ ہوتی  
رہتا۔ انقلاب کو لاہور سے جاری ہوئے یہ مشکل ڈیڑھ سال گزرا تھا۔ لیکن  
اس پراپاگنڈے میں انقلاب پیش پیش تھا۔ اور آئندہ نہرورپورٹ کو ختم کرنے  
اور مسلمانوں میں حدیگانہ حقوق کا شعور پیدا کرنے میں جس شدت، توانا اور  
تسلسل سے انقلاب نے زور دار مقالے لکھے۔ اس کی نظیر سندھ و ستان کا اور کوئی  
اردو اخبار پیش نہیں کر سکا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس پھر کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ اور ہمارا  
محمود آباد کو اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ ہمارا ہمارے محمود آباد تجاویز دہلی کے مؤید تھے  
اور نہرورپورٹ کے سبھی حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے عام قیاس تھا کہ انکی مدد  
اور مسٹر جناح کی رہنمائی میں لیگ بہ صورت نہرورپورٹ کو منظور کر لے گی۔ سر  
محمد شفیع دوبارہ اپنی لیگ کا علیحدہ اجلاس کرنے سے معذور تھے۔ یوں ہی شفیع  
لیگ کی نمائندہ حیثیت پر اعتبار سے محل نظر بن گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر  
آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں نہرورپورٹ پر منظوری کی ہر ذلت کو  
گئی۔ تو اس فیصلے کو رد کرنے کے لئے مسلمان کیا ذرائع اختیار کریں گے۔ یہاں  
میاں فضل حسین کے زرخیز دماغ نے ایک ایسی تجویز ڈھونڈ نکالی۔ جو آگے چل  
کر، اپنے نتائج کے اعتبار سے، اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ اس نے مسلسل کئی

سال تک مسلم لیگ کو سیاستِ سندھ میں سے خارج کئے رکھا۔

فضل حسین کی درپردہ اور سر محمد شفیع کی ظاہر کوشش سے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا خاکہ تیار کیا گیا۔ جس کی ہیبتِ ترکیبی یہ تھی کہ مسلمانانِ سندھ کی مختلف قومی جماعتوں میں سے کم از کم چھ سو نمائندے مدعو کئے جائیں۔ یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخہائے کلکتہ دلاہور سے بیس بیس نمائندے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمعیتِ اہل اہلئے سندھ سے بیس بیس نمائندے۔ سندھوستان کے ہر صوبے کے مسلمانوں کے بیس بیس نمائندے۔ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے تمام غیر سرکاری مسلمان نمبر۔ اور سندھوستان کے ہر صوبے کی مجلسِ قانون ساز کے تمام غیر سرکاری مسلمان نمبر۔ یہ لوگ جن کی مجموعی تعداد چھ سو کے لگ بھگ ہو گی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری عشرے میں دہلی میں جمع ہو کر پوری بلند آہنگی سے تجاویزِ دہلی کی تردید اور نہرو رپورٹ کی مخالفت میں آواز بلند کریں۔ اس اجتماع کی صدارت کے لئے آغا خان کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ آغا خان کو خط و کتابت کے ذریعے اس کام پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ تاہم مزید تشتی اور بلٹاؤ لفتنگو کے لئے سر محمد شفیع خود یورپ تشریف لے گئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے سندھوستان کی سیاسیات میں آغا خان کا کوئی عمل دخل باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن برطانیہ کے اونچے طبقے میں انھیں جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس کا مقابلہ سندھوستان کا بڑے سے بڑا اور نامور سے نامور آدمی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع اس راز سے واقف تھے۔ اور یہ سچی جانتے تھے کہ آغا خان کی صدارت میں جو آواز بلند کی جائے گی۔ اس کی

بازگشت اور کہیں سے اٹھے یا نہ اٹھے۔ لیکن لندن کے وائٹ ہال میں اس کی گونج ضرور سنائی دے گی۔

دسمبر ۱۹۲۵ء کا آخری ہفتہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مسلم لیگ، کانگریس اور آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے۔ مسلم لیگ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نہرو رپورٹ کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ آخر ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر جناح کی قیادت میں تیس نمائندے آل پارٹیز کنونشن میں، جہاں نہرو رپورٹ زیر بحث آنے والی تھی، شامل ہوں۔ اور چند ضروری ترمیمیں پیش کریں۔

ان تیس نمائندوں میں مسٹر جناح کے علاوہ ہمارا اچھ محمود آباد، ڈاکٹر کچیلو ایم سی چھاگلا، ملاک برکت علی، ڈاکٹر مسد محمود، مولانا ظفر علی خاں، سید عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر محمد عالم، سیٹھ یعقوب حسن، تصدق احمد خاں شردانی، چودھری خلیق الزماں، نواب زادہ لیاقت علی خاں، مولوی، فضل الحق سرعزیز الحق، شاہ محمد زبیر، مولوی اکرم خاں وغیرہ موجود تھے۔

انہی دنوں آغا خاں کی صدارت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد دہلی میں ہو رہا تھا۔ اور کانفرنس کے سکریٹری فاضل رحمت اللہ نے مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ لیکن مسلم لیگ نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا نے لیگ کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک الگ قرارداد پیش کی، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

”آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے مسلم لیگ کو



اس مضمون کی دعوت ارسال کی ہے۔ کہ اس کانفرنس میں لیگ اپنے نمائندے بھیجے۔ افسوس ہے کہ مسلم لیگ اس دعوت کو قبول کرنے سے معذور ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ کی پہنچتہ رائے ہے کہ اگر قومی جدوجہد کے دوران میں ہر نازک موقع پر اس کانفرنس کی مہتمم کے ہنگامی اور حریف ادارے قائم کرنے کی رسم چلی نکلی۔ تو یہ امر مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لئے سخت نقصان رساں ثابت ہوگا۔ لیگ کی رائے میں تمام محب وطن مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس وقت مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر یہ فیصلہ کرتے کہ آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ لیگ کی یہ سبھی رائے ہے کہ جو آئینی طرز عمل مسلم کانفرنس نے اختیار کیا ہے۔ اور جس کا خاکہ کانفرنس کے سکریٹری نے اپنے دعوت نامے میں درج کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکے گا۔ اور نہ اس طرز عمل سے کانفرنس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔“

مشرحہا کلام نے یہ قرار داد پیش کرتے وقت کہا کہ: ”اگر ہم نے مسلم کانفرنس میں اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت قبول کر لی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا ہم خود اپنے ہاتھ سے لیگ کی موت کے محض پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کانفرنس ہمیں مسلم لیگ کے لئے باعث توہین ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلم لیگ مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت نہیں رہی۔“

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

سٹریٹج نے اس قرارداد کی تائید میں ایک پُر جوش تقریر کی اور فرمایا  
 ” اس کانفرنس کا انعقاد صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ کو کسی  
 نہ کسی طرح پس پشت پھینک دیا جائے۔ لہذا ایسے لوگوں کی دعوت  
 کو قبول کرنا، جو اپنے دعوے کی رُو سے خود اپنے خلاف مصروفِ پیکار  
 ہیں؟ ہماری غیرت اس لئے وقار اور ہائے بنیادی اصولوں کے  
 منافی ہے۔ میں کانفرنس کے بائیںوں کو متنبہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا  
 ہوں۔ کہ اگر کانفرنس نے اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا۔ جس کی رُو  
 لیگ یا لیگ کے اصولوں پر پڑے۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ، جو  
 مسلمانوں کی تنہا نمائندہ جماعت ہے، اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔“

۱۳ دسمبر ۱۹۲۵ء کو آل پارٹیز کنونشن میں مسلمانوں کے تیس نمائندے شریک  
 ہوئے۔ جن کی ترجمانی کے نرائض سٹریٹج نے ادا کئے۔ کانفرنس کی نشاندہی  
 امیدافزار یا سازگار نہ تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو سندھ و سبھا کے روز افزوں اثر  
 کے نیچے آکر اپنا وہ طنطنہ ترک کر بیٹھے تھے۔ جو کسی زمانے میں ان کا شیوہ  
 خاص سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پنڈت مدن موہن مولوی اور نالہ لاجپت رائے  
 کے اتحاد نے کانگریس کے چھٹے چھڑا دیئے تھے۔ اور سورا جیوں کو سہرے کا نا کافی کا  
 منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کانگریس اگرچہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اجلاس مدراس کے موقع  
 پر سندھ و سنجان کی مکمل آزادی کو اپنا مطمح نظر قرار دے چکی تھی۔ لیکن  
 نہرو رپورٹ میں مکمل آزادی کو ترک کر کے درجہ مستعمرات کو اپنا نصب العین

قرار دے دیا گیا تھا۔

مسٹر جناح کنونشن کی اس بدلی سہنی نضا کو خوب محسوس کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے ملک و ملت کے وسیع مفاد کے پیش نظر صرف تین ترمیمیں پیش کرنے پر اکتفا کیا اور فرمایا کہ اگر یہ ترمیمیں منظور کر لی گئیں تو آل انڈیا مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جائے گی۔ وہ ترمیمیں ایسی ہرگز نہ تھیں جن کے منظور کر لینے سے کنونشن کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہنچنے یا ہندوستان کی آئندہ ترقی کے راستے میں کوئی خلل واقع ہو جائے۔ انڈیا لیگ نے پہلی ترمیم کا مفہوم یہ سمجھا کہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں میں سے ۱۰ مسلمان ہوں گے۔ دوسری ترمیم یہ تھی کہ اگر پنجاب اور بنگال میں بالذات کو حق رائے دہندگی عطا نہ ہو سکا۔ تو مخلوط انتخاب رائج کر کے کم از کم دس سال کے لئے مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں گی۔ اور دس سال کی میعاد گزر جانے کے بعد مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اس تجویز پر نظر ثانی کر سکیں۔ تیسری ترمیم یہ تھی کہ اختیارات باقی مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں گے۔

یہ ترمیمیں پیش کرتے وقت مسٹر جناح نے جو تقریر کی، وہ درد مندی، مہما لحت آمیزی اور حب وطن کے جذبات سے لبریز تھی۔ انہوں نے کنونشن کو مخاطب کر کے جس خلوص بے پایاں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ یہ شخص ہر قیمت پر ملک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ اس یادگار تقریر کا کچھ حصہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہو گا۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

.....” جب ایک قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ اور  
فرزندانِ وطن حصولِ آزادی کے لئے بدلیٹی حکومت کے خلاف مصروف  
پیکار ہوں۔ تو اُس وقت آپ کو لا محالہ اقلیتوں کا مسئلہ طے کرنا پڑے  
گا۔ آپ جس نوع کا دستورِ اساسی چاہیں وضع کر لیں۔ جب تک  
اقلیتیں یہ محسوس نہیں کریں گی۔ کہ اُن کے حقوق محفوظ ہیں۔ اُس  
وقت تک وہ اُس دستور کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تامل سے کام  
لےیں گی۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ضمن میں اقلیتوں  
کی حفاظت ہی قوم پرستی کی سب سے بڑی آزمائش ہے.....  
میں اس وقت ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی  
کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ اور میری یہ آرزو ہے کہ میں آزادی  
کی جدوجہد میں نوکر و مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھوں  
کیا آپ محض اس خیال سے مطمئن ہو جائیں گے کہ چند مسلمان  
آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں؟ کیا آپ صرف اس بات سے مطمئن  
ہو جائیں گے کہ جناح یہ کہتا ہے کہ ”میں آپ کے ساتھ ہوں“ کیا آپ  
جناح کی شرکت کے معنی ہیں یا پوری مسلمان قوم کے اشتراک کے  
خواہاں ہیں؟..... خدا را یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کو دیکھ لیاں نہ  
رہا ہوں۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میری باتوں کو غلط معنی نہ پہنچا  
جائیں۔ اگر اقلیتوں کا یہ مسئلہ آپ نے آج حل نہ کیا۔ تو لازماً کل کو حل  
کرنا پڑے گا۔ ہم ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہمیں مل جل کر اسی

ملک میں زندگی بسر کرنا۔ اور ہمیں روزمرہ کا کام کاج کرنا ہے۔ اس لئے اگر ہمارے درمیان باہمی اختلاف ہیں بھی۔ تو ان اختلافات کی وجہ سے دشمنی اور عداوت تو مول نہ لے لیجئے۔ اگر ہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمنوں کی مانند ایک دوسرے کا سر سھوڑ کر نہیں بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جُدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کی ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے راستے میں کسی خیالی منطق، کسی فلسفے اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجئے۔“

مشر جناب کی ان درمندانہ گزارشات کے باوجود کنونشن نے تینوں ترمیمیں منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی بھی کنونشن میں موجود تھے۔ لیکن وہ مسلم لیگ کے نمائندے بن کر نہیں بنا۔ کانگریس کے سابق صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے جب درجہ مستعمرات کے خلاف تقریر کرنا چاہی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مولانا نے تنگ آ کر کہا۔ ”اگر یہ غنڈہ گردی جاری رہی تو میں تقریر نہیں کر سکتا۔“

حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا۔ ”سب سے بڑے غنڈے تو

۱۹۲۸ء) جلد اول۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

آپ خود ہیں۔“

مولانا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کنونشن کو بے نقط سنا لیا اور دل کی بھڑاس نکال کر واپس چلے آئے۔ کنونشن نے بڑے دھوم دھڑکے سے نہر در پورٹ پر منظوری کی فہرثبت کر دی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ وہ شخص جو مسلم لیگ کی روح و رداں مسلمانوں کی نیابت کا مستحق ترین دعویٰ دار اور کانگریس سے اتحاد و اتفاق پر قرار رکھنے کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اُس کی تینوں نہایت بے ضرورت زمیں رد کر کے اُسے یقین دلا دیا گیا کہ کانگریس کو نہ تو اُس کے تعاون کی ضرورت ہے اور نہ کانگریس اس کی دوستی کی خواہاں ہے۔ اب ایک طرف کانگریس نے تیکر و رعونت سے سرشار ہو کر اُس ار مغانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ جو جناح نے پیش کیا تھا۔ اور دوسری طرف دہلی میں خود مسلمانوں کے ایک بہت بڑے اجتماع نے جناح کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں جناح کے لئے گوشہ عزلت کے سوا اور کیا چارہ تھا۔

مولانا محمد علی کے مزاج میں انتہا پسندی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب وہ ہاتھ کا ندھی کی طرف جھکے۔ تو انہیں پنیرری کا مرتبہ دینے سے بھی دریغ نہ کیا اور اب وہاں سے برگشتہ خاطر ہوئے۔ تو اُن کے مزاج میں پھر اشتعال پیدا ہوا اور وہ سیدھے دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں ڈھواں دھار تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی۔ اور فرمایا کہ ”فکر مت کرو۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایک مسلمان ہمیشہ تین کا فردوں پر

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

غالب رہتا ہے۔“

مسلم کانفرنس کا انعقاد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں ہوا۔ آغا خاں بہ نفسِ نفیس اُس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کے حامیوں کے اندازے کے مطابق تین ہزار کا مجمع تھا۔ جس میں ذیل کے اصحاب نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ سر عبد الکریم غزنوی، ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ ملک فیروز خاں نون۔ نواب سر محمد یوسف۔ نواب اسماعیل خاں۔ سر محمد شفیع۔ سر رضا علی۔ صاحبزادہ سلطان احمد خاں۔ ڈاکٹر سر صیاد الدین۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شفیع داؤدی۔ سر محمد یعقوب۔ چوہدری ظفر اللہ خاں۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ اور مفتی کفایت اللہ۔ مرکزی اسمبلی۔ کونسل آف سٹیٹ۔ اور یو۔ پی اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی اکثریت بھی حاضر تھی۔ اس کے علاوہ بنگال۔ بمبئی اور آسام اور صوبجات متوسط کی کونسلوں کے بعض مسلمان ممبر بھی موجود تھے۔

آغا خاں کے خطبہ صدارت کے بعد اہم ترین چیز وہ طویل قرارداد تھی جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا۔ اس قرارداد میں جن امور پر زور دیا گیا تھا۔ وہ یہ تھے اول، مسلمان کسی شرط پر اور کسی صورت میں بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ دوم، سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کیا جائے۔ سوم، شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔ چہارم، ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

قائم کی جائے۔ پنجم، اختیاراتِ باقی مرکز کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں  
 ششم، مرکزی اسمبلی میں ایشیتین مسلمانوں کو وی جائیں۔

سر محمد شفیع نے یہ قرارداد پیش کرتے وقت مسٹر جناح، آل انڈیا مسلم لیگ  
 اور آل پارٹیز کنونشن پر پے درپے طعن و تشنیع کے نشتر چلائے۔ پہلے انہوں  
 نے مسلم کانفرنس کی ہمہ گیر اور نمائندہ حیثیت پر تفریر کرتے ہوئے کہا کہ:

”اس کانفرنس میں ہر خیال اور ہر نقطہ نگاہ کے آدمی شریک

ہیں۔ خلافت کمیٹی کی روح و رواں علی برادران ہیں۔ جمعیتہ العلماء

سند کے صدر مفتی کفایت اللہ ہیں۔ مولانا شفیع واڈوی ہیں۔

جنہوں نے ایک زمانے میں ترکِ موالات کر رکھا تھا۔ سندھوستان

کی مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے ایک سو سے زیادہ

ممبر موجود ہیں۔ پھر ان سب سے بالاتر وہ بیکتاے زمانہ ہستی ہے

جو اس وقت کرسی صدارت پر رونق افروز ہے۔ اور جس کا

مقابلہ آج دنیا کے اسلام میں کوئی اور شخص نہیں کر سکتا۔ یہ

نظارہ دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کانفرنس کو مسلمانان

سندھ کی نمائندہ آواز قرار دینے سے انکار کرتا ہے۔ تو یقیناً وہ غلط

اور جھوٹا کہتا ہے۔ جو فیصلے آج ہم کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ

پوری مسلمان قوم کی ہم نوائی کا وزن شامل ہے۔ اگر کسی شخص نے

ان فیصلوں کو رد کرنے کی کوشش کی۔ تو پھر جو نتائج برپا ہونگے

ہم اپنے آپ کو ان کا ذمہ دار قرار نہیں دیں گے۔۔۔۔۔ ہم نے



مسٹر جناح کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ لیکن اُن کا ارشاد ہے کہ کلکتہ پہنچے۔ کیا مسٹر جناح یہ چاہتے ہیں کہ جو حشر اُن کا اور اُن کے ساتھیوں کا دہاں ہوا ہے۔ وہی حشر ہم را بھی ہوتا؟ یہ پہلا موقع ہے کہ اُغیار نے مسلمانوں کے کسی قومی ادارے کے ساتھ ایسا شرمناک سلوک روا رکھا ہے۔ میں اس واقعہ کو تنہا مسلم لیگ ہی کی توہین نہیں سمجھتا بلکہ اسے پوری مسلمان قوم کی رسوائی کے مترادف قرار دیتا ہوں..... کنونشن میں مسٹر جناح کے سہا اور کسی کو بولنے تک نہیں دیا گیا۔ خود مسٹر جناح کی تقریر کے دوران شرم شرم کے نعرے لگتے رہے۔ اور اُن کی ہر درخواست کو سہ دلوں نے پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا۔ اگر ہم کنونشن میں شریک ہوتے۔ تو یقیناً ہمارے ساتھ بھی یہی ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ کلکتہ جانے اور مفت میں رسوائی مائل لینے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم یہاں جمع ہو کر اپنے مطالبات پیش کریں۔ اگر برطانوی حکومت نے ہمارے ان مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہماری مرضی کے خلاف ہندوستان پر کوئی آئین مسلط کرنے کی کوشش کی۔ تو ہم اُسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔“ ۱۷

۱۹۲۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت افراتفری اور انتشار کا

۱۷ انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۲۸ء، جلد دوم

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کا وہ عنصر جو جٹا و فیکر اُسے محمد شفیع کی رہنمائی قبول کرنا۔ یا سر فضل حسین کے اشاروں پر کام کرنا عار سمجھتا تھا۔ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصے نے جس میں تصدق احمد خاں شردانی۔ ڈاکٹر کچلو۔ ڈاکٹر محمد عالم چودھری خلیق الزماں۔ مولانا طفر علی خاں۔ سید عبداللہ بریلوی۔ ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شریک تھے۔ بہرورپورٹ کی حمایت میں غیر منثرو طور پر کانگریس کی شرکت گوارا کر لی۔ دوسرا طبقہ جو بٹا اعتدال پسند تھا مثلاً ایم۔ سی چھاگلہ ملک برکت علی۔ بہاراجہ محمود آباد۔ سر عزیز الحق۔ مولوی اکرم خاں۔ مولوی فضل الحق وغیرہ۔ یہ لوگ چھپکے سے میدان چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ سر چھاگلہ نے جو اُس وقت مسلمانوں کے قوم پرست حلقے میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ کانگریس کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا :

” آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتہ کے سامنے مسلم لیگ کی نمائندگی اس لئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری سر میموں کے بعد بہرورپورٹ کو منظور کر سکیں۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ان مطالبات پر فراخ دلی سے غور کرنے کی بجائے، کنونشن نے سب دوسجھا کے زیر اثر آ کر اور اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر، بالکل اُلٹی صورت اختیار کر لی۔ مجھے یہ امر ناہم کر دینے میں کوئی تاثر نہیں۔ کہ مسلم لیگ کے اُن نمائندوں کی، جو کنونشن میں شریک تھے۔ اور جنہوں نے مسلمانوں

کے جائز مطالبات پیش کئے تھے، اکثریت نہرو رپورٹ کی حامی تھی اور یہ وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اپنی ملت سے جنگ کی۔ بلکہ جو اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے جرم میں موردِ عقاب بھی بنے۔ اگر کنونشن لیگ کے ان تیس منتخب نمائندوں کے ساتھ کسی امر پر گفتگو کرے تو قاصر ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی ذیہدہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ اگر ان تیس نمائندوں کو فرقہ پرست قرار دے کر ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں ایک بھی قوم پرست مسلمان موجود نہیں ہے“ لہ

مٹر جناح نے ہر چند حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور اسی کوشش کے دوران اپنے مشہور چودہ نکات بھی مرتب کر ڈالے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات کی باگ ڈور اور حالات کو حسبِ منشاء تشکیل کرنے کی قوت ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کانگریس نے ایک ایسے نازک موقع پر مسلمان رہنماؤں کو ذلیل کیا۔ جب وہ محبتِ داخوت کے جذبات سے سرشار ہو کر ہندوؤں سے گلے ملنے کو بالکل تیار تھے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناح کا نفرش میں تجاویز دہلی مرتب ہوئیں۔ اور سری لواس آئنگر کے قول کے مطابق: "گویا ہندوستان

لہ البیوسی ایڈریس آف انڈیا کا اخباری بیان۔ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء -

کے آسمان پر ہندو مسلم اتحاد کا نیا آفتاب طلوع ہوا۔ اس آفتاب کی پذیرائی میں مدراس کی کانگریس اور کلکتہ کی مسلم لیگ دونوں نے دیدہ و دل فرسٹ راہ کئے۔ مسلم لیگ تو آخر وقت تک اس آفتاب کو خوش آمدید کہتی رہی۔ لیکن موتی لال نہرو کی کوتاہ اندیشی، تنگ نظری اور کج روی نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حتیٰ کہ تجا دینر دہلی کا وہ سب سے بڑا انداز اور عامی سری لو اس آئنگر خود موتی لال کی ضد سے اس قدر تنگ آیا کہ اُس نے کانگریس کی رکنیت سے مستعفی ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ اور چند سال بعد وہ غریب انتہائی دل شکستگی کے عالم میں اس دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔

موتی لال نے یہ نہ سوچا کہ جس نہرو رپورٹ کو وہ صحیفہ آسمانی سمجھ کر ایک لفظ بدلنے کو تیار نہ تھے۔ اور جس دستاویز کو وہ گویا دیوتاؤں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مقدس تحریر خیال کر کے تغیر و تبدل سے بالاتر سمجھتے تھے۔ صرف ساں بکر کے بعد ایک مردود و مقہور لاش کی مانند دریائے راوی کی لہروں میں بہا دی جانے والی تھی۔ نہرو رپورٹ کو ایک سال سے زیادہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا لیکن یہ بارہ ہینے کا وقفہ اپنے پیچھے مٹا قشتوں، جھگڑوں اور دشنام طرازیوں کی ایک ایسی تلخ یاد چھوڑ گیا۔ جس نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان۔ بلکہ خود مسلمانوں کے اندر عرصہ دراز تک خانہ جنگی کی آگ کو روشن کئے رکھا۔

پنڈت موتی لال نہرو ایک بڑے وطن پرست اور قوم پرور لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے اس پیش پاؤنتادہ حقیقت کو نہ

پہچانا کہ مسٹر جناح کو ٹھکرا کر وہ مسلمان قوم کے ساتھ آبرو منداناہ منفاہت کی تمام اتمیدوں کا اپنے ہاتھ سے خون کر رہے ہیں۔ جناح کو رو کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ طے کرنے کے لئے کانگریس کو سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سے گفت و شنید کرنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ موتی لال اور شفیع یا موتی لال اور فضل حسین کے درمیان ایک ایسی خوفناک خلیج حائل تھی جسکو پاٹنا دونوں کے لئے ناممکن تھا۔ مسلمانوں میں صرف جناح ایک شخص تھا۔ جو اپنی قوم کو مخلوط انتخاب پر رضامند کر کے ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد کھڑی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن جب موتی لال نہرو کی حسد اور ہٹ دہری نے جناح کو گوشہ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ تو کانگریس کا دوسرے مسلمان رہنماؤں سے کسی عسین سلوک کی توقع رکھنا محض خیالی خام تھا چنانچہ آئندہ فرقہ وارانہ جھگڑوں نے جوہت نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا اس کی تمام ترقی داری پنڈت موتی لال نہرو کی اسی روش پر عائد ہونی چاہیے

## ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک

اپریل ۱۹۳۰ء میں سرفضل حسین دالسرے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر مقرر ہو کر دہلی تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ سیاسی جدوجہد کے اعتبار سے ہندوستان کا بڑا نازک اور پُرخطر دور تھا۔ کانگریس نے اسی زمانہ میں سہولت نافرمانی اور ستیہ گم کی تحریکیں شروع کیں۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی تنظیم اسی زمانے میں ہوئی۔ پنجاب میں مجلس احمدیہ اسلام کی بنیاد اسی زمانے میں رکھی گئی۔ لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد اسی زمانے میں ہوا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بھی اسی زمانے میں پارلیمنٹ نے منظور کیا۔

سرفضل حسین کے پنجاب سے رخصت ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی کی دہلی کی عصیت، جس نے اپنے حقدار قبائکے نے شہری دیہاتی کی تفریق کھڑی کی تھی، خود اپنے حربوں کا شکار ہو گئی۔ اس قبائلی عصیت کی بنیاد محض چند افراد کی جلبِ منفعت کی خواہش تھی۔ فضل حسین کی زوردار شخصیت نے اس

خواہش کو کئی برس تک عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا۔ لیکن جونہی وہ ہمگیر شخصیت آنکھوں سے ادھل گئی۔ ذاتی رقابت اور شخصی حرص و آرزو کے اثر مناک مناظر سب کے سامنے آنے لگے۔ چودہری شہاب الدین کی انتہائی خواہش تھی کہ ذمہ دار حسین کے جانے کے بعد ریونیو ممبری کا منصب انہیں ملے اس ضمن میں انہیں اپنے ہم زلف میاں احمد یار خاں دولتاناہ کی امداد پر پورا بھروسہ تھا۔ احمد یار خاں دولتاناہ کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ مخلص و وفا شعار دوست تھے۔ اور دوست کی کامیابی پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنا اور شب و روز محنت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ احمد یار خاں دولتاناہ سرسکندر حیات خاں کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اور سرسکندر خود پنجاب کی ریونیو ممبری کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ چودہری شہاب الدین اور سرسکندر کی اس باہمی کشمکش میں احمد یار خاں دولتاناہ نے سرسکندر کا ساتھ دیا۔ اور شہاب الدین کو، کسی نہ کسی طرح، دست بردار ہونے پر راضی مند کر لیا۔ لیکن ناکامی کا یہ داغ چودہری شہاب الدین کے سینہ پر ہمیشہ تازہ رہا۔ اور انہوں نے سرسکندر کو کبھی معاف نہ کیا۔

اگست ۱۹۳۳ء میں جب کونسل کے نئے انتخاب ہوئے۔ تو وزارت کی رتہ کشی شروع ہو گئی۔ چودہری شہاب الدین کی ہر ممکن کوشش تھی کہ ملک فیروز خاں ٹون دوبارہ وزیر بننے پائیں۔ پہلے انہوں نے کونسل کے مسلمان ممبروں کو اپنے لئے ہموار کرنا چاہا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ انکی

کامیابی کے امکانات چنداں روشن نہیں۔ تو انہوں نے فوراً چودہری ظفر اللہ خاں کو بڑھا دیا۔ اب ملک فیروز خاں نون اور چودہری ظفر اللہ خاں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس مقابلے میں سرسکند بھی فیروز خاں نون کے خلاف تھے۔ کم از کم ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ زیدیا بگڑ، عمر کوئی وزیر بن جائے۔ لیکن فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کی کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہو۔ مصیبت یہ تھی کہ اس ساری تگ و دو کا یہی حقیقی سبب یہ تھا کہ فیروز خاں نون کی وجہ سے شاہ پور کی ملک برادری کا اثر دسوں عسویے بھر میں پھیل گیا تھا۔ اور اٹک اور ملتان کے زبیدار شاہ پور کے اس روزا فرزدں اقتدار کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ میاں فضل حسین کی سہروردی ملک فیروز خاں نون کے ساتھ تھی۔ اور اگرچہ ان کی کوشش سے فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کا منصب مل گیا۔ لیکن پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں میں سخت سچوٹ پڑ گئی۔ چودہری شہاب الدین سرسکند حیات خاں۔ ملک فیروز خاں نون۔ چودہری ظفر اللہ خاں۔ میاں احمد یار خاں دو تانہ۔ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی جنگ میں مصروف تھا۔ اور یوں وہ ریت کی دیوار، جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا، باہمی تقابلیت کی ہاڈھر کے ایک ہی ٹھونکے سے ہلنے لگی۔

ہندوؤں میں سے ڈاکٹر گوکل چند نازنگ کو وزیر بنایا گیا جو اپنی ہندو سماجی ذہنیت کے لئے دور دور تک مشہور تھے۔ سرکاری بلاک سر اسرگور نر کے زیر اثر تھا۔ شہری مسلمان یوں برگشتہ خاطر تھے کہ



الکیشن کے دوران میں ملک فیروز خاں نون نے شہری مسلمان امیدواروں کے مقابلے میں دیہاتی امیدواروں کی مدد کی تھی۔ اس طرح گویا انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا بڑے سے بڑا رکن بھی اُس زہرا نود عصبیت سے پاک نہیں ہے۔ جس نے شہری مسلمانوں پر ترقی کی تمام باہیں بند کر رکھی تھیں۔ خود یونینسٹ پارٹی کے اندر اس حد تک تفرقہ پھیل گیا تھا۔ کہ کئی بار اس پارٹی نے رائے شماری کے وقت ملک فیروز خاں نون کے خلاف ووٹ دیا۔ سال بھر کے اندر یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد گھٹنے گھٹتے صرف چونتیس رہ گئی تھی۔ جن میں سے بتیس مسلمان اور صرف دو سندھو تھے۔ اس طرح اقتصادی بنیادوں پر مخلوط پارٹی بنانے کا جو ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا وہ سر فضل حسین کے دہلی رجسٹ ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

سر سکندر حیات خاں پانچ سال تک پنجاب کے ریونیو ممبر رہے۔ اس دوران میں اُنھیں دو مرتبہ قائم مقام گورنر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ انہیں معلوم تھا کہ سر فضل حسین جب پانچ سال کے بعد حکومت سندھ کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر واپس پنجاب آئیں گے۔ تو اس صوبے کی تمام حکومت ان کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ سر سکندر کو خود اپنا مستقبل بنانے اور اپنی حیثیت مضبوط کرنے کی فکر تھی۔ کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کی ایک مقبول تعداد سر سکندر کے ساتھ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میاں احمد یار خاں دولتانہ کی دوستی ہر آڑے وقت میں اُن کی پشت دپناہ بن سکتی تھی۔ سندھوؤں میں راجہ نرندر ناتھ کے ساتھ اُن کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ ان حالات کی

موجودگی اور سرفضل حسین کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر سرسکندرنے اپنی جڑیں معنوبط کرنا شروع کیں۔ پانچ سال تک مسلسل دپہم میاں فضل حسین کے خلاف پراپاگنڈہ جاری رکھا گیا کہ وہ مشرقی پنجاب کے شہری باشندے ہیں۔ دیہاتی نہیں ہیں۔ پیٹھے کے اعتبار سے بیرسٹر ہیں۔ زمیندار نہیں ہیں۔ نظریہ ظاہر انہیں مغربی پنجاب کے زمینداروں سے کوئی بہرہ رومی نہیں ہو سکتی۔ یہ محض زمینداروں کی بے خبری اور سادہ لوحی ہے کہ انہوں نے نو سال تک ایک شہری مسلمان کو اپنا لیڈر بنائے رکھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مغربی پنجاب کے زمیندار بیدار ہوں۔ اور ایک ایسے شخص کو اپنا لیڈر بنائیں جو ان کا ہم پیشہ اہم دشمن ہم مشرب اور ہم دروہ۔

سرسکندرنے متواتر پانچ سال تک مغربی پنجاب کے زمینداروں میں یہ خیالات راسخ کرنے کی کوشش کی۔ یوں سبھی ریوینو نمبر کی حیثیت سے انکا سرکاری اثرو رسوخ مسلم تھا۔ نواب مظفر شاہ کی لاہور میں موجودگی ان کے لئے بڑی اعانت کا باعث تھی۔ چنانچہ سکندر۔ دیہات اور مظفران نینوں کی متفقہ کوشش سے میاں فضل حسین کے خلاف شرت سے پراپاگنڈہ جاری رکھا گیا۔ یہ سبھی زمانے کی ستم ظریفی تھی کہ شہری دیہاتی کی وہ تفریق جسے میاں فضل حسین نے محض اپنی بیداری کو برقرار رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ خود ان کے خلاف ایک مؤثر حربے کے طور سے استعمال کی جا رہی تھی۔ تاریخ سیاہ فیصلہ ہے کہ جو ہتھیار ہم غنیم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہی ہتھیار اُلٹ کر ہمارے خلاف بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ سر فضل حسین کے بارے میں تاریخ

اپنا ہی فیصلہ ڈسرا ہی تھی۔ چنانچہ جب پانچ سال کی میعاد ختم کر کے سرسکندر پنجاب سے رخصت ہوئے۔ تو انہیں الوداع کہتے وقت راجہ نرنندنا ستھ نے کونسل کے ایوان میں کہا تھا کہ "یہ عارضی جدائی ہے۔ اور دو سال کے بعد آپ پنجاب کے وزیراعظم بن کر یہاں تشریف لائیں گے۔"

میاں فضل حسین دہلی میں بیٹھے ہوئے سب کچھ سن رہے تھے۔ پنجاب میں چودہری شہاب الدین۔ ملک فیروز خاں نون اور چودہری چھوٹو رام ان کے سب سے بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن میاں فضل حسین نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کا مقابلہ ایک ایسے شخص کے ساتھ آپڑا ہے۔ جس نے اندر ہی اندر نہایت ہوشیاری سے ان کے گھر میں نقب لگا دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دماغی اور علمی عمالیت کے اعتبار سے سرسکندر میاں فضل حسین سے کمتر تھے۔ لیکن مغربی پنجاب کے زمینداروں میں ان کی رشتہ داریاں قریبتیں اور خاندانی مراسم اس قدر وسیع تھے کہ وہ محض اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ایک مضبوط جتھہ بکھرا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسکندر ایک زندہ دل۔ محفل آرار۔ متواضع۔ وہاں نواز اور دوست پرور آدمی تھے۔ جب وہ کرتے اور تہہ میں ملبے اپنے دیہاتی بھائیوں میں انتہائی بے تکلفی سے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ تو ان کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان کسی غیریت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میاں فضل حسین ان حضرات سے محروم تھے۔ دائم المرض ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں رکھائی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کم سخن تھے۔ لوگوں سے ملتے جلتے بھی کم تھے۔ اور زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہ تھے

ان کا سارا رهن سہن۔ انداز نشست و برخاست اور طرز پود و پاندالیا سٹھا۔ جس میں  
 "دیپا تیت" نام کو نہ سٹھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مہاں فضل حسین حکومت ہند سے  
 سبکدوش ہو کر واپس پنجاب آئے۔ تو یونیورسٹی پارٹی اور حصوں میں تقسیم ہو چکی  
 تھی۔ اور سرگندہ کی قیادت میں اس پارٹی کا ایک طاقتور عنصر فضل حسین  
 کی لیڈری کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہ سٹھا۔

سن ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی سیاست بھی ایک عجیب و غریب زور سے گذر  
 رہی تھی۔ سہگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں  
 ہم سینیک کر۔ اور سائڈرس کو گولی کا نشانہ بنا کر۔ اگر ایک طرفت حکومت کو  
 دہشت زدہ کر دیا سٹھا۔ تو دوسری طرفت ہم تعلیم یافتہ ہندو بوجوالوں میں  
 مرنے مارنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا سٹھا۔ کانگریس نے اجلاس لاہور کے بعد سہول  
 نامہ رانی کی قہار داد منظور کر لی تھی۔ ۱۳ مارچ سن ۱۹۳۱ء کو جب دہاتما گاندھی  
 ساہی مشی آئٹھم سے پید ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ تو انہوں نے اعلان  
 کیا سٹھا کہ وہ سمندر کے کنارے پہنچ کر نمک لٹ قانوں طریقے سے نمک بنائیں گے  
 گاندھی جی کے اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے ہر حصے میں کلم کلم  
 قانون شکنی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ چند ہی مہینوں کے اندر پورا  
 ہندوستان اس طرف بھڑک اٹھا۔ گویا سی نے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھا  
 دی ہے۔ ہندو عوام میں جو اسب تک اس سیاسی تحریک میں شامل نہیں ہوئی تھیں  
 ہزاروں کی تعداد میں گھروں سے نکل آئیں۔ اور بڑے بڑے جلسوں مرتب کر کے  
 محلوں اور بازاروں میں گھومتے لگیں۔ طلبہ نے کالجوں کو خیر باد کہہ کر

رضا کاروں کی وردی پہن لی۔ کسانوں اور کاشتکاروں نے مالیا ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ بدیشی کپڑے اور شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ شروع ہو گیا۔ بعض سرکاری ملازموں نے نوکری کرنے کے بجائے قومی تحریک میں شریک ہونے کو ترجیح دی۔ غرض کہ دیکھتے ہی دیکھتے میانگرس اور حکومت کے درمیان وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔ جس میں ہزاروں رضا کار گرفتار ہوئے۔ جگہ جگہ گولی چلی۔ لوگ مرے۔ قیدیوں سے جیل بھر دیئے گئے۔ کہیں ستیہ گروہ کرنے والوں کی جائدادیں سبھی ضبط ہوئیں۔ اس ہنگامے میں اگرچہ بہت سے مسلمان بھی شریک تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بن جیٹ القوم سول نافرمانی سے الگ تھلک ہے۔ ۱۹۲۱ء کے ترک موالات کی تحریک میں تو مسلمان مقدمہ الجیش کی طرح آگے آگے تھے۔ لیکن سنیانہ کی سول نافرمانی میں ان کی شرکت مختصر و محدود تھی۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ ڈاکٹر اچچو اور وہ گروہ جس نے بعد میں احرار کے نام سے شہرت حاصل کی تھی۔ اس تحریک میں شریک ہو کر قیادیند کاشکار ہوئے۔ لیکن عام مسلمان محض تاشانی کی حیثیت سے اس جنگ کا نظارہ کرتے رہے۔

ابتدائی طور پر سول نافرمانی کی تحریک کا باواسطہ اثر بہت زیادہ ہوا اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد انگریزی حکمرانی کی ابتداء سے سرزمین بے آئین چلا آ رہا تھا۔ اور وہاں کی آبادی کا تعلیم یافتہ عنصر اپنے آپ کو سندھوستان کے دیگر حصوں کے مقابلہ میں پس ماندہ اور فردتر پا کر سخت پریشان رہتا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں منٹو مارے اصلاحات

پورے ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ لیکن صوبہ سرحد کو محروم رکھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں مانٹیلو چیف قورڈ اصلاحات کا نفاذ پورے بڑے عظیم میں ہوا۔ لیکن صوبہ سرحد پھر محروم رہا۔ حد یہ ہے کہ پشاور کی میونسپل کمیٹی میں انتخاب کی بجائے حکومت کی خوشنودی سے مجرنا مز رکھنے جاتے تھے۔ تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے بھی حکومت نے جان بوجھ کر اس صوبہ کو حد درجہ بد حال اور پستی کے عالم میں رکھا ہوا تھا۔ اصلاح معاشرت کی بے ضرورت سے بے ضرورت تحریک کو بھی حکومت جبر و تشدد سے دبا دیتی تھی۔ آخر ۱۹۳۰ء میں سید قائم شاہ اور عبدالغفار خاں کی کوششوں سے اٹمان زئی ہیں ایک افغان جہرگہ منعقد ہوا۔ جس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے لوگوں میں اصلاح معاشرت کی تحریک شروع کی جائے۔ اور انھیں فاضول خرچی، اسراف، مقدمہ بازی اور خانہ جنگی سے باز رکھا جائے۔ جہرگے کے تحت خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کی گئی۔ جن کا امتیازی نشان سرخ نمین تھا۔ یہ لوگ ہندو پیرن ہند کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کا مقصد صرف اسپتال سبھانی بندوں کی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ حکومت نے حد درجہ طاقت ناندیشی سے اس جماعت کو کچلنا چاہا۔ لیکن حکومت کے اس طرز عمل کے جواب میں تحریک روز بروز مقبول ہونے لگی۔ اور رضا کار زیادہ تعداد میں بھرتی ہوتے لگے۔

اسی زمانے میں پنجاب میں کانگریس کی سول نافرمانی اپنے عروج پر تھی۔ اور حکومت کو ہر گھڑی اندیشہ تھا کہ اگر سول نافرمانی کے جہاتیم صوبہ سرحد میں بھی

داخل ہو گئے تو پھر یہاں اس آگ کو بجھانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس نے  
 ننان عبدالغفار خاں، میاں احمد شاہ، خان سلی گل خاں اور سید لال بادشاہ  
 وغیرہ کو گرفتار کر کے تین تین سال کے لئے جیل میں ڈال دیا۔ تحریک کا اخبار  
 پختون ضبط کر لیا گیا۔ اور اُتمان زئی پر چھاپہ مار کر مرکزی دفتر پر قبضہ کر لیا۔  
 جب حکومت کے اس جاہلانہ سلوک کے خلاف لوگوں نے پشاور کے قصبہ خوانی  
 بازار میں پرامن مظاہرہ کرنا چاہا۔ تو حکومت نے چھاپہ زنی سے گورا فوج منگوالی  
 جس نے عین بازار میں ٹینک اور توپیں رکھ کر ہتھیے آدمیوں پر گولہ باری شروع  
 کر دی۔ پہلے حملے میں ڈیڑھ گھنٹے کے حکم سے گولی چلائی گئی۔ جس میں بارہ  
 آدمی مرے۔ جب لوگوں نے اس کے باوجود منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اور  
 اس بات پر اصرار کیا کہ شہداء کی ماسٹیں بچھیر تو کھین کے لئے اُن کے  
 حوالے کی جائیں تو حکومت نے توپوں کے منہ کھول دیئے۔ اور دتتو کے  
 قریب آدمی شہید ہو گئے۔

عین اُس وقت جب صوبہ سرحد کے باشندوں کے خون سے پشاور کی سڑکیں  
 لالہ زار بن رہی تھیں۔ سندھ و مستان بھر میں کوئی اسلامی جماعت، کوئی اسلامی  
 انجمن، کوئی اسلامی ادارہ ایسا نہیں تھا۔ جو مدائے احتجاج بلند کرتا۔ اور حکومت  
 سے پوچھتا کہ یہ کس جرم کی پاداش میں مسلمانوں کا خون بہا یا جا رہا ہے مسلم لیگ  
 ختم ہو چکی تھی۔ اِنہائے زماں کی ناقدری کے ہاتھوں جناح وطن میں رہنے کے  
 باوجود غریب الوطن کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ محمد علی مرض الموت میں  
 مبتلا اپنی زندگی کا آخری سال پورا کر رہا تھا۔ سر محمد شفیع، میاں فضل حسین

اور آغا خاں کی کوشش سے جو مسلم کانفرنس معرض وجود میں آئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں اپنی طویل قرارداد منظور کر کے گویا اپنا فرض سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کا وہ فعال، گرم جوش اور تہہ و پیشہ عنصر جو کسی صورت میں بھی عافیت کی زندگی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ غیر مشروط طور پر کانگریس میں شریک ہو کر قیود بند کے شدید برداشت کر رہا تھا۔ حکومت نے سو پہر حد میں۔ مارشل لا جاری کر کے۔ اس صوبے کے چاروں طرف ایک آہنی دیوڑھی کھینچ دی تھی تاکہ توپوں کی گیند اور مرینے والوں کی چیمیں باہر نہ سنائی نہ دے سکیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لپٹا در سے لے کر در اس تک کے مسلمان جاگ اٹھتے۔ اور بیک آواز اپنے بھائیوں کے خون کا نقصان طلب کرتے۔ لیکن وہ قوم جس نے چند سال قبل ترکوں کے مصائب سے بے قرار ہو کر خلافت جیسی ہمہ گیر تحریک چلائی تھی۔ سرحد کے مسلمانوں پر جو بدستہ کی بارش دیکھ کر بھی جنبش نہ کر سکی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی بے حسی کا اس سے دل خراش منظر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

آخر کار وقت کی نینا کت کا احساس کر کے کانگریس اٹھی۔ اور اس نے ڈیٹھل بھائی پٹیل سابق صدر مرکزی اسمبلی کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ جس نے حکومت کے معاندانہ رویہ کے باوجود اپنا ور خبا کر ان منظم کی پوری چوہان پٹھک کی اور اسپس آ کر اپنی مفصل، جامع اور حقائق کو دانشکارت کر دینے والی رپورٹ شائع کی۔

اس رپورٹ نے حقیقت کے چہرے پرست نقاب اٹھائی۔ اور لوگوں کو



معاہدہ ہوا کہ انگریزوں کی شدت سے بچھانوں کی بہادر اور شجاع قوم کو مٹا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کانگریس کی اس سہرا دی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرخ پوشوں کی تحریک آگے چل کر کانگریس میں مدغم ہو گئی۔ اور عبدالغفار خاں اور ان کے رفقاء ۱۹۲۷ء تک کانگریس کے دست و بازو بنے رہے۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب انگیز بھی نہ سمجھا۔

سوال یہ ہے کہ اس پر خطر اور نازک دور میں ہندوستان کے مسلمان کیا کر رہے تھے۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ مسلم کانفرنس کی باگ ڈور میں فضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اب دہلی پس پردہ بیٹھ کر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی تشکیل کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر مسلم کانفرنس کے لئے حیدرآباد و دکن، اور آغا خان سے بہت بڑی رقمیں حاصل کیں۔ اور اس روپے کو نشر و اشاعت پر صرف کیا۔ انگلستان اور ہندوستان میں بعض آدمیوں کو معقول تنخواہ دے کر تشریحی پمپا گنڈے پر مامور کیا ہندوستان خصوصاً پنجاب کے چند اردو اور انگریزی اخباروں کے پیش قرار و ظائف مقرر کئے۔ اس کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ قائم کر کے نہایت ہوش مندی سے پبلٹی کا کام شروع کیا گیا۔ بعض لیڈروں کو بھی مالی امداد دی گئی۔ اس طرح ایک باضابطہ اور مرتب شدہ سکیم کے تحت کانفرنس کی قراردادوں۔ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں پر کھلے دل سے روپیہ صرف ہونے لگا۔ ہر چھوٹے ہینے کے بعد ہندوستان کے کسی نہ کسی مقام پر کانفرنس کا ایک

۱۔ سوانح عمری میان فضل حسین (انگریزی) از عظیم حسین :

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

اجلاس بھی منعقد کر دیا جاتا تھا۔

مولانا شوکت علی - ڈاکٹر شفاعت احمد خاں - علامہ اقبال - سر محمد حقیوب -  
 سیٹھ عبداللہ ہارون - سر محمد شفیع - نواب اسماعیل خاں - سر عبدالرحیم وغیرہ  
 کانفرنس کی نمایاں اور ذمہ دار شخصیتیں تھیں۔ کانفرنس کی تمام جزئیات سر  
 فضل حسین کے ایسے اور مشورے سے طے ہوتی تھیں۔ اور جب تک وہ کسی پروگرام  
 کی منظوری نہ دیتے۔ کانفرنس اس کو اختیار نہ کرتی تھی۔ سر فضل حسین کی  
 سیاسی بصیرت کا کمال ہے کہ وہ خود حکومت ہند کے رکن کی حیثیت سے وائسرائے  
 کو بار بار مسلم کانفرنس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ  
 انہوں نے وائسرائے اور حکومت ہند کے ارکان کو یقین دلادیا تھا کہ مسلم کانفرنس  
 اسلامیان ہند کی تمہا ناماندہ جماعت ہے۔ اور اگر آئندہ مسلمانوں کے سیاسی  
 مسائل حل کرنے کی نوبت آئی۔ تو حکومت کو صرف مسلم کانفرنس کے نمائندوں  
 سے گفت و شنید کرنا ہوگی۔

میاں فضل حسین مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ، سہرورد اور فخلص رہنما تھے۔ ان  
 کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی زیر کی اور دشمنی سے انکار نہیں کر سکتا لیکن  
 ان کا کام کرنے کا انداز جداگانہ تھا۔ انہیں سب سے زیادہ اپنی ذات  
 پر اعتماد تھا۔ اور یہ خود اعتمادی اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ وہ کسی اور کی  
 رائے کو حتی الامکان درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ فضل حسین کی اگرچہ ابتدائی  
 سیاسی تربیت کانگریس اور مسلم لیگ کے گہوارہ میں ہوئی تھی لیکن انہوں نے  
 ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک میں شامل ہونے کی بجائے وزارت کی

منذ قبول کرنے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں ناکام ہوئیں۔ اور ردِ عمل کے طور پر مسلمانوں میں بڑی شدت سے ذہنی اور اقتصادی انتشار پھیلنا شروع ہوا۔ تو میاں فضل حسین کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کسی قسم کی عوامی تحریک چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس قوم کو اگر تباہی سے بچانا مقصود ہے۔ تو آئندہ اسے ہر نوع کی عوامی تحریک سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک انہوں نے پنجاب میں یہی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ اور مسلمانوں کو ہمیشہ حکومت کے خلاف صفت آراء ہونے یا عوامی تحریک چلانے سے روکے رکھا۔ ان کے اس سیاسی رویے کو اگر کسی قدر وضاحت سے بیان کیا جائے۔ تو وہ یہ ہے کہ ”عوام کا لالعام ہیں۔ ان کی سیاسی بصیرت ناقص ہے۔ ان کے کسی سیاسی تحریک میں کام لینا عقلمندی کے خلاف ہے۔ میں مسلمان قوم کی ضروریات سے خوب واقف ہوں۔ اس لئے مجھ پر اندری بصیرت پر اعتماد کرو اور تمام کام مجھی پر چھوڑ دو۔“

اپریل ۱۹۳۰ء میں جب سر فضل حسین دہلی پیمنٹ چلے گئے تو انہوں نے اپنے انہی قاعدوں کے مطابق کام شروع کر دیا۔ موبہ سرحد میں جب انگریزوں نے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ تو میاں فضل حسین کو سب سے بڑی فکر یہ لاحق ہوئی کہ کہیں ان خوں چکان واقعات سے متاثر ہو کر پنجاب کے خلافتی ایڈمسٹریٹو کو منظم کر کے کوئی تحریک شروع نہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً پنجاب کے گورنر سر جی آرنے ڈی موٹ مورلٹی کو لکھا کہ وہ مسلمانوں میں سے فلاں فلاں شخص کو بلا کر تارکدکریں کہ سرحدی مسلمانوں کی بہ روی میں

لوگوں کو مشتعل نہ کیا جائے۔

اسی طرح جب کانگریس کی سول نافرمانی کا اثر زور و زور دیا گیا پھیلنے لگا۔ اور بعض مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی تحریک سے الگ تفرک رہنا خود انکی قوم کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ انگریز اور کانگریس کی اس جنگ میں مسلمانوں کا کٹھن تماشائی بن کر مہلہ دیکھتے رہنے سے قوم میں جبن اور پرولی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ تو میاں فضل حسین نے فوراً پنجاب میں زمیندارہ لیگیں قائم کرائیں اور ان لیگوں کے ذریعے سے پنجاب کے دیہات میں کانگریس کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپاگنڈہ کیا گیا۔ - سندھوستان کے تمام صوبوں کی دیہاتی آبادی سول نافرمانی کی تحریک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل تھی۔ لیکن پنجاب کی دیہاتی آبادی کو چھوٹی موٹی کے پودے کی مانند اس طرح محفوظ رکھا گیا تھا کہ اس پر سیاسیات کے شجر ممنوعہ کا سایہ بھی نہ پڑ سکتا تھا۔ سرمایگیل وڈو اور کی یہی پالیسی تھی۔ جس پر ایک زمانے میں میاں فضل حسین نے شدید نکتہ چینی کی تھی زمانے کی نیرنگی ہے کہ آج وہ خود اسی پالیسی پر کاربند تھے۔ لیکن اس پالیسی کا نتیجہ کیا نکلا؟ قوم میں بڑی سرعت سے جمود۔ بے حسی اور تعطل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ کوئی قوم محض چوٹی کے دو، چار یا پان، دس افراد کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ قوم کی اصل زندگی کا راز خود قوم کی زندگی میں مضمر ہے۔ چنانچہ میاں فضل حسین ایسے زیرک آدمی سے یہ راز

۱۔ سوانح عمری صفحہ ۲۶۷ - ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۶۷

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ انہوں نے ۲۹ جولائی ۱۹۳۱ء کو بڑے اندوگہی لہجے میں سر محمد یعقوب کو ایک خط میں لکھا :

..... "مسلمانوں کے بائے میں مجھے سب سے زیادہ فکریہ ہے کہ انہیں یوں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کی بجائے اپنی اور اپنے ملک کی بہتری کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ بحالات موجودہ وہ محض تاشانی بن کر سند سیاست دانوں اور حکومت کی باہمی جنگ کا نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مسلمان لیڈر وقتاً فوقتاً یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو سول نافرمانی کی تحریک سے دور رہنا چاہیے۔ لیکن یہ تو محض ایک قسم کا منفی طرزِ عمل ہے وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی تعمیری منصوبہ مرتب کیا جائے اور بہتر تنظیم کھڑی کی جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے پروگرام میں یہ چیز بھی شامل ہونی چاہیے کہ تعمیر و ترقی کی مقامی تحریکوں میں زیادہ قوت پیدا کی جائے۔ ہمیں ان عزائم کو لے کر آگے بڑھنا چاہیے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس دوطرفہ میں ہم اپنا سب سے بچھے رہ جائیں گے" وہ کون سی تنظیم۔ کون سا منصوبہ۔ اور کون سی مقامی تحریکیں تھیں۔ جن کی طرفت میاں فضل حسین نے اس مکتوب میں اشارہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم کانفرنس کے سوا اور کوئی تحریک یا تنظیم یا منصوبہ

سلہ سوانح عمری ص ۲۲۶

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

میاں افضل حسین کے ذہن میں نہیں تھا۔ احرار کی تحریک کو میاں افضل حسین نے جس طرح ختم کیا۔ وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ مسلمانوں میں کسی عوامی تحریک کے وجود کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔

سول نافرمانی میں مسلمانوں کے اس گردہ نے جو آگے چل کر احرار کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنی استعداد سے بڑھ کر قربانیاں کی ستمیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چودہری افضل حق۔ مولوی منظر علی انظر۔ مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی اور ان کے بیسیوں رفقاء نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن مارچ ۱۹۳۱ء میں جب کانگریس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو ہاتھ کا ندھی کی خواہش تھی کہ پنجاب کے کسی مسلمان کو کانگریس کی مجلس عاملہ درکنگ کمیٹی میں لیا جائے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ کسی موزوں آدمی کی سفارش کیجئے۔ مولانا نے مولوی عبدالقادر قصوری سے ذکر کیا۔ اور مولوی عبدالقادر نے جھٹ اپنے دوست ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کر دیا۔ اور یوں ڈاکٹر عالم کانگریس کی درکنگ کمیٹی میں شامل کرنے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ساتھیوں کو اس واقعہ سے سخت رنج پہنچا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ درکنگ کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز چودہری افضل حق کو ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم کا پنجاب میں قطعی کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ مسلمانوں کا کوئی گردہ ان کی لپٹ پر نہ تھا۔ اور وہ سوائے اپنی ذات کے پنجاب کے کسی قابل ذکر ادارے کی نمائندگی کا دعوے نہ کر سکتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء نے محسوس کیا کہ کانگریس

نے ان کی قربانیوں کی کوئی قدر نہیں کی اور ان کی خدمات کو ٹھکرا کر ایک ایسے شخص کو اپنا معتمد بنا لیا ہے۔ جو اعتماد کا اہل نہ تھا۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر اس پورے گروہ نے کانگریس سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ کراچی سے واپس آتے ہی مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ اور کانگریس سے اپنا تعلق منقطع کر کے اس مجلس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق اور جداگانہ نیابت کا اعلان کر دیا۔

یہ بڑی مبارک گھڑی تھی کہ مسلمانوں کا سب سے فعال اہلند آہنگ اور ایشیا پیشہ عنصر حجاب تک کانگریس سے وابستہ چلا آ رہا تھا۔ اغیار سے کٹ کر دوبارہ انہوں نے ساتھ آہل تھا۔ اس واقعہ کو خوش آمدید کہنا اور مجلس احرار کے قیام کو فانی نیک مقصود کرنا ضروری تھا۔ لیکن میاں فضل حسین کو اندیشہ ہوا کہ یہ جماعت مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی عوامی تحریک چلائے گی اور ان کے تمام لیڈر مسلمانوں کے متوسط یا غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اور عوام کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔ ان کا ربط و ضبط۔ ان کا خطاب و کلام۔ ان کے تعلقات و مراسم براہ راست عوام کے ساتھ تھے یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی آواز بلند کی تو اس کی بازگشت مسلمانوں کے اس طبقے سے اٹھی۔ جو قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسے

---

لے پنڈت جواہر لال نہرو نے افراد اشخاص کا نام لے بغیر اس واقعہ کا ذکر اپنی خود نوشت

سوانح عمری میں کیا ہے صفحہ ۲۶۹ - طبع ۱۹۴۹ء

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

نظر انداز کئے بغیر قومی بیداری کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

احرار نے اگست ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر شروع کی۔ کشمیری مسلمانوں کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ اس سے قبل حدودِ ریاست کے اندر اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ لیکن اس کا اثر محدود تھا۔ اور ریاست کا ڈوگرہ حکمران اس تحریک سے چنداں متاثر و مرعوب نہیں تھا۔ جب احرار نے اس طرف توجہ کی تو پورا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ سیالکوٹ اس تحریک کا محاذ تھا۔ وہاں سے احرار ہی جتھے جموں کی طرف کوچ کرتے تھے اور حدودِ ریاست پر پہنچتے ہی ریاستی حکومت انھیں گرفتار کر لیتی تھی۔ ڈوہینے کے اندر اس تحریک کا یہ عالم تھا کہ سیالکوٹ سے جموں تک پچیس میل کے فاصلے میں گویا کئی بستیاں آباد ہو گئی تھیں۔ جہاں صبح و شام اور دن رات ہزاروں رضاکار کوچ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ پچیس میل کی اس پوری مسافت میں شروع سے آخر تک جتھوں کا ایک تاننا بندھا ہوا تھا۔ اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر پورا ہنستے کھیلنے لگے۔ گرفتار ہونے کے لئے جاتے تھے گویا عید کی نماز پڑھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ اکتوبر کے آخر تک گرفتار ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور ہاراجہ پر ایک سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ آخر اس نے گرفتار ہونے والی حکومت ہند سے مدد طلب کی۔ اور وائسرائے کو ریاستی معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ اس طرح کلینسی کمشنر کا تقرر ہوا۔ اور دوبارہ کشمیر کو طوعاً و کرہاً اُسے عاقبت کے سامنے جھکنا پڑا۔

تحریک کشمیر نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی خاکستریں اب بھی



ایسی چنگاریاں دہی ہوئی ہیں۔ جو بوا کے ایک جھونکے سے شعلوں کی طرح لپکنے لگتی ہیں۔ مسلمان جو کانگریس کی سول نافرمانی کے ہنگامے دیکھ دیکھ کر فرعون ہوئے جا رہے تھے۔ اب مرہٹن تھے کہ ان کے دست و بازو میں بھی اتنی قوت ہے کہ وہ کشمیر کے متکبر و مغرور حکمران کو سرنگوں کر سکتے ہیں۔ اگر میاں فضل حسین اُس وقت احرار کی بیخ کنی پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ تو یہ جماعت آئندہ مسلمانوں کے لئے یقیناً بڑی مفید ثابت ہوتی۔ لیکن میاں فضل حسین کی سیاست میں احرار کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ احرار کو اس بات کا فخر تھا کہ ان کی رسائی عوام تک ہے۔ اور وہ عوام ہی کے سہارے آگے بڑھیں گے۔ میاں فضل حسین ہرے سے عوامی تحریکوں کے مخالف تھے۔ وہ صرف اپنی فراست سے بساط سیاست کے چند مہروں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر حرکت دے کر بازی چیتے کے قابل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک کشمیر ختم ہوتے ہی احرار نے اپنی توپوں کا رخ میاں فضل حسین کی طرف پھیر دیا۔ اور جب تک میاں فضل حسین زندہ رہے۔ احرار نے انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیا۔ قادیانیت کی مخالفت بھی اسی جھگڑے کا ایک شاخسانہ تھی۔

افسوس ہے کہ میاں فضل حسین کی قابل رشک سیاسی بصیرت اور احرار کی حیرت انگیز قوت عمل متحد ہو کر مسلمانوں کی خدمت نہ کر سکی۔ یہ دونوں چیزیں بہت بڑی نعمت تھیں۔ جس طرح بصیرت کے بغیر محض عمل کی قوت اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح عمل کے بغیر محض بصیرت انسان کو مفلس

کردیتی ہے۔

کانگریس کو یہ دونوں چیزیں میسر تھیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی بہت کم سیاسی تحریکیں ایسی تھیں۔ جن میں ان دونوں محاسن کا اجتماع ہوا اور تحریک کشمیر کے بعد احرار بعض ذرعی اور بے مصرف باتوں میں اُلجھ کر اپنی قوتِ عمل کو ضائع کرنے لگے۔ قادیانی فتنے کا ڈھونگ بھی صرف میان فضل حسین کی مخالفت کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ حالانکہ قوم کے بعض بے حدام سیاسی امور اور اقتصادی مسائل اُن کی توجہ کے طلب گار تھے۔ احرار نے بار بار مسلم کانفرنس پر حملے کئے۔ میان فضل حسین کو قادیانیت نواز کہہ کہہ کر ہندوستان بھر میں اُن کے خلاف پراپاگنڈہ کیا گیا۔ یہ سب کچھ سراسر محنت اور وقت کا زیاں تھا۔ اگر احرار کے حسبِ منشاء قادیانیت کا استیصال بھی ہو جاتا۔ تو بھی مسلمانوں کے سیاسی مسئلہ کا تشفی بخش حل ممکن نہ تھا مصیبت یہ تھی کہ احرار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ میان فضل حسین اُن کے راستے میں حائل ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے سب سے پہلے اس سنگِ گراں کو راہ سے ہٹا دینا ضروری سمجھا۔ ہوش مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ تحریک کشمیر سے فارغ ہو کر احرار کوئی سیاسی اور اقتصادی پروگرام ترتیب کرتے اور مسلمانوں کی بے پناہ قوت کو سامنے لے کر اس پروگرام کی تکمیل کے لئے آگے بڑھتے۔ لیکن انہوں نے زور رنج اور شتعل ہو کر میان نسنب حسین سے جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ کا نتیجہ خود اُن کے لئے اچھا نہ نکلا اور یاں فضل حسین کے حربوں نے انہیں ۱۹۳۵ء میں شکست فاش دے کر مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے خارج کر دیا۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

عین اُس وقت جب کانگریس کی سول نافرمانی شروع ہوئی۔ والسٹرائے نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کا دستور وضع کرنے کے لئے عتقریب لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جس میں ہندوستان کی تمام قوموں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ کانگریس نے والسٹرائے کے اس اعلان کو قطعاً قابلِ اعتنا قرار نہ دیا۔ لیکن ہندوؤں۔ مسلمانوں اور سکھوں کے اُس طبقے نے جو کانگریس میں شامل نہیں تھا۔ مجوزہ گول میز کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کا انتخاب کس اصول اور کس قاعدے سے ہوگا۔ اس بارے میں والسٹرائے نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندو۔ مسلمان اور سکھ نمائندوں کا انتخاب خود اپنی مرضی اور صوابدید سے کریں گے۔ لیکن بظاہر اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر قابلِ ذکر سیاسی گروہ کو جائز نمائندگی عطا کی جائے۔

میاں فضل حسین بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اگر گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وہ مطالبات تسلیم نہ کئے گئے۔ جن کو مسلم کانفرنس نے مرتب کیا تھا۔ تو آئندہ ہندوستان کی دستوری اور آئینی ترقی میں مسلمان اپنی ہمہایہ قوم سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور اس طرح گذشتہ دس برس کی جدوجہد بالکل رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ ان کی کوشش تھی کہ گول میز کانفرنس میں صرف ان مسلمانوں کو بھیجا جائے۔ جو مسلم کانفرنس کے ممبر اور میاں فضل حسین کی ہدایات کے مطابق کام کرنے کو تیار تھے۔ کانگریس کے

ہم نیاں مسلمانوں نے نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کے نام سے اپنا ایک علیحدہ ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور سکریٹری تسدق احمد خاں شروانی تھے۔ اس جماعت میں بعض ایسے لوگ بھی شریک تھے جو کانگریس کے باضابطہ رکن تو نہ تھے۔ لیکن رائے دہندگی بالغاں کی بنا پر مخلوط اجتماع کے شدید حامی تھے۔ مثلاً سر علی امام۔ سید حسن امام۔ ہمارا چھ محمود آبادی وغیرہ۔

میاں فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کو بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع مل گیا۔ تو باہمی اختلاف پیدا ہوگا۔ اور کانفرنس کے مباحث میں تمام مسلمان اتفاق۔ یکانگت اور یک جہتی سے کام نہیں کر سکیں گے اس طرح مبادا آپس کے تفرقے سے فائدہ اٹھا کر اعیانہ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

فضل حسین کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ اس سے قبل بہر پور پورٹ کے بارے میں کانگریس نے گنتی کے چند مسلمانوں کی آڑ لے کر پوری مسلمان قوم کے احتیاج کو ٹھکرا دیا تھا ہاتھ گاڑھی ایک طرف مسلمانوں کو کورا پنک پیش کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف یہ بھی کہتے تھے کہ جب تک کانگریسی مسلمان غیر کانگریسی مسلمانوں سے اتفاق رائے نہیں کریں گے وہ مسلمانوں کے جداگانہ مطالبات کو تسلیم کرنے سے معذور ہیں۔

ان حالات میں میاں فضل حسین کی پیرائے بالکل درست اور مناسب تھی کہ گول میز کانفرنس میں جانے والا مسلمان وفد ہم خیال، متحد اور ایک پروگرام کے تحت کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں

نے وائسرائے سے کہہ کر ذیلی کے اصحاب کو نامزد کرایا۔ آغا خاں۔ مولانا محمد علی۔  
 مرثاہ نواز سبٹو۔ لڑا ب صاحب چھتاری۔ راجہ شیر محمد خاں۔ مولوی فضل الحق  
 سر عبدالمکریم غزنوی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ حافظ ہدایت حسین۔  
 مسٹر جناح۔ سر عبدالقیوم۔ سر سلطان احمد۔ سر محمد شفیع۔ ڈاکٹر شفاعت  
 احمد خاں اور چودہری ظفر اللہ خاں۔

ان افراد میں صرف مسٹر جناح ایک ایسے شخص تھے۔ جو مسلم کانفرنس  
 کے ممبر نہ تھے۔ اور جن کی آزادی فہم سے میاں فضل حسین خائف تھے۔ اگر  
 فضل حسین کا بس چلتا تو وہ جناح کو اس وفد سے یقیناً خارج کر دیتے۔ لیکن  
 جناح کی سیاسی عظمت جس کے سامنے ان کے بڑے سے بڑے حریف کو بھی  
 سرخم کر دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس قدر دانش اور نمایاں تھی کہ وائسرائے انکو  
 کسی صورت میں بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ مسٹر جناح اپنے چودہ نکات مرتب  
 کر کے عملاً مسلم کانفرنس کے مطالبات کے ہم نوا بن چکے تھے۔ لیکن اس کے  
 باوجود میاں فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ وہ انھیں بوقت ضرورت آسانی سے  
 مرحوب و متاثر نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ  
 گول میز کانفرنس میں جناح کے اثر کو نہیں قدر کم کیا جاسکتا ہے کیا جائے  
 چنانچہ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کو کانفرنس کے لئے نامزد کرنے میں ان سب کے سامنے سب  
 سے بڑا مفصلیہ تھا کہ شفاعت احمد مسٹر جناح کو کھری کھری ناسا سکیں گے  
 اور مئی سن ۱۹۳۰ء کو یو۔ پی کے گورنر سر میکس ہیلی کو ایک خط میں میاں  
 فضل حسین لکھتے ہیں :

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

..... صاف بات یہ ہے کہ میں سرگز نہیں چاہتا کہ مخالفین ہیں صرف جناح تقریریں کرے۔ اور اُسے لوٹنے والا کوئی نہ ہو۔ فردوس اس امر کی ہے کہ اگر جناح اپنی تقریروں میں ایسے خیالات کا اظہار کرنے لگا جائے۔ جو محض اُس کے ذاتی خیالات ہیں اور جن سے ہندوستانی مسلمان قطعاً متفق نہیں۔ تو پھر مخالفین میں ایک آدمی ایسا مضبوط اور نڈر آدمی ضرور ہونا چاہیے جو کھڑا ہو کر جناح کو ڈوبو ڈوبو جواب دے سکے۔ اور یہ کہہ سکے کہ جناح کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات نہیں ہیں۔ بلکہ شبہ یہ بگم شکل بھی ہے اور ناگوار بھی۔ بالخصوص اسی حالت میں جبکہ اُس نوائے کی، جس کے خیالات کی تردید منظور ہے، حیثیت بہت بلند ہو۔ مجھے یقین ہے کہ شفاعت احمد اور ظفر اللہ اس فرض کی بجا آوری سے قطعاً دریغ نہیں کریں گے شفیق کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اُس نے جناح کی مخالفت میں کچھ کہا تو سب ادا سے ذاتی رقابت پر محمول کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جناح کے وہ کون سے ذاتی خیالات تھے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات سے متضاد تھے۔ اور جن کے اظہار پر فتنہ مچتا ہے پھرے بٹھا دینا چاہتے تھے۔ صرف یہ کہ انہوں نے مسئلہ میں اس شرط پر

۱۹۱۱ء

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



شکایت پہنچانی کہ مسلمان نہروڈ پورٹ کو زد کر چکے ہیں۔ اور رسول نامہ فرمائی کی  
تحرکیاں ہیں بھی شامل نہیں ہوئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حکومت اب  
مسلمانوں کی ذمہ داری کا یہ انعام دے رہی ہے کہ ہم پر وہی آئین مسلط کیا  
جا رہا ہے۔ جو ہمیں نہروڈ پورٹ نے پیش کیا تھا۔

دوسری گول میز کانفرنس جو ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی۔ وہاں گاندھی  
بھی شریک تھے۔ جب انگلستان میں ان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور حکومت  
بھی ان سے مرعوب ہوتی نظر آئی۔ تو فضل حسین نے شفاعت احمدیوں کو  
ایک خط میں لکھا:

..... لندن میں جو گاندھی کی آؤ بھگت ہو رہی ہے اس کی  
پر دامت کرو۔ اگر کانفرنس کے مسلمان مندوبین نے اپنے پتے  
میں شہری سے استنہاں کئے۔ تو یقین کر دو کہ تم دوسری قوموں سے  
بازمی سے جاؤ گے۔ آغا خاں تمہارا لیڈر ہے جسے انگلستان کی  
معاشرتی زندگی میں بے عدالتیاں مقام حاصل ہے۔ وہاں کا  
کوئی باشندہ، انگریز یا ہندوستانی، اس عظمت میں آغا خاں  
کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر تم نے متحد ہو کر آغا خاں کی  
قیادت میں کام کیا تو پھر کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔  
گول میز کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر حاکم محترم ہونا ہے کہ اس

سالہ سوانح عمری ص ۲۵۶ پر لکھا گیا ہے

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



سائے کھیل میں میاں فضل حسین کا ہاتھ پس پردہ کام کر رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک تفصیل کو اپنے فہم کے مطابق طے کرنے میں مصروف تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فضل حسین کی اس پالیسی نے جناح کو بالکل بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ کانفرنس میں ایک ایک وقتہا شخص کی حیثیت سے موجود تھے جو نہ خود کسی کا لیڈر ہے۔ اور نہ کسی لیڈر کی قیادت میں کام کرنے پر ضامند ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جناح نے لاہور آ کر ایک تقریر کے دوران میں اپنی اس قابلِ رحم حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا :

” میرے دوست پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں گول میز کانفرنس کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اس کانفرنس میں بالکل یکے وقتہا تھا۔ میں نے سلما نوزی کو ناراض کیا۔ کیونکہ وہ مجھے مخلوط انتخاب کا عادی سمجھتے تھے۔ منہ و مجھ سے انگ ناراض تھے۔ کیونکہ میں چودہ نکات کا موحد تھا۔ میں نے والیان ریا ست کو بھی ناراض کیا۔ کیونکہ میں ان کی پس پردہ اور خفیہ کارروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اور میں نے ان کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ بھی مجھ سے ناراض تھی۔ کیونکہ میں نے ابتدا ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس ایک بہت بڑا فریب ہے۔ اور میں کسی شرط پر بھی برطانوی حکومت کی ہاں میں ہاں ملاسنے پر تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ کانفرنس کے مندوبین کے

اجرم میں میرا ایک بھی حامی اور مددگار نہ رہا۔  
 سرسمونیل مور (حال لارڈ لمپل و ڈا) اس زمانے میں وزیر ہند تھے۔ انہوں  
 نے اپنی کتاب میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :  
 ”..... جناب بھی چونکہ ان کے ساتھ آغا خان اور چودہری ظفر اللہ  
 خاں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس لئے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ

۱۷ فروری ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید گنج کا تفتیشی چکائے کے لئے مسٹر جناب لاہور تشریف لائے  
 تھے تو مارچ کو بائندگان لاہور کی طرف سے، جن میں، ہندو، مسلمان سکھ، عیسائی بھی شامل  
 تھے۔ مسٹر جناب کو خوش آمدید کہنے کا غرض سے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا  
 جس کے صدر لاہور کے ہشپ تھے۔ اس جلسے میں پیڈت نامک چند بیرسٹرا میٹ لائے  
 جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر بھی تھے۔ مسٹر جناب کی تعریف  
 کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”گول میز کانفرنس کے مباحث میں مسٹر جناب نے دوست  
 دشمن کسی کی پروا نہیں کی۔ اور جس رائے کو وہ دیانت و امانت سے صحیح سمجھتے  
 تھے اس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے دو نونوں کے انکا  
 ساتھ چھوڑ دیا اور وہ گویا سدایہ صحرا بن کر رہ گئے۔ لیکن یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر  
 جناب جس بات کو درست سمجھتے ہیں اس پر چٹان کی ہرت جہم جلتے ہیں۔ اور دنیا کی  
 کوئی ترغیب و تکریم انہیں اس مقام سے ہٹاتے نہیں سکا۔ یاب نہیں ہو سکتی۔“

پیڈت نامک چند کی اس تقریر کے جواب میں مسٹر جناب نے وہ تقریر کی جتنی جکا اقتباس اوپر

درج ہے۔ - مطبوعہ رقد نامہ سول اینڈ مارٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء

اپنے وفد کی رہنمائی کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً  
 بحث میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے تغیر  
 پذیر ذہن کی حرکات سمجھنے سے معذور تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ  
 وہ کسی شخص کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیا وہ ایک  
 آل انڈیا فیڈریشن کے حامی تھے؟ اس کا تیقن کے ساتھ جواب  
 دینا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ  
 انہوں نے اس وقت تقسیم ہند یا قیام پاکستان کی قطعاً کوئی تجویز  
 پیش نہیں کی تھی۔ کیا وہ مرکز میں رد و بدل کئے بغیر صوبائی خود  
 مختاری کے حامی تھے؟ بعض اوقات ان کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبائی  
 خود مختاری سے آگے نہیں جانا چاہتے تھے لیکن پھر دوسرے لمحے میں وہ مرکز اور صوبجات دونوں  
 ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ انکی یہی تشریح پرزور ہے کیفیت تھی جو  
 ان کے ساتھ تعاون کرنے میں ہمارے لئے مشکلات پیدا کر رہی  
 تھی۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے مسلمان رفقاء کی عاصت اور  
 صحیح رہنمائی کرنے سے معذور تھے۔" ۱۰

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ ڈومپیل ڈوڈ نے اس ساری کیفیت کا پس منظر سمجھنے بغیر  
 اپنی رائے قائم کر دی ہے۔ اصل بات وہی ہے جس کا ذکر جناح نے اپنی لاہور  
 والی تقریر میں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق اپنے اور بیگانے

دونوں غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں۔ اور کوئی شخص بھی اُس کے خیالات اور عقائد کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ تو غلط تصورات کا پیمانہ بنا اجیرا قیاس نہیں گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کو جس قدر کامیابی ہوئی۔ اُس کا سہرا میاں فضل حسین کے سر ہے مسلم کانفرنس کے کم و بیش تمام مطالبات منظور کرنے گئے تھے۔ بعد اگانہ انتخاب پر دستور قائم رہا۔ مسلم اقلیت کے سوبوں پر ریٹج برقرار رکھا گیا۔ صوبہ سرحد میں مکمل اصلاحات رائج کر دی گئیں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک جداگانہ صوبہ کی حیثیت دیدی گئی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت (اگرچہ جمہوریت) قائم ہو گئی۔ صرف بنگال کے متعلق مسلم کانفرنس کا مطالبہ تسلیم نہ کیا جاسکا۔ وہاں اگرچہ مسلموں کی آئینی اکثریت تو قائم نہ ہوئی۔ لیکن یورپین ممبروں کو ریٹج عطا کر کے کانگریس کا زور توڑ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گورنروں کو اس قسم کی مہایات جاری کر دی گئی تھیں کہ صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصہ سرزد ملنا چاہیے۔

ان مراعات کے علاوہ میاں فضل حسین کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے آئی، اے، ایس اوزر میسر میں صدر کی ذمہ داری ادا کی اور یہ سب کاموں کے لئے پچیس فیصد حصہ آئینی طور پر منظور کرایا۔ مسئلہ میں حکومت ہند نے فیصد کیا تھا کہ اپریل سروس کی سہ ماہی میں انگریزوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں گی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں اس تین تیس فی صد میں سے بمشکل پورہ فیصد حصہ ملتا تھا۔ اور باقی اس

مسیحی۔ پارسی اور سکھ لے جاتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب سے بیشتر اسامیوں کے مستحق مسلمان تھے۔ میاں فضل حسین نے چار سال کی لگاتار کوشش کے بعد ۱۹۳۲ء میں حکومت ہند کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ تینتیس فیصد کے اس تناسب میں سے پچاس اسامیاں لازماً مسلمانوں کو باقی آٹھ دیگر اقلیتوں کو ملنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی ضمنیاً یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اگر ان آٹھ اسامیوں میں سے کسی اسامی کے لئے غیر مسلم اقلیت کا کوئی موزوں امیدوار نہ مل سکا تو وہ اسامی بھی مسلمانوں کے حصے میں چلی جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ فضل حسین سے پہلے تین مسلمان علی الترتیب دلسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ سمر علی امام، سمر محمد شفیق اور سمر حبیب اللہ۔ لیکن مدبر، معاملہ نہیں۔ سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لحاظ سے ان تینوں میں سے کوئی شخص میاں فضل حسین کے برابر کام نہ کر سکا۔

ایف۔ ڈبلیو۔ ولسن ایک مشہور انگریز اخبار نویس تھے۔ جو پہلے روزنامہ پانڈیوالہ آباد کے ایڈیٹر تھے۔ پھر انڈین ڈیلی میل کے ایڈیٹر ہو کر مہینی چلے گئے تھے۔ ولسن کی رسائی دلسرائے سے لے کر ہر چھوٹے بڑے انگریز افسر تک پہنچی۔ اس طرح انہیں حکومت کے بعض ایسے رازوں کا علم تھا۔ جو عوام کو کیا، خواص کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رہتے تھے۔ ولسن نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا:

”.... بدقسمتی سے لارڈ ارون کو اپنی کونسل کے لئے جو ہندوستانی

ممبر مقرر آئے۔ وہ بہت ہی معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔ سیاسی

بصیرت سے محروم ہونے کے علاوہ انہیں ہندوستان کی سیاسی ترقی و تبدیلی کا بھی براہ راست کوئی حکم نہ تھا۔ ان میں سے دو نے تو ساکن کشن کی تشکیل کے وقت ڈائریکٹوریٹ کے سربراہان کے طور پر کام کیا تھا۔ البتہ لارڈ اردن کی حکومت کے آخری دور میں سر فضل حسین نے جو بلاشبہ ہندوستان کے قابل ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ڈائریکٹوریٹ کی کونسل کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشا۔ فضل حسین کا رویہ عام ملکی اصلاحات کے بارے میں ہمہ دانا نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ڈائریکٹوریٹ کی کونسل میں ان کی موجودگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اس کام کے لئے وہ اصلاحات کے نفاذ کو بھی اس وقت تک ملتوی رکھنے کو تیار ہیں۔ جب تک مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک پونڈ سے بھی زیادہ گوشت کا مطالبہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ ہندوستان میں یہ بات پایہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ سر فضل حسین اور ہندوستان کی سول سروس کے درمیان ایک واضح مفاہمت قائم ہے۔ جس کا نڈیہ ہے کہ سر فضل حسین سول سروس کی سربراہان کے وقت میں مدد کریں۔ اور اس کے معاوضے میں سول سروس والے مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کریں گے۔۔۔۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں غیر کانگریسی مسلمانوں نے جس ایک جہتی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا۔ اور جس ہوشمند سی اور تدبیر سے اپنے مطالبات تسلیم کر لے

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

اُسے دیکھ کر ان لوگوں کو اجن کی ہانگ ڈور بہراہ راست فضل حسین کے ہاتھ میں تھی اسے اختیار مبارکباد کہتے کو بی چاہتا ہے۔ فضل حسین کی پالیسی یہ ہے کہ سندھ و ستان میں اُس وقت تک سنی اہل ملاحات رائج نہیں ہو سکیں گی۔ جب تک کہ وہ مسلمانوں کو اس قدر مضبوط و منظم نہ کر دیں کہ وہ اپنی شرائط منوائے کے قابل ہو سکیں۔

”میں سمجھتا ہوں کہ سرفضل حسین اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عوامی اور قومی تحریکوں سے دلچسپی رکھتے پھریں میرا یقین ہے کہ وہ ان تحریکوں سے چشم پوشی ضرور کرتے ہیں تاکہ حکومت میں اُن کا بقا و دوام برقرار رہتا ہے۔ اور وائسرائے اور وائٹ ہال یہ خیال کر کے اُن کے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی زبردست شخصیت سے مسلمانوں کو حکومت کی دفا واری و خیر خواہی سے محروم نہیں ہونے دیا۔ سرفضل حسین نے سول سروس سے جو مخالفت کر رکھی ہے اُس کی ابتدا لاہور میں ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ قوم پرست مسلمانوں کی تحریک کو کچلا جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کو شدید سے پیش کیا جائے۔ اور آخر کار گول میز کانفرنس میں تہدید و تخویف کے حربوں سے ان مطالبات کو منڈایا جائے ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر حکومت سندھ کے رجعت پسند طبقے کا دل باغ باغ ہو جاتا ہوگا۔“

۱۰ THE INDIAN CHAOS (pages 81 and 113)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

ولسن نے سول سروس اور سرفضل حسین کی جس باہمی مفاہمت کا ذکر کیا ہے، اس کو حسب روایت تسلیم کرنے میں مجھے تامل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فضل حسین نے قومی تحریکیوں کو ہمیشہ کچلا۔ اور مسلمانوں کی جنگ محض اپنی صوابدید۔ اپنی بصیرت اور اپنی عقل کے مطابق لڑنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل ۱۹۳۵ء میں جب نائٹس کی ایگزیکٹو کونسل سے سیکرٹریٹس ہو کر واپس لاہور آئے، تو انہیں حدودِ حرات آرمیئر لہجے میں کہنا پڑا:

..... آئے قوم میں کوئی لیڈر نہیں ہے۔ اور اس تہی دامن کی ذمہ داری حکومت کی پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کے ہارنگ جو نہی دیکھتے ہیں کہ کسی سندھ ستانی کا اپنی قوم میں اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ تو فوراً اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اب تو یہ حکومت کا مسلمہ قاعدہ بن گیا ہے۔ سندھوں کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ کانگریسی ہیں۔ اور حکومت کے خلاف ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ مسلمانوں کے متعلق حکومت نے یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ ان میں باہمی پھوٹا ڈالنے کے لئے اندر ہی اندر بڑی موثر شکاری سے پمپاگت کیا جاتا ہے۔ ذاتی رقابتوں کو زور شور سے موادی جاتی ہے۔ فرقہ واریت اور جماعت سازی کے جذبے کو بھارا جاتا ہے۔ اور جب ان حربوں سے بے غاظر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ تو پھر قوم کے



اڑنے اور غلیظ طبقے سے لیڈروں پر کچھڑا چھلوانی جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ حکومت کو اپنے حسبِ منشا کام کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ ان حالات میں صوبائی وزیروں کی حیثیت سوانے اس کے اور کیا رہ جاتی ہے کہ وہ معمولی تحصیلداروں کی طرح گورنروں کے ایشائے پرنا چنے پھریں لے

یہ اس پرنسپل پارٹی کے کارناموں پر میاں فضل حسین کا بلکا سا تبصرہ ہے۔ جسے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں قائم کیا تھا۔ اور جس کے سپرد انہوں نے پنجاب کی تقدیر رکھی تھی۔ آج وہ قومی لیڈروں کے فقدان، سیاسی زندگی کے انفلاس، وزیروں کی بے بسی اور حکومت کی خود سری کی بڑی درد مندی سے شکایت کر رہے تھے۔ حالانکہ اگر وہ ذرا غور فرماتے تو انہیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی کہ اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے انہی دنوں، جب میاں فضل حسین حکومت ہند کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر لاس پور تشریف لائے تھے، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

..... یہ کس قدر افسوسناک امر ہے۔ کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے سرفضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا

تھا کہ وہ دیہاتی تھے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے نطعا اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تیسرے درجے کے لوگ، جو اپنے موجودہ عروج کے لئے فضل حسین کے ممنون ہیں، خود اپنے اصلاحیت کے مالک ہونے کے باعث، فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی۔ کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح "لیڈرشپ" مفقود ہو چکی ہے۔ اور سیاسی میدان چند درجہ نازل ہو گیا ہے۔

اس واقعہ سے سال بھر پہلے۔ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے۔ انجمن حمایت اسلام ہی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر۔ خوش آمدید کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے۔ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر اظہارِ افسوس

کیا تھا۔ اور پنجاب کے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی قوم میں کوئی بلا  
پایہ لیڈر پیدا کریں۔

گورنر کے اس مشورے پر اظہارِ انوس کرتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے  
اپنے ایک انگریزی بیان میں - جو تبصرہ کیا تھا - اس کی چند سطور کا ترجمہ  
یہاں درج کرتا ہے محل نہ ہوگا۔

” میں گورنر کا ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے - مسلمانانِ پنجاب کو اتحاد  
و اتفاق کی تلقین کی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ حکومت خود  
اپنے اعمال و افعال کا بھی محاسبہ کرے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اس  
وقت - پنجاب کے مسلمانوں میں - شہری اور دیہاتی کی جو  
خونناک تفریق قائم ہو چکی ہے - اور جس تفریق نے - اس  
صوبے کے مسلمانوں کو - دو متخارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے  
وہ کس کی قائم کی ہوئی ہے؟ یہ تفریق صرف شہری اور دیہاتی  
مسلمانوں تک محدود نہیں رہی - بلکہ اس نے خود دیہاتی مسلمانوں  
کو بھی قسم قسم کی ٹولپوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو آئے دن ایک  
دوسری کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

” سرمریٹ ایمرسن نے - اس بات پر انوس ظاہر کیا ہے۔ کہ پنجاب  
کے مسلمان - کوئی بلتد پایہ لیڈر پیدا نہیں کر سکے۔ کاش سرمریٹ  
ایمرسن کو اس بات کا احساس ہوتا۔ کہ پنجاب کے شہری اور  
دیہاتی مسلمانوں میں - جو خونناک چھوٹ پڑ چکی ہے - وہ

سراسر حکومت نے خود پیدا کی ہے۔ اور حکومت ہی اس پھوٹ کو قائم رکھنے پر مہم ہے۔ ہماری قومی سیاست۔ ایسے خود غرض اور طالع آزما، قسم کے افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ جن کے سامنے۔ صرف جابِ منفعت کے ذاتی اغراض ہیں۔ اور جو مسلمان پنجاب میں ایک جہتی قائم کرنے کے سرگمراہ خواہاں نہیں۔ حکومت خود ان غرض مند افراد کی سرپرستی کرنے میں مصروف ہے۔ اور یوں باہر واسطہ شہری دیہاتی جو بگڑے کو زور دے رہے ہو ادا رہے ہیں۔

”نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کہ حکومت نے یہ طرزِ عمل غالباً انتہائی ہی اسی واسطے کیا تھا۔ کہ پنجاب میں کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ ہو سکے۔“

”سربراہ برٹش ایئر سہیل تو مسلمانوں میں۔ حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہارِ منوس کیا ہے۔ میں اس کے برعکس۔ اس بات پر منوس کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرزِ عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جس نے اس صوبے میں۔ اصلی اور پائیدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام امیدوں کا قلع مٹع کر دیا ہے۔“

اقبال کا یہ فیصلہ کسی ثبوت یا تیز مزاجی یا عبلد بازی کا نتیجہ نہ تھا۔

اس فیصلے کے پیچھے پورے بارہ سال کا عمیق مشاہدہ اور تجربہ کام کر رہا تھا! اقبال اور فضل حسین پرلے دوست تھے۔ دونوں کالج میں ہم جماعت وہم سبق رہ چکے تھے۔ اقبال نے بانگِ درا کی ایک بے مثال نظم فلسفہٴ عمِ فضل حسین ہی کی خاطر لکھی تھی۔ اقبال فضل حسین کی قائم کی ہوئی مسلم کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ اور آگے چل کر اُس کے صدر بھی بن گئے تھے۔ اقبال کو فضل حسین نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا ڈپٹی سیکریٹری بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔ اس لئے یہ سرگرم نہیں کہا جاسکتا کہ اقبال نے کسی قسم کی ذاتی رنجش یا عداوت کی بنا پر فضل حسین کے خلاف مذکورہ بالا الفاظ کہے ہوں گے۔

اقبال ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۳ء تک پنجاب یونیورسٹی کونسل کے رکن رہے۔ یہ تین سال انہوں نے یونیورسٹی پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا۔ مٹھری دیہاتی چیتلش یونیورسٹی کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی۔ اور پھر اس چیتلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اقبال سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال ایسے بلند پایہ مفکر۔ فلسفی اور شاعر کو صوبے کی یونیورسٹی کونسل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر اقبال کونسل کے اندر بیٹھ کر یونیورسٹی پارٹی کے طرز عمل کو بچشمِ خود ملاحظہ نہ کرتے۔ تو شاید اُن کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پاسکتا۔ جو قدرت نے اُن کی زندگی کے آخری دو برسوں میں اُن کے لئے مقدر کر رکھا تھا۔

۱۹۳۵ء میں ملک کی حالت یہ تھی کہ مسلم لیگ ایک تین نیم جاں کی طرح پڑی بسک رہی تھی۔ مسلم کانفرنس اپنا سنگامی کھیل ختم کر کے روپوش ہو چکی تھی محمد علی فوت ہو چکا تھا۔ جناح سارے تین سال کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں واپس ہندوستان آیا تھا۔ اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آئندہ اس ملک میں اس کے پاؤں دوبارہ جم سکیں گے یا نہیں۔ پنجاب میں احرار، اس شمع کی طرح جس کی لُو بجھنے سے پہلے آخری مرتبہ بھڑکتی ہے۔ گویا سنبھالا لینے والے تھے ان حالات میں میاں فضل حسین کا یہ شکوہ بالکل بجا تھا کہ قوم لیڈر شپ سے محروم ہو گئی ہے۔ ان کا یہ خیال بھی درست تھا کہ:

”پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکام بالادست نے پنجاب کو اسی چیز سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اصلاحات کے نفاذ کے بعد پنجاب نے اپنا کھویا سوا ذقار دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ پنجاب پھر اس نعمت سے محروم ہو گیا ہے“۔

پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا تھا۔ یا اس کا ذقار زائل ہو گیا تھا۔ یا اس کی عزت نفس مجروح ہو گئی تھی۔ تو اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر تھی جو اس

۱۔ میاں فضل حسین نے اپنے انتقال سے چند دہائیوں قبل گریڈ نائیں ایک پمفلٹ پنجاب پانکس کے نام سے لکھا تھا۔ اگرچہ پمفلٹ پر مصنف کا نام ”ایک پنجابی“ دیا تھا۔ لیکن یہ بتا ہر شخص کو معلوم تھی کہ اصلی مصنف میاں فضل حسین ہیں۔ یہ اقتباس اسی پمفلٹ کے ۲۹ ص ۱۰۱ پر لیا گیا۔

صوبے کے حکمران تھے۔ جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی۔ جو سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ اور سرکارِ دالائتبار کے دیوار میں قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے تھے۔ یونیٹ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں نے مسلمانوں کی نمائندگی کے دعویدار بن کر جس قدر دنیوی و مالی فوائد اٹھائے۔ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو شاید حیرت سے لوگوں کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ ہزاروں یکم ذرخیز ارضی ان لوگوں نے مفت حاصل کی۔ اپنی اولاد کو بڑے بڑے عہدے دلوائے۔ جاگیریں، انعام اور خطابات حاصل کئے۔

یہ صحیح ہے کہ میاں فضل حسین نے اپنے تئیں سے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی ہم کو منزلِ کامرانی تک پہنچایا تھا۔ انہوں نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے دلائل اور حکومتِ ہند کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے نئی دہلی میں بیٹھ کر لندن کی لباہر سیاست پر اپنے ہردوں کو اس طرح حرکت دی کہ خود گاندھی بھی اُن کی چال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا لہ

---

صفحہ ۱۱۹، "INDIAN CHAOS" جہاں گاندھی نے گول میز کانفرنس میں اربابِ بے امر کیا تھا کہ جب تک نیشنلسٹ مسلمانوں کے نمائندے ڈاکٹر انصاری کانفرنس میں شریک نہیں ہونگے وہ مسلمانوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ گاندھی جی کی ضد سے حکومت بھی مدعو ہو گئی تھی۔ اور دلائل سے ڈاکٹر انصاری کو لندن بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن میاں فضل حسین جانتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ ڈاکٹر انصاری لندن پہنچ گئے

(باقی صفحہ پر)

فضل حسین کی ابتدائی تربیت کانگریس اور مسلم لیگ کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ وہ شروع میں ایک عوامی لیڈر ہی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے اس لئے ہر چند کہ دنیاوی مصلحتوں نے قدم قدم پر ان کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ وہ دل میں یقیناً سمجھتے تھے کہ جب تک کسی لیڈر کے پیچھے عوام کی مجموعی طاقت نہ ہو اس کی آواز میں زور پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب پہلی گول میز کانفرنس میں تیسرے حکومت کے وزیر اعظم نے مخالفانہ رویہ کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جائیں گے۔ تو میان فضل حسین نے لکھا کہ :

اگر جداگانہ انتخاب ہر تہا رہ نہ کہا گیا۔ اگر اقلیت کے صوبوں سے  
 دیسٹریکٹ چھین لیا گیا۔ اور اگر پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت  
 نہ دی گئی۔ تو میں اس بات پر مجبور ہو جاؤں گا کہ مسلمانوں کی  
 ایک کثیر تعداد کو اپنے ساتھ لے کر کانگریس میں شامل ہو جاؤں  
 کیونکہ کانگریس کے ذریعہ سے ہندوستان کی جدید تشکیل میں

تو مسلمانوں کا متحدہ محاذ پارہ پارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ڈاک  
 مخالفت کی۔ اور دائسرا سے صاف کہہ دیا کہ اگر ڈاکٹر انصاری کو لندن  
 بھیجا گیا تو کانفرنس کے تمام مسلمان مندوبین مستعفی ہو کر واپس آجائیں  
 گے۔ فضل حسین کی یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ اور ڈاکٹر انصاری لندن نہ جاسکے۔



حقد لینا اس امر سے بہتر ہے کہ ہم انگریز کے عطا کئے ہوئے آئین کے تحت آہستہ آہستہ اپنی سستی کو معدوم کر بیٹھیں۔ لے

فضل حسین کی یہ دھونس رانگریزی میں "بلف" کہنا چاہیے (مکن ہے لارڈ ارون پر چل گئی ہو۔ لیکن اُن کی گذشتہ دس برس کی زندگی اُن کے اس دعوے کی کھلم کھلا تکذیب کر رہی تھی۔ میاں فضل حسین نے یقیناً مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب اور ویٹج لے دیا۔ انہوں نے پنجاب میں مسلم اکثریت بھی قائم کر دی۔ انہوں نے سندھ کو جداگانہ صوبہ بھی بنا دیا۔ انہوں نے سرحد میں اصلاحات بھی رائج کر دیں۔ اور انہوں نے امپیریل سروس میں مسلمانوں کو سچپس<sup>۲۵</sup> نیمدتناسب بھی مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کامیابی محض اُن کی ذاتی کامیابی تھی۔ جسے انہوں نے اپنی ہوشیاری۔ سیاسی مہارت اور شاطرانہ صلاحیت سے حاصل کیا تھا۔ قوم کی اجتماعی قوت اور عوام کی مجموعی قوت اس جدوجہد میں اُن کے ساتھ نہ تھی۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ انہوں نے اس اجتماعی قوت اور مجموعی طاقت کو مختلف حیلوں سے ہمیشہ دبائے رکھا چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں نیا دستور بن کر آیا۔ تو مسلمانوں کے آئینی حقوق تو بلاشبہ محفوظ تھے لیکن اُن کی اجتماعی زندگی بالکل بے جان، بے حس اور بے رُوح ہو چکی تھی۔ لیڈرشپ کے فقدان کی وجہ سے چاروں طرف ایک انسردگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اور بعض ذات یوں معلوم ہوتا تھا کہ قوم کی قوم پر گویا

سکوتِ مرگِ طاری ہے۔

اکبرالہ آبادی نے کہا ہے

سینے میں دلِ آگاہ جو ہے، کچھ غمِ ذکر و ناشاد سہی

بیدار تو ہے، مشغول تو ہے، نعمتِ نہ سہی، تسریاد سہی

سرِ چند بگولہ مضطرب ہے، اک جوشِ تو اس کے اندر ہے

اک وجد تو ہے، اک رقص تو ہے، بے چین سہی، بر باد سہی

دلِ آگاہ کی یہی "بیداری و مشغولیت" اور بگولے کا یہی "وجد و رقص"

زندگی کی علامت ہے۔ اس سے بحث ہمیں کہ دلِ ناشاد و تاملِ مراد ہے یا شاد

کام و بامراد۔ بگولہ بے چین و بر باد ہے یا مضطرب و پریشان

زندگی سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام

فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام

تو نہ مشتاسی ہنوز شوقِ بیروز وصل

چلیت جیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

(اقبال)

بس دن کوئی فرد یا کوئی قوم اس سے ختنِ ناتمام۔ اس وجد و رقص۔

اس بیداری و مشغولیت اور اس اضطراب و التہاب سے شروع ہوئی

اسی دن اس پر موت کی خاموشی طاری ہو جائے گی۔ راتم التحریر کو وہ نہا

یاد ہے جب بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی مقدمے کی روزمرہ کارروائی

مشرور ہونے سے پہلے کمرہ عدالت میں کھڑے ہو کر رام پرشاد بسمل

کی یہ غزل گایا کرتے تھے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تو جوش و تہوڑا اور ایشاد سرفروشی کی چنگاریاں سنٹرل جیل کی دیواروں  
کو چیر کر سندھ و نوجوانوں کو آتش بجاں اور شعلہ بداماں کر رہی تھیں۔ تمام لہنگوں  
کو وہ دہن بھی یاد ہے۔ جب ہانما گاندھی عصائے پیری تھام کر ساہمٹی آشرم  
سے ڈانڈھی کی طرف پیدل روانہ ہوئے تھے۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سندھوستان  
کی سرزمین اپنے محور سے ہٹ جائے گی۔ راتم الحروف کو وہ وقت بھی یاد ہے  
جب ہولنا فرمانی کی تحریک کے دوران میں سندھوستان کی مرکزی اسمبلی کے  
پہلے غیر سرکاری صدر و سیکرٹری جہانی پٹیل نے اپنے بلینڈ وبالاً منصب پر لات مار  
کر دالٹراے کو لکھا تھا کہ :

”..... میرے ہم وطن اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش  
میں مبتلا ہیں۔ ملک کے سینکڑوں نامور لوگ جیلوں میں داخل  
ہو چکے ہیں۔ ہزاروں اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں اور لاکھوں  
ایسے ہیں جو اس زبردست تحریک کی خاطر زنداں کی کال کوٹھڑی  
میں جاتے کے لئے بخوشی آمادہ ہیں۔ جہاد حریت کی تاریخ کے

لہ رام پرشاد بسمل شاہجہانپور (یو۔ پی) کے باشندے۔ اور سندھوستان کے مشہور انقلاب پسند  
۱۹۲۶ء میں کاکوری کے ڈاکے میں گرفتار ہوئے۔ اور پھانسی کی سزا پائی۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

اس نازک موقع پر میرا یہ کام نہیں کہ اسمبلی کی کرسی صدارت پر  
 بٹھا رہوں۔ بلکہ میرا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کے پہلو پہ پہلو آزادی  
 وطن کی جنگ میں حصہ لوں۔" اس

تو اس انقلاب انگیز بیان کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں  
 ایک ایسی زبردست لہلہ چمک گئی تھی۔ جس کے سامنے انگریزی ملوکیت کا  
 اقتدار ڈالوں ڈول سوتا نظر آ رہا تھا۔

سر فضل حسین نے بلاشبہ اپنی سیاسی فہم و فراست سے مسلمانوں کی بڑی  
 خدمت کی۔ لیکن وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ قومیں محض چند بڑے آدمیوں  
 کے "سیاسی سپر ہیرو" سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ قوموں کا سرمایہ نازش و افتخار  
 عوام کے جذبہ ایشیا اور عوام کا جوشِ عمل ہے۔ فضل حسین کی سیاست میں  
 سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ انہوں نے عوام کو نہ صرف ہمیشہ نظر انداز کئے  
 رکھا بلکہ عمداً ایسی تدبیریں اختیار کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی عوامی قوت  
 بیدار ہونے کی بجائے روز بروز غافل و درماندہ ہوتی گئی۔ یہ شرفِ قدرت  
 نے اقبال اور جناب کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کہ ایک تو اپنے تلام کی مہجرت  
 بنگاری اور دوسرا اپنے عمل کی قوت سے قوم میں نئی زندگی کی روح ٹھونک  
 کر اسے منزلِ مقصود کا راستہ دکھائے :

✱

لدن آڈین ایجوئل ڈیپارٹمنٹ، ۱۹۳۰ء۔ جلد اول، صفحہ ۱۰۰

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com  
Marfat.com  
Marfat.com

# حصہ دوم

اقبال کے آخری دو سال

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

۲۸۴

۴

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

# مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت، جوں جوں نئے آئین کے نفاذ کا وقت قریب آ رہا تھا، سندھوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں۔ کانگریس نے بڑی زور و کد کے بعد صوبائی اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس غرض کے لئے ایک کل سندھ پارلیمنٹری بورڈ بھی وضع کیا گیا تھا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ مجالس قانون ساز کے لئے موزوں کانگریسی امیدواروں کا انتخاب کرے۔ ابتداء میں ڈاکٹر انصاری اس بورڈ کے صدر تھے۔ لیکن بعد میں صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ذمے تھے۔ ایک کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے۔ اور دوسرے کا تعلق پورے سندھوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن کے قیام سے تھا۔ صوبائی اسمبلیوں کی اہمیت اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کہ آئندہ فیڈریشن کی مرکزی اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب صوبوں کی مجالس قانون ساز کے ذمے تھا۔ اس لئے ظاہر ہے ان مجالس میں جس جماعت کے ارکان کی



اکثریت ہوگی۔ وہی جماعت فیڈرل اسمبلی میں بھی اپنے نمائندے بھیج سکے گی...  
کانگریس کی ہمہ گیر اور دور دراز تنظیم کے پیش نظر یہ کہنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ کہ  
آئندہ صوبائی اسمبلیوں میں کانگریسی ممبروں کی بہت بڑی تعداد داخل ہوگی  
اور آئین کو کامیاب یا ناکام بنانے کی ذمہ داری گویا ایک حد تک انہی ممبروں کے  
سر عائد ہوگی۔

مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی مرکزی اور وسیع الاثر یا ہمہ گیر ادارہ نہیں تھا  
جو کانگریس کی مانند ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کی نگرانی کر سکے۔  
یا ان اسمبلیوں میں بھیجنے کے لئے موزوں مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرے  
مسٹر جناح ۱۹۳۲ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ اور ان  
کی کوشش سے مسلم لیگ میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن لیگ نے چونکہ  
اپنی گذشتہ اٹیس سال کی زندگی میں براہ راست کبھی انتخابات میں حصہ  
نہیں لیا تھا۔ اس لئے مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ لیگ کے تحت ایک  
پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور  
کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستان بھر میں اپنا اثر و رسوخ رکھتی ہو۔  
۱۹۲۳ء میں خلافت کمیٹی نے سوراخ پارٹی کے ساتھ مل کر انتخابات میں  
حصہ ضرور لیا تھا۔ لیکن تحریک خلافت ختم ہوتے ہی خلافت کمیٹی بھی ختم  
ہو گئی تھی۔

آخر جب مختلف خیال رکھنے والے لوگوں نے مسٹر جناح سے بار بار درخواست  
کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور انہیں ایک پالیسی کے تحت لانے کے لئے

اس موقع پر مسلم لیگ کا انتخابات میں شریک ہونا ضروری ہے تو ۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے چوبیسویں سالانہ اجلاس میں جو سرفزیر حسن کی زیر صدارت ممبئی میں منعقد ہوا تھا۔ منجملہ دیگر قراردادوں کے ذیل کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

”... ہر گاہ کہ آئین جدید کے نفاذ کے ساتھ اس ملک میں جو پارلیمینٹری نظام حکومت رائج ہو گا۔ اس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کر لیا گیا ہے۔ جو اس قسم کی حکمت عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کاربند ہوں۔ کہ رائے دہندوں کی سیاسی تربیت کر سکیں۔ اور اسی نوع کے عزائم و مقاصد رکھنے والی دیگر جماعتوں سے تعاون میں سہولت بہم پہنچا سکیں۔ اور آئین نو سے امرکانی حد تک زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کر سکیں۔“

یہ ہر گاہ کہ مسلمانوں کی وحدت ملی کو تقویت پہنچانے۔ اور صوبائی حکومتوں میں ان کے لئے مناسب اور مؤثر حقہ حاصل کرنے کے لئے یہ اور ضروری ہے کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہے۔

”لہذا قراردادیا جاتا ہے کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کیلئے آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز میسٹر جناب کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی سدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اس بورڈ کے ارکان کی کم از کم تعداد پینتیس ہو

اور اسے اختیار حاصل ہو کہ ہر صورت کے مقامی حالات کے پیش نظر مختلف صوبوں میں صوبائی الیکشن بورڈ قائم کر کے مرکزی بورڈ سے اُن کا الحاق کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے مناسب تدابیر و ذرائع اختیار کرے۔“

یہ قرار و ادراجہ غضنفر علی خاں نے پیش کی۔ جو اس وقت کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے۔ تاہم یہ نئے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی سکریٹری جمعیت العلماء ہند۔ سرسلیمان قاسم مٹھا (بھٹی) سید حسین ام (ربہار) عبدالحمید خاں (مدراکس) نواب زادہ لیاقت علی خاں (ریو۔ پی) حاجی رشید احمد (دہلی) اور مولانا محمد عرفان سکریٹری خلافت کمیٹی شامل تھے۔

عین جس وقت آل انڈیا مسلم لیگ سندھ و ستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لئے مذکورہ بالا پروگرام مرتب کر رہی تھی۔ پنجاب میں میاں فضل حسین یونینسٹ پارٹی کو پھر سے زندہ کرنے میں مصروف تھے۔ سرسکندر حیات خاں پنجاب کی ریونیو ممبری کی پنج سالہ میعاد ختم کر کے سندھ و ستان کے رییزرو بینک کے ڈپٹی گورنر بن چکے تھے۔ جہاں وہ ساڑھے پانچ ہزار شاہرو لیتے تھے۔ اُن کی جگہ نواب مظفر خاں پنجاب کے ریونیو ممبر بن گئے تھے۔ میاں فضل حسین کو معلوم تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک طاقت ور عنصر اُن کے خلافت ہے۔ اور سرسکندر اس باغی فریق کے لیڈر ہیں۔ تاہم وہ اس پارٹی کے منتشر عناصر کو یکجا کرنے کی فکر میں شب و روز کام کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب مظفر خاں۔ میاں صدیق خاں دولتانا اور میر مقبول محمود سرسکندر کے بہت بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سرسکندر کو معلوم تھا کہ میاں فضل حسین سے نمبر دانا ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فضل حسین بیمار تھے۔ اور کام کی شدت جس قسم کی جسمانی طاقت دتوانا اور صحت کی طلب گاہ تھی۔ وہ انہیں حاصل نہ تھی لیکن فضل حسین کی غیر معمولی قوتِ امادی اور ذہانت ایک ایسا حربہ تھا جس کا لوہا ان کے حریف بھی مانتے تھے۔ اور سرسکندر کو یقین تھا کہ اگر ان کے اور میاں فضل حسین کے درمیان مقابلہ کی نوبت آئی تو انجام کار یونیورسٹی پارٹی فضل حسین ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ اس صورت میں سرسکندر کے سامنے دو راستے کھلے تھے۔ اول یہ کہ وہ میاں فضل حسین کے تحت ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا قبول کر لیں۔ دوم یہ کہ وہ یونیورسٹی پارٹی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے کسی نئی پارٹی کی مانع بن جائیں سرسکندر بیک وقت ان دونوں راستوں پر گامزن تھے۔

ادھر وقتاً فوقتاً میاں فضل حسین کو اپنے خلوص اور اپنی تیار مندی کا یقین دلاتے رہتے تھے اور ادھر میاں فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کی دوڑ دھوپ بھی کرتے رہتے تھے۔ سرسکندر خود تو بنک کی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھے لیکن میاں احمد یار تھاں دولتانا اور میر مقبول محمود ان کے نائب سالار کی حیثیت سے برابر لاہور میں کام کر رہے تھے۔

جونہی سرسکندر کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا عزم رکھتی ہے۔ انہیں فوراً یہ ڈسار بندھی کہ شاید لیگ ہی ان کی پریشانیوں کا مداوا بن سکے۔ اور وہ مسلم لیگ ہی کے توسط سے میاں فضل حسین کے خلاف

اپنی پارٹی مضبوط کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے میاں احمد یار خاں دولتاناہ کو لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بھیجا۔ اور ۲۷ اپریل کی مذکورہ بالا قرارداد میں احمد یار خاں دولتاناہ کی موجودگی میں اور ان کی رضامندی سے منظور ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات کی جنگ لڑی جائے یا نہ لڑی جائے تو سر سکندر نے مسٹر جناح سے مل کر وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے نام پر اپنی جماعت منظم کریں گے۔ اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میاں فضل حسین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے۔

سر سکندر کے راجہ نرنڈر ناتھ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور راجہ ناتھ ہر اس شخص کی مدد کرنے پر تیار تھے۔ جو میاں فضل حسین کے خلاف خم کھونک کر گھڑا ہو سکے۔ چنانچہ سر سکندر جب لاہور آتے تو راجہ نرنڈر ناتھ سے ضرور ملتے تھے ان کا اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا وہ عنصر جو ان کا حامی تھا۔ اگر راجہ نرنڈر ناتھ کی پارٹی سے تعاون کرے۔ تو اس طرح غالباً ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد میاں فضل حسین کے حامیوں سے بڑھ جائے گی۔ میاں فضل حسین سر سکندر کی ان سازشوں سے سخت پریشان تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ حالات واقعات پر ان کی گزرت پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی۔ ایک خط میں چودہری شہاب الدین کو لکھتے ہیں۔

”دوست عزیز اور رشتہ دار اس قدر خود غرض۔ عاصد اور ناشکیے

ہو گئے ہیں کہ ان کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے

لیکن کیا کیا جائے . صبر و شکر کہنے اور غدار یوں کو برداشت کرنے کے سوا کیا چارہ ہے . اب تو زندگی کا صرف یہ مقصد رہ گیا ہے . کہ جو کام شروع کیا تھا اُسے بالآخر انجام تک پہنچایا جائے " اے  
میاں فضل حسین اس بات پر سچی آمادہ ہو گئے تھے . کہ اگر سرسکندر اُن کی قیادت میں کام کرنا نہیں چاہتے . تو وہ بخوشی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے اور لیڈری کا منصب سکندر کے حوالے کرنے کو تیار ہیں . چنانچہ ایک خط میں سرسکندر کو لکھتے ہیں :

"..... اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں . تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتاً دستبردار ہونے کو تیار ہوں . آپ بنک سے فوراً متعفی ہو کر یہاں آجائیے . اور پارٹی کی زمام قیادت سنبھال لیجئے . میں چونکہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو رہا ہوں . اس لئے آپ کو غائبنا اس بات پر چنداں اعتراض نہیں ہوگا کہ میں ایک بیان شائع کر کے عوام کو اُن حالات و کوائف سے مطلع کر دوں . جن کے تحت مجھے یہ نصیہ کرنا پڑا ہے . میری تمنا ہے کہ آپ آپ کے دوست اور آپ کی پارٹی کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہو . " اے  
جب کشیدگی یہاں تک پہنچ گئی . تو سرسکندر نے بطور مصلحت خود لاہور آکر

۱۵ سوانح عمری قسطنطنیہ ۳۲۳ء ایضاً ص ۲۳۱

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

میاں فضل حسین سے معذرت کی۔ اور اپنی وفاداری کا تعین دلا کر ان کے جملہ خدشات کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ احمد یار خاں دولتانا نے بھی ہمت سمجھتے ہوئے فضل حسین کو خوش کرنا چاہا۔ آخر میاں فضل حسین اس قسم کی نیاز مندانه گزارشات سے مطمئن ہو کر بظاہر ہر بھر کام کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس مہما لخت پر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک اور شوکو ذہ کھلا۔

میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل ہارپرٹنسن نے فضل حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خاں چیکے چیکے ہارپرٹنسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپرٹنسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خاں کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ لیکن انہوں نے میاں فضل حسین کو اس بات سے فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضل حسین کو نواب مظفر خاں کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے رنجِ عالم کی اس شدت میں خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس مازوم ارادے سے باز آئے۔

حالات کی یہ روش سخت افسوسناک اور عبرت انگیز تھی۔ وہ شخص جس کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نے پنجاب ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی سیاست کا رخ پلٹ دیا تھا۔ اب ان لوگوں کی سازشوں سے جن کو خود اس

نے ایک مٹی کے بت کی طرح اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اس قدر تنگ آگیا تھا کہ پریشانی کے عالم میں اپنی جان لینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ تاہم جب یاس ذنا امید کے تبادلے چھٹ گئے اور فضل حسین کی طبیعت کو کسی قدر سکون حاصل ہوا تو انہوں نے پھر گرم جوشی سے یونینسٹ پارٹی کی تشکیل کی طرف توجہ کی۔ جب تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔ تو ۹ اپریل کو نواب شاہ نواز خاں والے مہلک کے مکان واقع ڈیوس روڈ۔ لاہور پر ایک پریکٹ تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا باضابطہ افتتاح کیا۔ ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک یونینسٹ پارٹی کی ہیبت ترکیبی یہ رہی تھی کہ لوگ اپنے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل میں آتے تھے اور ایوان کے اندر باہمی اہم و تفہیم سے ایک پارٹی بنا لیتے تھے۔ کونسل سے باہر یونینسٹ پارٹی کا قطعاً کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ کبھی اس پارٹی نے آئینی و دستوری معاملات میں سندھوں یا مسلمانوں یا سکھوں کی رہنمائی کی۔ اور کبھی عوام میں کوئی شخص اس پارٹی کا ممبر بنا۔ میان فضل حسین نے اب پہلی مرتبہ یونینسٹ پارٹی کو ایک عوامی ادارے کا رنگ دیکر اس کے نام پر الیکشن کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ طریق انتخاب جداگانہ تھا۔ اور سندھ و امیر دار سندھ و عوام سے اور مسلمان امیر دار مسلمان عوام سے ووٹ مانگتے تھے۔ ان حالات میں میان فضل حسین کا یہ اقدام کہ ایک نام نہاد اقتصادی پروگرام کی بنا پر سندھوں، مسلمانوں اور سکھوں کی کسی مخلوق پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا جائے



ایک ایسا معنوی تفساد تھا۔ جس کو جداگانہ انتخاب کے اصول کے ساتھ کسی طرح منطبق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ کونسل کے اندر جا کر کام چلانے کے لئے بعض اصولوں پر متفق ہو جائیں۔ اور پھر انہی اصولوں کی روشنی میں وضع آئین و قوانین میں حصہ لیں۔ لیکن ایک طرف اس شدت سے جداگانہ انتخاب کی پابندی کا دعوے کرنا۔ کہ ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ نے پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کئے جانے کی شرط پر مخلوط انتخاب کی حمایت کی تھی۔ تو لیگ کو مسلمانوں کی بدخواہ اور غیر نمائندہ جماعت قرار دے کر اس کے جواب میں مسلم کانفرنس کا وجود کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہ اب جو ہندوستان میں پہلی مرتبہ پارلیمینٹری نظام حکومت کے مطابق وزارتیں مرتب کرنے کا وقت آیا۔ تو اسی متاعِ عزیز کو جس کا نام جداگانہ انتخاب تھا۔ ایک مخلوط انتخابی جماعت کے قیام سے عملاً مجروح اور بے کار کر کے رکھ دیا۔

۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا افتتاح کرتے وقت میاں فضل حسین نے ایک طویل تقریر کی۔ جس میں ملک فیروزخان نون، سرکنڈھیا چودھری شہاب الدین، میاں احمد یارخان دولتانہ اور چودھری جھوٹو رام کی دل کھول کر تعریف کی۔ اور ۱۹۲۱ء سے لے کر اب تک پنجاب کو جو کچھ عودِ نصیب ہوا تھا۔ اُسے سرسراں پانچ آدمیوں کی کوششوں کا ثمر قرار دیا۔ مہر دت و لاکو یونینسٹ پارٹی کا صدر و نثر قرار دیا گیا تھا اور اسی جلسے میں پچاس ہزار روپیہ چنہ جمع ہو گیا۔ سید مرتب علی۔ نواب کالا باغ۔ اور سردار محمد نواز خاں ٹیس کوٹ

نے پانچ پانچ ہزار روپے دیئے۔ سرفضل حسین۔ چودہری ظفر اللہ خاں۔ نواب اللہ بخش، ٹوانہ۔ نواب مگدوٹ۔ سر عمر حیات خاں ٹوانہ۔ میاں احمد یار خاں دولت آباد۔ سر سکندر حیات۔ چودہری شہاب الدین۔ ملک فیروز خاں نون اور چودہری چھوٹو رام نے تین تین ہزار روپے عطا کئے۔ ان کے علاوہ سردار عبدیلاہ اللہ مولوی غلام محی الدین قصوری۔ میاں امیر الدین۔ سید افضل علی حسنی اور میر مقبول محمود نے ایک ایک ہزار دیا۔ ان تمام عطیوں سے بالاترہیس ہزار کی رقم ایک ایسے شخص نے دینے کا وعدہ کیا جسے پنجاب کی یونیورسٹی پارٹی ٹے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ یعنی ہر ہائینس آغا خان۔ دس ہزار کی پہلی قسط بھجوتے وقت آغا خاں نے فضل حسین کو لکھا:

”..... میرے گماشتوں نے دس ہزار کی پہلی قسط آپ کو بھج دی ہے۔ دوسری قسط انشاء اللہ اگست کے آخر یا ستمبر کے شروع میں بھجوادوں گا۔ ڈرنی کی دوڑ میں اب کی میرا گھوڑا محمود اول آیا ہے۔ اور اس طرح میں آپ کو یہ روپیہ بھجوانے کے قابل ہو سکا ہوں۔ ورنہ میری مالی حالت ایسی نہیں کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔“ ملے

سوال یہ ہے کہ پنجاب کی یونیورسٹی پارٹی ٹے آغا خاں کو کیا دلچسپی تھی؟ اس کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ جن لوگوں نے آغا خاں کی خود نوشت

سوانح عمری ص ۱۱۲

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

سوانح عمری پڑھی ہے۔ انہیں اس سوال کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے میں کچھ وقت پیش نہیں آئے گی۔ ۱۹۱۲ء سے ہندوستان کی سیاسیات میں آغاخان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور انہوں نے مستقل طور پر یورپ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پہلی جنگ یورپ اور پھر تحریک عدم تعاون کے دوران میں آغاخان کا نام کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں جب میان فضل حسین نے جتھ کا زور توڑنے۔ اور مسلم لیگ سے مسلمانوں کی نمائندگی کا پروانہ چھیننے کے لئے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کرائی۔ تو اس کی صدارت کے لئے آغاخان کو انگلستان سے بلا یا۔ ادویوں پورے سولہ سال کی گنتامی کے بعد آغاخان کو پھر مسلمانوں کی قیادت کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہ اپنی اس عزت افزائی کے لئے کلیۃً فضل حسین کے ممنون تھے۔

۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنس کے اجلاس شروع ہوئے۔ تو وہاں بھی فضل حسین کی کوشش سے مسلمانوں کے وفد کی رہنمائی آغاخان کے سپرد ہوئی۔ گول میز کانفرنس نے حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد کو یہ احساس کرا دیا کہ آغاخان صرف گھوڑ دوڑ ہی کے سٹوڈنٹ نہیں بلکہ عرصہ سیاست کے بھی بہت بڑے شہسوار ہیں۔ چنانچہ آغاخان نے اپنی سوانح حیات میں بار بار اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے بعد برطانیہ کے دفتر خارجہ۔ وزیر ہند اور وائسرائے کارڈین ان کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا۔ اور ان لوگوں نے آغاخان کی سیاسی قابلیت سے بھی فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ رویے کی اس خوشگوار تبدیلی کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آغاخان کو بحیثیت اہم

لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کا نامزدہ مقرر کیا گیا اور پھر وہ اس لیگ کے صدر بھی بنا دیئے گئے۔ اندر میں حالات اگرا ناخاں نے فضل حسین کی درخواست پر یونینسٹ پارٹی کو بیس ہزار روپے عطا کئے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ بیس ہزار کی رقم گویا فضل حسین کے احسانات کا حقیقہ معاوضہ تھی۔

میاں احمد یار خاں دہلتا نہ کو یونینسٹ پارٹی کا چیف سکرٹری اور نواب مہرٹ کو خزانچی مقرر کیا گیا۔ ان کی مدد کے لئے ایک بہت بڑا سکرٹریا بھی قائم ہوا۔ جس میں سردار حبیب اللہ۔ مولوی غلام محی الدین مقصوری۔ سید افضل علی سستی۔ سید امجد علی۔ میاں امیر الدین۔ میر مقبول محمود اور نواب زاوہ خورشیدی خاں کو مختلف نرائض سپرد کئے گئے۔

میاں فضل حسین سالہا سے مسلسل حکومت سے وابستہ چلے آ رہے تھے وہ بلاشبہ بڑے زمین اور حالانکہ زمانہ سے واقف شخص تھے۔ لیکن پندرہ سال تک حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کے بعد ان کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ وہ یہ حقیقت سمجھنے سے معذور تھے کہ عدم تعاون اندمول نافرمانی کی وسیع تحریکیں نے ہندوستان کی نر اڈو کے ذہن و فکر کو کس طرح نئے راستوں پر ڈال دیا تھا۔ کانگریس کارڈز افرادوں اثر ایک سیلاب کی طرح اپنی لہروں پر ہندو نوجوانوں کو آگے بڑھائے لئے جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان سیاسی شعور کے اعتبار سے پس ماندہ تھے۔ لیکن اس پس ماندگی کے باوجود انھیں یونینسٹ پارٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس پارٹی نے سالہا سے گراہ تاکہ مسلمانوں کے لئے کیا کیا تھا کہ اب انھیں دوبارہ اسی

دام میں قدم رکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔

زیادہ سے زیادہ یہ دعوتے کیا جا سکتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی نے سرکاری ملازمتوں کے حصول میں مسلمانوں کی بہت مدد کی۔ آئیے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے۔ اس بات پر ایک نگاہ ڈالیں کہ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے سرکاری محکموں کی تمام چھوٹی بڑی اسامیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا کیا تناسب تھا۔ اس طرح ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ بارہ سال کے دور اقتدار میں یونینسٹ پارٹی نے کہاں تک مسلمانوں کو ان کا جائز حق دلانے کی کوشش کی۔

پنجاب سول سروس (ریگزیٹیکٹیو برانچ) میں مسلمانوں کا تناسب ۲۰ فی صد۔ اور جوڈیشین برانچ میں ۳۲ فی صد تھا۔ پولیس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ یہ محکمہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ لیکن یہاں انسپکٹری اسامیوں میں مسلمان ۳۸ فی صد تھے۔ البتہ سب انسپکٹری میں انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں حاصل تھیں اور اسسٹنٹ سب انسپکٹرز اور ہیڈ کنسٹبل کے درجے میں انہیں آبادی کے تناسب سے زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی رحیمہ انبار کی پروڈنشل انجینئرنگ سروس میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد ۶۶ تھی اور اس کے مقابلے میں مسلمان صرف ۸ تھے۔ سب انجینئرنگ کے درجے میں مسلمان ۱۲ فی صد اور ہندو ۸۷ فی صد تھے۔ سبارڈی ٹیٹ انجینئرنگ سروس میں مسلمان ۳ فی صد اور ہندو اور سکھ ۷۰ فی صد تھے۔ کلرک اور ہیڈ کلرک کی اسامیوں پر مسلمانوں کا تناسب ۳۶ فی صد اور ہندوؤں اور

سکھوں کا حصہ ۶۶ فیصد تھا۔ پٹواریوں میں مسلمان صرف ۳۸ فی صد تھے ورنہ  
رہے کہ یہ محکمہ گذشتہ دس سال سے ایک مسلمان ممبر کے تحت چلا آ رہا تھا۔

محکمہ جنگلات کی پرائونٹل سرورس میں اکثر اسسٹنٹ کنزرویٹرز کے عہدہ پر

مسلمانوں کا تناسب ۱۱ فیصد تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب ۸۳  
فیصد تھا۔ محکمہ مال کے پٹواریوں میں البتہ مسلمان ۵۰ فیصد کے قریب تھے۔

محکمہ قانون میں مسلمانوں کی نیابت ۱۲ سے زیادہ نہ تھی۔ جیل کے محکمہ

کی اسٹے اسامیوں پر مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ لیکن وارڈر اور ہیڈ

وارڈر کی ادلتے ملازمتوں مسلمانوں کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے

زیادہ تھا۔ ہائی کورٹ کے کلرکوں میں مسلمانوں کا حصہ ۷۳ فی صد کے

قریب تھا۔ لیکن پنجاب سول سکرٹریٹ میں جو تمام صوبے کے نظم و نسق

کا مرکزی ادارہ سمجھا جاتا تھا، مسلمان کلرکوں کی تعداد صرف ۷۳ فی صد تھی۔

نیشنل کونسل کے دفتر میں مسلمان صرف ۳۳ فیصد تھے۔ حالانکہ ۱۹۲۶ء سے اب تک

ریونیو ممبری کا منسوب مسلمان کے پاس چلا آ رہا تھا۔

اب آئیے ان محکموں کی طرف جنہیں محکمہ جات متعلقہ کہا جاتا ہے۔ اور جو ذرا

کی تحویل میں تھے۔ ذرا عت کے محکمے کی پرائونٹل سرورس کے درجہ اول میں ایک

مسلمان بھی نہیں تھا۔ اور ایگلر ایکچریل اسسٹنٹ کے عہدے پر مسلمانوں کا تناسب

صرف ۳۳ فی صد تھا۔ ڈیپارٹمنٹ میں ان کا تناسب ۴۰ فی صد کے قریب۔ اور

کوآپریٹو سوسائٹی کے محکمے میں ماتحت ملازمتوں میں انہیں آبادی کے تناسب کے

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی پروڈنشل سروس میں مسلمان ۱۱ فیصد تھے اور سپیشل گریڈ میں ان کا حصہ صرف ۷ فیصد تھا۔ سب انجینئیر کی اسٹیپنڈیاں ۱۰ فیصد کے قریب تھیں اور کلریوں میں وہ صرف ۳۶ فیصد تھے۔

محکمہ تعلیمات کے سپیشل گریڈ میں مسلمان گیارہ فی صد تھے۔ پروڈنشل گریڈ کے درجہ دوم کی ایک سو گیارہ اسمیوں میں سے مسلمانوں کے پاس صرف ۳۶ فیصد حصہ تھا۔ اور ۵۷ فیصد حصہ سپردوں اور سکھوں کے ہتھ میں۔ سبارڈیٹیٹ سروس کی ۹۸۸ اسمیوں میں سے مسلمانوں کے پاس ۳۹ فیصد اور سپردوں اور سکھوں کے پاس ۶۱ فیصد حصہ تھا۔ واضح رہے کہ گیارہ سال سے محکمہ تعلیمات کی مسند وزارت پر مسلمان ٹکٹن چلے آ رہے تھے۔

میڈیکل سروس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ سول سرجن کی اسمیوں میں سے مسلمانوں کا تناسب ۲۲ فیصد۔ اسٹنٹ سرجن ۲۷ فیصد اور سب اسٹنٹ سرجن ہیں ۲۲ فیصد تھے۔ ڈسپینسریوں کی معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمان صرف ۳۲ فیصد تھے۔

پبلک ہیلتھ کے محکموں میں مسلمانوں کا مجموعی حصہ ۳۰ فیصد تھا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ اور جسٹیشن کے محکمہ میں بھی مسلمانوں کا یہی کچھ عاں تھا۔ یونیسٹ پارٹی کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں

---

۱۷۔ یہ تمام اعداد و شمار میاں فضل حسین کے ایک انگریزی پمبلٹ "پنجاب پالیٹکس" سے حاصل کئے گئے ہیں۔

میں ان کا جائز حق نہ مل سکا۔ حالانکہ تعلیم یافتہ مسلمان مارے مارے بیکار پھرتے تھے۔ سیاسی بیداری کا صوبے بھر میں نام و نشان نہیں تھا۔ عوام میں جب کبھی کسی سیاسی تحریک کے برگ و بار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے گورنر سے مل کر اس تحریک کو ابھرنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ یونینسٹ پارٹی صوبے کے چند بڑے بڑے زمینداروں کا ایک اجارہ تھا۔ اور اس اجارہ سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے ایک طرف تو تعلق و خوشامد کی روایات کو فروغ دیا۔ اور دوسری طرف عوام کی نماندگی کے دعوے دار بن کر۔ اور ہر قسم کا مال و دولت سمیٹ کر اپنے گھر بھرنا شروع کر دیئے۔ پھر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق کو اس درجہ راسخ کر دیا کہ اب یہ دونوں طبقے خواہ مخواہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا اقتدار کرتے وقت بعض ایسے لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ جو کسی زمانے میں اُن کے شریک و ہمیں رہ چکے تھے۔ لیکن اب بعض وجوہ سے اُن کے راتے لٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں ملک برکت علی بھی شامل تھے۔ ملک صاحب نے اُس دعوت کا جو جواب دیا۔ وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے اُس جواب کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری ہے۔

”..... آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں خودداری کا اقتدار ہو گیا ہے۔ اور قومی کارکنوں کے سامنے سب سے مقدم اور فردی مسئلہ یہ ہے۔ کہ زائل شدہ خودداری کو کیونکر بحال کیا جائے۔ خدا آچکے



خوش رکھے۔ اس خوبصورت حقیقت کو اس سے بہتر سراہے ہیں  
 بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو میں یہ عرض کروں گا  
 کہ خودداری کے اس فقدان کی ذمہ داری سر اسر اس یونینسٹ  
 پارٹی کے سرعائد ہوتی ہے۔ جسے آپ پنجاب کے سیاہ وسیپید کا مالک  
 بنا کر خوددہلی تشریف لے گئے تھے۔ یہی پارٹی آپ کی غیر حاضری میں  
 بدسر اقتدار رہی۔ اور اسی پارٹی نے صوبے کی خودداری کو بیچ کھایا  
 ہے۔ ستم ہے کہ اب آپ نے پھر اسی پارٹی کو منظور نظر قرار دے کر  
 اپنے آپ کو اس سے وابستہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے آپ حالات پر  
 قابو پاسکیں۔ لیکن کب تک؟ سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد یہ کام  
 کون کر سکے گا؟ کیا لوزن اور سکندر یہ کام کریں گے؟ ہمیں یہ  
 دیکھ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ وہ لوگ جن کو خود آپ نے اپنے  
 ہاتھ سے بنایا تھا۔ اب آپ کو گہرائی کے لئے سندھوں کے ساتھ  
 ساز باز کر رہے ہیں۔ ایسٹرن ٹائمز کہتا ہے کہ سر سکندر نے آپ کی  
 قیادت قبول کر لی ہے۔ لیکن ٹریبون کا بیان اس کے بالکل برعکس  
 ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سر سکندر ہے کون؟ میاں صاحب!  
 خدارا آنکھیں کھولیں، اور صوبے کے لائق اور قابل افراد کو اپنے  
 گرد جمع کیجئے۔ اُن افراد کو جنہیں آپ نے دھتکار کر پڑے پھینک  
 دیا ہے۔ اور جو گننامی میں پڑے ہوئے اپنا وقت کاٹ رہے  
 ہیں۔ صوبے کے یہی لائق اور قابل افراد شہنشاہیت پسند گورنر

کا مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ بھی تو اسی طبقے کے افراد سے تعلق رکھتے تھے۔ جب آپ یہاں حکمراں تھے۔ تو پنجاب میں یقیناً خودداری کا جذبہ موجود تھا۔ لیکن آپ کے جانشینوں نے جو کچھ حال کر دیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ تعجب ہے کہ آپ پھر بھی اُن کے عظیم شان کا ناموں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں سمجھتے۔

”ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ پھر سے قابل افراد کو میدان میں لے آئیں گے۔ سچ پوچھنے تو ان سکندروں اور نوتوں کو بے عملت تمام ختم ہو جانا چاہیے۔ اور جس قدر جلد یہ لوگ اپنے اصل مقام پر واپس چلے جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ موجودہ صورت حال کے ذمہ دار آپ اور صرف آپ ہیں۔ یہ سکندر اور یہ نون اور یہ انگریزوں کے اشلے پر ناچنے والے بڑے بڑے زمیندار تو ایک منٹ میں صاف کئے جاسکتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کی پشت پناہ اور ان کا ملجا مادی آپ ہیں۔“

”مسلمانوں کو آپ سے یہی شکایت ہے۔ کیا آپ اس سے باخبر ہیں؟ اگر باخبر نہیں ہیں تو میں نے جرأت کر کے ساما ہاں آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ تاکہ کل کوئی یہ بات نہ کہہ سکے کہ آپ کے کسی دوست نے اپنا سینہ چیر کر آپ کو بول کی بات نہیں بتائی۔ ہمارے دل میں اب بھی آپ کی عزت اور آپ کا احترام موجود ہے۔ لیکن ہم نے مجبوراً اور تنگ آکر قومی خدمت کے میدان سے کنارہ کشی اختیار

کر لی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا درو مند دل ہے جو اس  
افتوناک صورت حال پر آٹھ آٹھ آنسو نہیں روتا۔ جسے آپ کی  
لیڈر شپ نے پیدا کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہم لوگ صوبے  
کی خدمت اور اس کے وقار کو بلند کرنے کی تمام کوششوں سے  
محروم ہو گئے ہیں؟

” اقبال ختم ہو چکا ہے۔ بچارا شاہ نواز اپنا وقت لپٹا کر چکا ہے  
اور شجاع بھی گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ باقی رہ گئے۔ سکندر۔ فیروز  
اور سر شہاب۔ اب انہی لوگوں کا بول بالا ہو گا۔ اس وقت جو  
ماحول طاری ہے اور جو موانع حائل ہیں۔ ان کی موجودگی میں ان  
لوگوں کے سوا اور کون ترقی کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی اس  
پینسٹ پارٹی کی مہربانی سے ہوا ہے۔ جن کے بلند بانگ دعاوی  
کا ڈھنڈورا آپ بدستور پیٹ رہے ہیں۔“

۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح لاہور تشریف لائے۔ اور میاں احمد یار خاں  
دولتانہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ دو دہینے پہلے جب وہ مسجد شہید گنج کا قصبہ  
چکانے کے لئے لاہور آئے تھے۔ تو بھی احمد یار خاں دولتانہ ہی کے مکان واقع  
جیل روڈ پر ٹھہرے تھے۔ مسٹر جناح کی تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ آل  
انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد بمبئی کے مطابق پنجاب میں بھی ایک پارلیمنٹری

۱۔ اصل خط انگریزی میں تھا جو ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا تھا۔

بورڈ قائم کیا جائے۔

یکم مئی کو مسٹر جناح سرفضل حسین سے اُن کے مکان پر جا کر ملے۔ اسی مکان میں جہاں آج کل ریڈیو اسٹیشن قائم ہے، مسٹر جناح کی ساتھ ملک لال دین تبصر مرحوم بھی تھے۔ جناح اور فضل حسین کی گفتگو دیر تک جاری رہی۔ دونوں اپنے اپنے سیاسی عقیدے کے مطابق اپنی اپنی جگہ چٹان کی طرح کھڑے تھے۔ مسٹر جناح چاہتے تھے کہ مسلمان امیدواروں کو لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ اور اسمبلی کے اندر اپنے ہم خیال وہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ تعاون کر کے وزارت مرتب کرنا چاہیے۔ میاں فضل حسین کا جواب یہ تھا کہ پورے ایوان میں مسلمان صرف اکیادہ فی صد ہیں۔ اور جب تک انہیں غیر مسلموں کے کسی قابل اعتماد فریق کا تعاون حاصل نہ ہو۔ وہ وزارت نہیں بنا سکتے اس لئے انہوں نے اسمبلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی چودہری چھوٹو رام کے ساتھ مل کر ایک غیر فرقہ دارانہ اور مخلوط جماعت یعنی یونیسٹ پارٹی بنالی ہے اور اب اسی پارٹی کے نام پر الیکشن لڑی جائے گی۔

مسٹر جناح ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی اس بنیادی کمزوری سے واقف تھے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو چونکہ ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی نہیں ملی، اس لئے انہیں لامحالہ کسی غیر مسلم گروہ کے ساتھ مل کر وزارت بنانا پڑے گی۔ چنانچہ انہوں نے میاں فضل حسین سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

”آپ بے شک اسمبلی کے ایوان میں چودہری چھوٹو رام سے اشتراک و تعاون کیجئے۔ لیکن اسمبلی کے باہر کسی مخلوط پارٹی کے

نام پر نہیں بلکہ مسلم لیگ کے نام پر ایکشن لڑنی چاہیے۔ تاکہ اسمبلی کے اندر مسلمانوں کا وجود ایک جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے برقرار رہے۔ جب تک طریق انتخاب جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ پارٹی بنانے کے بغیر چارہ نہیں۔ اور اگر آپ مخلوط پارٹی کے نام پر ایکشن لڑنے کے قائل ہیں تو پھر مخلوط انتخاب رائج کئے جائے۔ آپ کو کیا اعتراض ہے علاوہ ازیں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی بجائے۔ مسلمان کانگریس میں کیوں نہ شامل ہو جائیں۔ جو یقیناً یونینسٹ پارٹی سے زیادہ ترقی پسندانہ جماعت ہے۔“

اس بحث و مباحثہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ میاں فضل حسین کا جواب بہر صورت یہی تھا کہ اس بات کا انتظار کہ تاکہ اسمبلی کے اندر جا کر کسی ہم خیال جماعت کا تعاون حاصل کیا جائے۔ صرف بے سود ہی نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ لہذا ہم یونینسٹ پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ پارٹی نہیں بنا سکتے۔

یہ صورت حال تھی جب مسٹر جناح علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں کافی پریشان تھے۔ ان کی صحت خراب تھی۔ اور وہ بیماری جس نے بعد ازاں مرض الموت کی صورت اختیار کر لی شروع ہو چکی تھی۔ سال بھر پہلے ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اور دونوں بچوں کی نگہداشت کا سارا بوجھ تنہا ان پر آ پڑا تھا۔ پریکٹس بند ہو جانے کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع بھی بند ہو چکے تھے۔

جب ان دنوں عظیم المرتبت انسانوں کی ملاقات ہوئی۔ تو میرے مرحوم دوست فضل کریم ڈرائی وہاں موجود تھے۔ ڈرائی انگریزی کے بڑے فاضل انٹارپرواز تھے۔ اور ان دنوں ایک ہفتہ دار اخبار سٹوڈنٹ نکالتے تھے۔ ڈرائی مرحوم نے ایک مرتبہ اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بڑا دلچسپ نکتہ کھینچا تھا۔ کہنے لگے۔ ”مسٹر جناح اپنی روایتی جامہ زیبی۔ اور خوش پوشاکی کا ایک ولاڈیز مرتع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلیٰ درجہ کی ولایتی دوکان کا سہا سوا بٹنی نیت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور چال جیسے کڑی کماں کا تیر۔ ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پر سوائے بنیان اور دھونی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے انداز کا پورا وعدہ کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اردو کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے بوت پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مردکانہ کرسکتا ہوں۔“

ڈرائی مرحوم کی روایت ہے کہ یہ بات سنکر مسٹر جناح کرسی سے دوپٹے اُوپر اٹھے۔ اور بڑے جوش سے کہنے لگے۔ ”مجھے صرف عوام کی مردکانہ ہے۔“ جہاں تک میری ناچیز معلومات کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان اس سے قبل، کبھی گہرا ربط و نسبت قائم نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سال ۱۹۲۷ء تک سیاریات میں عملی حصہ لینے سے ہمیشہ گریزاں ہے جہاں تک کہ تحریک عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی

انشاء ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ انداس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا۔ توڈاکٹر صاحب کے مکان واقع مگلو ڈروڈاؤ گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قرب مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں جب مسلم لیگ کے دو حقے ہو گئے۔ توڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیق لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیق لیگ کے سکریٹری بھی بن گئے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرض وجود میں آئی۔ توڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے وہ اس کی مجلس عاملہ کے ممبر۔ اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔ ڈاکٹر سعید الدین کچلو جو راقم التحریک کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۲۸-۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ سکریٹری اور مسٹر جناح کے دست راست تھے انھوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ :

”جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں سلطنت کی آل انڈیا کنونشن نے ان تینوں ترمیموں کو بے دردی سے رد کر دیا۔ جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آچکا تھا۔ اداہر کانگریس نے یوں ہمارا دست تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں نے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا۔ تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت

پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویے پر سخت  
 نکتہ چینی کی۔ اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے  
 جو اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار  
 کر کے۔ آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں گے بصورت  
 نہیں ہو سکتی۔“

ستمبر ۱۹۳۱ء میں مسٹر جناح گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے انگلستان  
 چلے گئے۔ اور پھر وہیں مستقل اقامت کے ارادے سے کھڑے ہو گئے۔ نومبر ۱۹۳۱ء  
 میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے  
 اور اس طرح غالباً برسوں کے بعد انھیں مسٹر جناح سے بالمشافہ ملاقات کا  
 موقع ملا۔

مجھے لندن میں بعض ایسے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے ملنے کا اتفاق  
 ہوا جو گذشتہ تیس، پینتیس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ ان کی زبانی  
 معلوم ہوا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے تھے۔ تو چند اصحاب  
 کی کوششوں سے ایک اقبال ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی جس نے ڈاکٹر  
 صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی تھی۔ جہاں گول  
 میز کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ بہت سے اہل قلم انگریز بھی شریک ہوئے  
 تھے۔ اس دعوت میں مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب کی مدد و تسلیت میں ایک  
 فصیح تقریر کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے



بھی انگلستان تشریف لائے تھے۔ مسٹر جناح کو حکومت نے ایک بے مصرف آدمی سمجھ کر مدعو نہیں کیا تھا۔ اور اس دوران میں خود مسٹر جناح ہندوستان کی سیاسیات سے اس قدر بدول ہو گئے تھے کہ انہوں نے ترک وطن کر کے لندن ہی میں اپنا مکان خرید لیا تھا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان کچھ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور جب ڈاکٹر صاحب گول میز کانفرنس کی کارروائی سے اس قدر پرگشتہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے کانفرنس سے مستعفی ہو کر واپسی کا رخت سفر باندھ لیا۔ تو ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان کچھ ملاقات ہوئی۔ اور ان دونوں میں کم از کم اس بات پر ضرور اتفاق ہو گیا تھا کہ گول میز کانفرنس کے ڈھونگ سے مسلمانوں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ قینا اُس کا ڈھنڈورہ پٹیا جا رہا تھا۔

مئی ۱۹۲۶ء میں جب مسٹر جناح ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر جا کر ان سے ملے۔ تو ستمبر ۱۹۲۸ء کی غلط فہمیاں رفع ہو چکی تھیں اور کچھ لندن کی ملاقاتوں کی وجہ سے۔ اور کچھ بعد کے واقعات کی نوعیت کے باعث ان کے درمیان اچھی خاصی نیگا نگیٹ پیدا ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس لئے جب مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس تجویز کی حمایت کی۔ اور امداد و اعانت کا پورا وعدہ کیا۔

میاں احمد یار خاں دولتاناہ کے مکان پر دو یا تین روز قیام کرنے کے بعد مسٹر جناح ہوٹل میں اُٹھ آئے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ احمد یار خاں دولتاناہ یونیٹ

پارٹی کے چیف سکریٹری تھے۔ اور اب کہ سرفضل حسین سے کھلم کھلا ٹھن جانے کا احتمال پیدا ہو گیا تھا۔ مسٹر جناح نے اُن کے چیف سکریٹری کے ہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

اتحادِ ملت اور مجلسِ احمدیہ کے لیڈروں نے بھی مسٹر جناح سے ملاقات کی اور مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہونے کو تیار تھے۔ لیکن شرط یہ تھی کہ اول تو کسی قادیانی کو لیگ میں شریک نہ کیا جائے۔ دوم مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نوآبادیات کے بجائے مکمل آزادی ہونا چاہیے۔

نصب العین کی تبدیلی کے بارے میں مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہو گا۔ قادیانیوں کی شرکت یا عدم شرکت کے متعلق انہوں نے کوئی وعدہ نہ کیا۔ تاہم مجلسِ احمدیہ اور اتحادِ ملت کے رہنماؤں نے پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہونے کی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۸ مئی ۱۹۴۶ء کو علامہ اقبال، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین

غلام رسول خاں اور پیر تاج الدین کے مشترکہ دستخطوں سے ذیل کا بیان ایسی ایڈپریس کی معرفت تمام اخباروں میں شائع ہوا۔

دعا مسٹر جناح کی بے نفسی اور دور اندیشی کی داد دینا چاہیے

کہ انہوں نے ایسے موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ جب

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نئے انتخابات کا

وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر جناح کے اس اقدام سے اُن غرض

پرست اور رجعت پسند طبقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے جو اب تک مسلمانانِ ہند کی قیادت کا غلط و غولے کر کے اپنی مطلب براری کرتے رہے ہیں۔ یہ کھلبلی، یہ اضطراب اور یہ پریشانی ہمارے نزدیک کچھ غیر متوقع نہیں ہے۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تنظیم کا جو بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان مطلب پرست لیڈروں کے سوانی قلعہ کا پاش پاش ہو جانا یقینی ہے۔ کیونکہ اب مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کے صحیح نمائندے جائیں گے۔

”اندریں حالات ہمیں یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہیں ہوا کہ بعض اخباروں نے مسٹر جناح کی ناکامی کی فرضی اور بے بنیاد داستانیں وضع کر کے سارے کرنا شروع کر دی ہیں ان اخباروں کا یہ بیان کہ پنجاب میں سوائے احرار لیڈروں کے اور کسی جماعت نے مسٹر جناح کا ساتھ دینا گوارا نہ کیا۔ ایک صریح جھوٹ ہے۔“

”ہمیں یہ کہنے میں کوئی تاثر نہیں کہ مذکورہ بالا اخباروں کے اس قسم کے بیان صرف غلط ہی نہیں۔ بلکہ گمراہ کن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم کو مسٹر جناح کی دیانت و امانت اور سیاسی بصیرت پر ایسا بچتا اعتماد ہے کہ مسلمانانِ پنجاب کے تمام طبقوں نے بیک آواز مسٹر جناح کی تجویز کو لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ پنجاب کے مسلمان مسٹر جناح کی اس تجویز کے دل سے حامی ہیں کہ آئندہ صوبے کی اسمبلی میں ایسے خوددار، خود اعتماد اور محب وطن نمائندوں

کو سمجھا جائے۔ جہاں ایک طرف مسلمان قوم کے حقوق کا خاطر خواہ تحفظ کریں  
تو دوسری طرف ایوان کے دیگر ترقی پسند ممبروں کے ساتھ مل کر رائے عامہ  
کا وقار بھی قائم کر سکیں۔

”ہیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ مسٹر جناب کی یہ تجویز جداگانہ انتخابی  
کا لازمی نتیجہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ جس اہم کام  
کی ابتدا انہوں نے کی ہے ہم اس کو تکمیل تک پہنچانے میں دل دھان  
سے ان کے حامی ہیں!“

اس بیان کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ یونینسٹ پارٹی نے لاہور کے متعدد  
اخباروں کو مالی دغا لٹ دینا شروع کر دینے تھے۔ اور یہ اخبار یونینسٹ پارٹی کے  
صدر دفتر کا اشارہ پا کر سبٹروڈ کے چھتے کی طرح مسٹر جناب پر پل پڑے تھے۔ لاہور  
سے ان دنوں مسلمانوں کا صرف ایک انگریزی روزنامہ ایسٹرن ٹائمز نکلتا تھا  
جو کلٹیہ یونینسٹ پارٹی کے پراپاگنڈے کے لئے وقف تھا۔ اس کے علاوہ سول ملٹری  
گزٹ کے صفحات پر ایک صاحب ”مسلم کار سپانڈنٹ“ کے نام سے ہر ہفتے یونینسٹ  
پارٹی کی تعبیہ خوانی اور مسٹر جناب کی مذمت میں اپنا زور قلم صرف کرتے تھے  
اردو روزناموں میں انقلاب یونینسٹ پارٹی کا سب سے بڑا اور سب سے  
بلنداً ہنگ تعبیہ تھا۔

انہی دنوں ایک روز ملک برکت علی میر سے ہاں نشہ لیا۔ ان کے ساتھ

لاہور روزنامہ سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ء۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

غلام رسول خاں بھی تھے۔ جن سے ملاقات کا شرف اس سے قبل مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ ملک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید سونے والی ہے لیکن کام کرنے والوں کی سخت کمی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

مجھے ملک صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل میں بے حد متاثر تھا۔ اور اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مجھے سیاسیات میں عملی حصہ لینے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ اس زمانے میں سیاسیات سے میری دلچسپی صرف اس حد تک محدود تھی کہ روزانہ اخبار پڑھ لیا۔ مہینے میں سیاسیات کی دو ایک تازہ کتابیں نظر سے گذر گئیں۔ اور یا پھر کبھی دوستوں کی محفل میں کسی سیاسی موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ تو اس میں حصہ لے لیا۔ اس سے آگے بڑھنا مجھے منظر نہیں تھا۔ تاہم اتنی کمی تھی کہ مجھے خود اپنے سیاسی عقائد پر اعتماد نہیں تھا۔ اس زمانے میں مخلوط انتخاب کا حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کانگریس کے ذریعے سے پنجاب کے مسلمانوں کے سیاسی جمود کو رفع کیا جائے۔ لیکن ملک صاحب سے میری دوستی اور نیا مندی ایسی معمولی چیز تھی کہ وہ میرے ایک دفعہ کے انکار سے خاموش ہو جاتے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ "کام کرنے والوں کی سخت کمی ہے۔ لیگ کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ تنخواہ دار آدمی رکھ لے جائیں اور یونیٹ پارٹی نے صرف پراپاگنڈے کے لئے ایک لاکھ روپے جمع کر لئے ہیں۔ تمہارا لکھنا اگر آج قوم کے کام نہ آیا۔ تو پھر کب کام آئے گا۔"

میں نے آخر ملک صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ ۱۲ مئی کو

میں عبدالعزیز پیرسٹریٹ لا کے مکان بیرون پٹی دروازہ پر جب مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو مجھے بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ جلسے کی صدارت کے لئے علامہ اقبال بہ نفس نفیس تشریف لائے تھے اور انہی کی صدارت میں چار قراردادیں منظور ہوئیں۔

پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی جائے اور اصحاب ذیل کو صوبہ لیگ کے عہدیدار مقرر کیا جائے۔ صدر: علامہ اقبال۔ نائب صدر: ملک پرگت علی اور خلیفہ شجاع الدین۔ سکریٹری: غلام رسول پیرسٹریٹ لا۔ جوائنٹ سکریٹری: میاں عبدالمجید پیرسٹریٹ لا اور عاشق حسین بٹالوی۔

دوسری قرارداد یہ تھی کہ مسٹر جناح کی اس اسکیم کا خیر مقدم کیا جاتا ہے جس کی دوسرے آل انڈیا مسلم لیگ ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کے انتخابات کی نگرانی کرے گی۔ نیز سندھ، تان کے مسلمانوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کریں۔ تیسری قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ جون کے وسط میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے جو اجلاس لاہور میں ہونے والے ہیں۔ ان کے عملہ تنظیمات اور باہر سے آنے والے ہالوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنے کے لئے ایک مجلس استقبالیہ قائم کی جائے۔

چوتھی قرارداد فلسطین کے متعلق تھی۔ جس میں برطانیہ کی عرب دشمنی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

مسٹر جناح ایک ہفتہ لاہور میں کٹھ کر اور لنڈھی تشریف لے گئے۔ اور وہاں

چند روز قیام کے بعد کشمیر چلے گئے۔ سرری نگر سے ۲۱ مئی کو انہوں نے مرکزی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ بورڈ کے تمام ممبروں کی تعداد ۵۶ تھی۔ جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے آدمی شامل تھے۔ پنجاب سے ذیل کے گیارہ اصحاب نامزد کئے گئے تھے۔

علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں (اتحادِ دلت)، مولانا محمد اسحاق مانہر دی۔

اتحادِ دلت، سید زین العابدین شاہ گیلانی (اتحادِ دلت)، میاں عبدالعزیز پیرسٹراہٹ لا۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ شیخ حامد الدین (احرار)، چودہری افضل حق (احرار)، چودہری عبدالعزیز بیگودال (احرار)، خواجہ غلام حسین ایڈوکیٹ (احرار)۔

اس طرح گویا چار نشستیں اہل اراکین نشستیں اتحادِ دلت کو حاصل ہوئی۔ اتحادِ دلت والے بڑے ذکی اہمس تھے۔ انہوں نے دے لفظوں میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ روزنامہ زمیندار اتحادِ دلت کا اخبار تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاں اتحادِ دلت کے صدر تھے۔ اس لئے زمیندار میں پے در پے ایسے مقالے شائع ہونے شروع ہوئے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتحادِ دلت کے رہنما غالباً مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ۲۳ مئی کو علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو لکھا۔

..... مجھے امید ہے کہ پنجاب کی تمام جماعتیں بالخصوص اہل اراکین اور

اتحادِ دلت، کسی قدر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے ساتھ شریک

ہو جائیں گی۔ اتحاد کے ایک بڑے گرم جوش اور سرگرم ممبر نے چند روز

ہوئے مجھ کو یہی بتایا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے متعلق خود اتحادِ دولت  
 والے ذوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کدھر کا رنج کریں گے۔ تاہم بھی بہت  
 وقت ہے۔ اور ہمیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عوام اتحاد کے نمائندوں

کو اسمبلی میں بھیجنے کے کہاں تک شوقین ہیں“

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اتحادِ دولت کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے کہ  
 یہ جماعت کب بنی، کیونکر بنی، اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ ۱۹۳۵ء کے  
 ادائل تک احرارِ پنجاب پر چھپانے ہوئے تھے۔ ان کے شاندار جلسے اور دھوم  
 دھامی جلوس دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ پنجاب کی سیاست میں یہ  
 جماعت ایک فیصلہ کن حصہ لے گی۔ احرار کے حریت مندر اور غیر منظم تھے۔  
 تاہم وہ موقع کے منتظر تھے کہ کب احرار کے مقابلے میں اپنا جھنڈا بلند کریں۔ ایسا  
 موقع جولائی ۱۹۳۵ء میں آگیا۔ جب سکھوں نے مسجد شہید گنج کو مسہار کر کے  
 مسلمان پنجاب کے دیوں پر ایسا چرکا لگایا۔ جس کا گھاؤ مدت تک نہ بیل نہ ہو سکا۔  
 عوام کا خیال تھا کہ احرار جو ہر عیبیت کے وقت سینہ تان کر آگے کھڑے ہو جا  
 تھے، شہید گنج کے حادثہ خونیں پر بھی مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے۔ لیکن یہ دیکھ  
 کر سخت تعجب ہوا کہ احرار نے اس موقع پر بالکل سکوت اختیار کر لیا۔ لوگ پریشان  
 تھے اور رہنمائی کے محتاج۔ جب احرار نے کوئی قدم نہ اٹھایا تو مولانا ظفر علی خاں  
 سید حبیب، ملک لال خاں، سید زین العابدین شاہ، میاں فیروز الدین احمد،  
 ملک لال دین قبیر، ڈاکٹر محمد عالم وغیرہ آگے بڑھے۔ اور ان لوگوں نے اپنے  
 ہم و فرست کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دینے کی کوشش کی  
 لہ اقبال کے خطوط جلد کے نام (شیخ محمد اشرف)

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



حکومت نے میاں ڈاکٹر عالم کے باقی تمام اصحاب کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ فروری ۱۹۳۷ء میں مسٹر جنلج کی کوشش سے یہ لوگ رہا ہوئے۔ اور انہوں نے مل کر مجلس اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی۔ جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج کو سکھوں سے واپس لیا جائے۔ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں حرار اور اتحادِ ملت دو حریف جماعتیں بن گئیں۔ جن کے درمیان عرصہ دراز تک مخالفت کی آگ بھڑکتی رہی۔

۲۸ مئی کو علامہ اقبال نے اپنے دولت کدہ پر مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے پنجابی اراکین کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی شریک ہوئے۔ خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ سید محمد علی جعفری۔ ملک نور الہی مالک، ذرنامہ احسان۔ پیر تاج الدین بیرسٹریٹ لا۔ ملک نور احمد۔ غلام رسول خاں بیرسٹریٹ لا۔ شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ۔ میاں عبدالمجید بیرسٹریٹ لا۔ عاشق حسین بٹالوی۔

اس جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ اور دو قراردادیں منظور ہوئیں۔ پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لئے ایک صوبہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے اور دوسری قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ مجوزہ پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کر کے انھیں علامہ اقبال کے نام نامی سے پنجاب بھر میں تقسیم کیا جائے۔

۸ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس لاہور میں ہوئے والے تھے اور جون کو مسٹر جنلج کشمیر سے واپس لاہور پہنچے

رہے تھے۔ یہ زمانہ سخت مصروفیت کا تھا۔ علامہ اقبال اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود سارے کام کی ایک ایک تفصیل کو بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔ انہی دنوں بڑے زور سے یہ افواہ اڑنے لگی کہ مسٹر جنرل کی آمد پر یونینسٹ پارٹی سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرہ کرے گی۔ جب ہم لوگوں نے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کا واقعی یہ امداد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا۔ تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ اس لئے کہ عین اس وقت جب مسلمانانِ ہند کے نمائندوں کا اجتماع لاہور میں ہونے والا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کی اس قبیح حرکت سے اہل لاہور کے نام پر ایک شرمناک دھبہ لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک لال دین قیصر سے کہا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے فلاں فلاں ممبر کے پاس جا کر یہ پیغام پہنچا دیں۔ کہ اگر انہوں نے سیاہ جھنڈیوں کا پروگرام ترک نہ کیا۔ تو اسکے نتائج خود یونینسٹ پارٹی کے لئے سخت خطرناک ثابت ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس پارٹی کے بعض ہوشیار آدمیوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اور سیاہ جھنڈیوں کا مذموم ارادہ فرسٹ کمر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے پیمانے اور ذمہ دار بہدروں میں سے کسی کو سیاہ جھنڈیوں کے پروگرام کا علم نہیں تھا۔ یہ ساری کارروائی دو تین ایسے نوجوانوں کی تھی۔ جن کی متانت علم و عمل ہر قابلِ تحسین چیز سے فانی تھی۔ لیکن جو اپنی سستی کا ثبوت دینے کے لئے ہر قسم کی شہارت اور فتنہ پردازی پر ہمہ اوقات تیار رہتے تھے۔

اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ۸ جون کو مسلم لیگ کونسل اور پارلیمنٹری بورڈ کے

اجلاس کس جگہ ہوں گے۔ لاہور میں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس لئے خیال تھا

کہ اگر اسلامیہ کالج کے جیٹیم ہال میں یہ اجلاس منعقد ہو جائیں۔ تو کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ بجلی کے پکے پتیا ہو جائیں گے۔ نواب مظفر خاں انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے۔ اس کام کے لئے ان کی اجازت درکار تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب مظفر خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ لیکن انہوں نے جیٹیم ہال دینے سے انکار کر دیا۔ نواب مظفر خاں یونیورسٹی پارٹی کے بہت بڑے رکن تھے۔ اس لئے ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ مسلم لیگ کو جیٹیم ہال استعمال کرنے کی اجازت دیں گے۔

لیکن یہ امر تعیناً موجب حیرت ہے کہ جس انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں کی کامیابی کا دار و مدار ہمیشہ اقبال کی نظم پر رہا ہو۔ آج اسی انجمن کا صدر اقبال کی درخواست کو ٹھکرا کر جیٹیم ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجبوراً برکت علی اسلامیہ ہال میں لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے۔ جہاں مسلم لیگ کا الیکشن مینی نسٹو باضابطہ منظور کیا گیا۔ اور پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی مولانا مظفر علی خاں اور ان کے دونوں ساتھی پارلیمنٹری بورڈ سے مستعدی ہو گئے استغنیٰ کی وجہ مولانا نے یہ بیان کی کہ اتحادِ ملت چونکہ مکمل آزادی کی حامل ہے اور مسلم لیگ کا نصب العین درجہ تو آبادیات ہے۔ اس لئے ان دونوں جماعتوں میں اشتراک و تعاون نہیں ہو سکتا۔ مولانا کو یہ عذر محض عذر لنگ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر پھانسی ہوئے تھے اور چونکہ انہوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعوے بھی دائر کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ اتحادِ ملت

کا علیحدہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے شہید گنج کے نام پر ایکشن رٹانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آگ چل کر من و عن بھی کچھ ہوا۔ اور ڈاکٹر عالم نے نہایت ہوشیاری سے اتحاد ملت۔ زمیندار مولانا ظفر علی خاں اور شہید گنج کو سراسر اپنی ایکشن کے لئے استعمال کیا۔

جب پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو سر فضل حسین نے

ہرمئی کو ایک خط میں سر سکندر کو لکھا :

"جناب نے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ جناب نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے میں کوئی دقیقہ نہیں رکھا۔ لیکن جن اخبارات نے اس کا سراپا لگناڑہ کیا ہے۔ وہی اس خبر کے بھی ذمہ دار ہیں۔ کہ جناب کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نے اُس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ اتحاد ملت نے بھی انکار کر دیا۔ باقی رہ گئے احمدیہ۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں۔ اُن کا رویہ ہمارے متعلق کیسا ہے۔ ہے گا۔ البتہ اقبال شجاع تاج الدین۔ برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اس بورڈ سے کچھ مرٹے کی آرزو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں"۔

میاں فضل حسین نے اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ اور برکت علی کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک یہ "چند متفرق شہری باشندے" اقبالیوں

کی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں پنجاب کی یاسیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ تعجب ہے کہ وہ شخص جس نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک اپنی لیڈری کی عمارت انہی "چند متفرق شہری باشندوں" کے کندھوں پر سوار ہو کر استوار کی تھی۔ وہ شخص جس کو سیاسی جدوجہد کے اس پُرخطر زمانے میں ارشاد پور کے ٹوٹے اور ٹون۔ اٹکے کھڑے اور ملک۔ جہلم کے راجے اور چودھری حکومت کا مستوب سمجھ کر اپنے قریب بیٹھنے کی جی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آج خود حکومت کے قسری ذبیحہ ایشان میں داخل ہو کر اپنے انہی پرانے رفیقوں کا ذکر اس حقارت سے کرتا ہے۔ گویا اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ برکت علی اس قابل بھی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکیں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے

کئی تلک تیرا بھی دل ہر روز فنا کا باب تھا

جون کے آخر میں میاں فضل حسین ایک خط میں آغا خاں کو لکھتے ہیں :

"... جناح کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور ہونا

بھی یہی چاہیے تھا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے اس لیے شامل

ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ اس بورڈ سے مسلمانوں کی اکثریت کے

عمیوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اب مولانا ظفر علی

خاں اور اتحادِ ملت کے فیصلے نے تو گویا اس بورڈ کی کمرہ توڑی

ہے۔ صورتِ احوال باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایچ آر لیگ

میں شامل ہو کر اپنی جداگانہ ہستی کو معدوم کر ڈالیں گے؟ غالباً

نہیں! بہر حال جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ  
کا وجود باقی نہیں رہا۔

میاں فضل حسین اگرچہ سرسکندر کو خط لکھ لکھ کر یونیورسٹی پارٹی کی کامیابی  
اور جہاں کی ناکامی کا فرد سنا ہے تھے۔ لیکن سرسکندر بدستور اپنی دورانی چالوں  
پہن مصروف تھے۔ وہ ۲۰۵۰ رجمن کو عبوری سے لاہور پہنچے۔ اور ایک طرف سے راجہ نرنند  
ناٹھ سے ملے۔ اور دوسری طرف علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔  
راجہ نرنند ناٹھ سے ان کی جو گفتگو ہوئی اس کی اطلاع کسی طرح سول ملٹری  
گرنٹس کے نامہ نگار کو بھی مل گئی۔ اور ۲۲ کو سول میں چھپ گیا کہ سرسکندر اور راجہ  
نرنند ناٹھ کے درمیان اس امر کے متعلق تبادلہ خیال ہوا ہے۔ کہ سر فضل حسین  
کی فرقہ وارانہ پالیسی کو ختم کر کے پنجاب کی سیاسی جماعتوں میں کیونکر اتحاد  
قائم ہونا چاہیے۔ میاں فضل حسین اس وقت ڈھوڑی میں تھے۔ انہوں نے  
فوراً وہاں سے چوہدری شہزاد الدین کو لکھا:

..... لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ مسکندر۔ احمد یار اور  
نرنند ناٹھ کے درمیان پتھر پتھر وشنہ پیدا اور مشورے ہو رہے ہیں۔ میں  
حیران ہوں کہ جو احسان نے احمد یار اور مسکندر پر کئے ہیں۔ کیا  
یہ لوگ ان احسانات کے مستحق تھے؟ اور پھر جس جس طرح میں ان  
دردنوں کی مدد کرتا رہا ہوں۔ کیا اس سے پنجاب یا مسلمانان پنجاب

ملے سجانے فریضہ

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

یا ہارٹی پارٹی کو کچھ بھی فائدہ پہنچ سکا ہے؟ میں یہ باتیں آپ سے  
پوچھتا ہوں۔ کیونکہ ان دونوں کے متعلق میں نے جو کچھ کیا۔ آپ  
ہی کی سفارش پر کیا گیا۔

۱۵ جون کو علامہ اقبال اپنے ایک خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں:  
”..... دو ایک روز ہوئے سر سکندر لاہور سے رخصت ہو گئے ہیں  
میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی پہنچ کر آپ سے ملیں گے۔ اور جنرل مور  
کے متعلق گفتگو کریں گے..... اس گفتگو کے نتیجے سے مجھے شہرہ  
مطلوع فرمائیے گا۔ اگر آپ ان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے  
تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آئیں گے“۔

میری ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب کو سر سکندر کے متعلق محض خوش فہمی  
تھی۔ سر سکندر نے مسلم لیگ میں شامل ہونے پر تیار تھے۔ نہ وہ راجہ نرنند ناتھ سے  
مل کر علیحدہ پارٹی بنانے پر آمادہ تھے۔ نہ صرف سو اکارغے دیکھ رہے تھے بلکہ یوں کہنا  
صحیح ہو گا کہ وہ میاں فضل حسین کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ علامہ اقبال  
اپنے اسی ۱۵ جون کے مکتوب میں مسٹر جناح کو یہ بھی لکھتے ہیں

”..... دونوں کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی  
کے مسلمان ممبر اس قسم کا ایک اعلان کرنے پر تیار ہیں۔ کہ مسلمانوں  
سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا مسائل میں یونینسٹ پارٹی کے مسلمان

۱۵ جون ۱۹۴۷ء - علامہ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد انور)

ممبر مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے۔ اور ان مسائل کے متعلق وہ  
 صوبائی اسمبلی کے کسی غیر مسلم فریق کے ساتھ علیحدہ سمجھوتہ نہیں کریں گے  
 بشرطیکہ پنجاب مسلم لیگ بھی اس امر کا ایک اعلان کر دے۔ کہ جو لوگ  
 مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر پنجاب اسمبلی میں داخل ہونگے  
 وہ صرف اُس پارٹی کے ساتھ تعاون کریں گے۔ جس میں سب سے  
 زیادہ مسلمان شریک ہوں۔ ازراہِ کرم اس تجویز کے متعلق اپنی رائے  
 سے مجھے فوراً مطلع فرمائیے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ احمدیار خاں دولتاناہ ۲۴ جون کو ڈاکٹر صاحب سے  
 اُن کے دوست کدے پر جا کر ملے۔ اور ۲۴ جون ہی کو ڈولہوڑی سے میاں فضل حسین  
 نے چودھری شہاب الدین کو وہ حکم و عفتہ سے بھرا ہوا خط لکھا جس میں انہوں  
 نے احمدیار خاں دولتاناہ اور سر سکندر کو احسان فراموش۔ سازشی اور الطاف  
 اکرم کا نا اہل قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں دولتاناہ کی یہ تجویز میاں فضل  
 حسین کی تجویز تو ہو نہیں سکتی۔ پھر لطف یہ ہے کہ ۲۰ جون کو سر سکندر لاہور آئے  
 اور ۲۳ یا ۲۴ کو واپس بمبئی تشریف لے گئے۔ ان چار یا پانچ دنوں میں  
 احمدیار خاں دولتاناہ برابر اُن کے ساتھ رہے۔ اور انہیں ڈولہوڑی جانے اور  
 میاں فضل حسین سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خود میاں فضل حسین ۱۹  
 جون کو ڈولہوڑی سے واپس لاہور پہنچے۔ پھر یہ کیونکر یاد رکھا گیا۔ کہتا ہے کہ  
 یہ تجویز میاں فضل حسین نے احمدیار خاں دولتاناہ کے توسط سے ڈاکٹر صاحب  
 کے پاس بھیجی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ لاہور پور پختہ



قبل میاں فضل حسین نے آغا خاں کو وہ خط لکھا تھا جس کا اقتباس وپریڈس کیا جا چکا ہے اور جس میں انہوں نے بڑے اطمینان سے آغا خاں کو یہ خبر سنائی تھی کہ "جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا وجود باقی نہیں رہتا"۔ اس جماعت کا وجود ہی میاں فضل حسین کے نزدیک باقی نہیں رہا۔ اس جماعت کے ساتھ مفاہمت کرنے پر وہ کیوں کر آمادہ ہو سکتے تھے۔ میری ناچیز رائے ہے کہ یہ تجویز دو تمانہ اور سکندر کے باہمی مشورے کا نتیجہ تھی فضل حسین اس سے بالکل بے خبر تھے، دو تمانہ اور سکندر غالباً چاہتے تھے کہ اقبال کے بیان سے فضل حسین کو پریشان کیا جائے۔ اور جب فضل حسین اس تجویز کی مخالفت کریں۔ تو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو یہ کہہ کر ان سے ہلکا دہر گشتہ کیا جائے۔ کہ یہ شخص (فضل حسین) مسلمانوں میں اتحاد نہیں

مہنے دیتا۔

یونینسٹ پارٹی کے اندر اس قسم کی خفیہ سازشیں اور باہمی رقابتیں جاری تھیں۔ کہ ۹ جولائی کو میاں فضل حسین کالامور میں انتقال ہو گیا اور آج بھر میں پنجاب کی سیاسی فضا یکسر بیل گئی۔ سر سکندر کو ان کے دوستوں نے اسی وقت، نون سپا اطلاع دے دی کہ اسی میدان ہوا ہے۔ فوراً کالامور پہنچو۔ میاں فضل حسین مسلسل سولہ سال پنجاب کی سیاست پر حاوی تھے۔ اولے پانچ سال انہوں نے پورے ہندوستان کی سیاست کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق چلایا۔ ان کے بڑے بڑے حریف بھی ان کی چال کے سامنے مات کھا جاتے تھے۔ ان کے جسم کو اگر یہ مختلف امراض نے عدو درجہ نجف و نزار بنا رکھا

لیکن اس کے باوجود ان کے ذہن و فکر کی جلالت ایک لمحہ کے لئے بھی گت نہ  
 ہوئی۔ ہاتھ کا گاندھی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے ییدی فضل حسین کو لکھا  
 ”سیائیات سے قطع نظر میرے دل میں تو ان خوشگوار ملاقاتوں کی مسرت بخش  
 یاد باقی ہے۔ جو مجھے آپ کے نامور شوہر کے ساتھ بیٹھرائی تھیں۔“

سروجنی نینڈو نے لکھا۔ ”جن لوگوں کو فضل حسین سے ملنے کا اتفاق ہوتا  
 تھا۔ وہ ان کی تیز و طرار ذہانت اور مغلوب کن بصیرت سے مختلف تاثرات  
 لے کر واپس آتے تھے۔ مثلاً خوف۔ مدح و ستائش۔ ناپسندیدگی۔ بے اعتمادی  
 خلوص و محبت۔ لیکن ان مختلف و متضاد تاثرات کے باوجود ایک چیز  
 یقینی تھی۔ اور وہ یہ کہ جو شخص بھی فضل حسین سے ملا تھا۔ وہ انکی زبردست  
 شخصیت اور قوت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔“

علامہ اقبال۔ ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز نے ایک مشترکہ  
 بیان میں اظہارِ انوس کرتے ہوئے فرمایا :

”سرفضل کی وفاتِ حسرت آیات سے ہا را صوبہ ایک تیتی محب وطن  
 کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ پنجاب کی پبلک زندگی سے ان کا  
 تعلق بہت گہرا ہے۔ اور اس تمام عرصے میں ہر مرحلے پر فتح و کامرانی  
 نے ان کے قدم چومے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے مدد  
 سر کئے۔ لیکن یہ امر بے حد المناک ہے۔ کہ عین جوں وقت وہ اہل  
 جدیدہ کے تحت اپنا مستقبل مرتب کرنے کی تجویزیں سوتے رہے  
 تھے۔ موت نے ان کا رشتہ حیات منقطع کر دیا۔ ہم اس سانحہ عظیم

میں اپنے ولی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہم سے ایسا عظیم الشان  
 لیڈر پیدا ہو گیا ہے جس کو قدرت نے سیاسیات کا صحیح شعور عطا کیا  
 تھا۔ اور جو پارلیمنٹری قابلیت کے علاوہ تدریجی و معاملہ فہمی اور تعمیری  
 کام کرنے کی سناہیتوں کا بھی مالک تھا۔

طہ سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور - مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء

# ۱۹۳۷ء کا انتخاب

سر سکندر ۲۲ جولائی کو چند روز کے لئے لاسپور تشریف لائے۔ اور یونینسٹ پارٹی کے ایک رسمی جلسے میں ان کو پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اسی رسمی جلسے میں سر سکندر نے اعلان کیا کہ وہ حتی الامکان بہت جلد بنک کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاسپور آئے۔ اور مستقل طور پر پارٹی کی زمام قیادت سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔ اب چونکہ یونینسٹ پارٹی کے اندر وہ باہمی پیشکش ختم ہو چکی تھی۔ جو مدت سے سر سکندر اور فضل حسین کے درمیان چلی آ رہی تھی اس لئے سر سکندر کو مسلم لیگ سے ربط و ضبط بڑھانے، یا میان فضل حسین کے حریفوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

میاں فضل حسین کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی کے ایک نہایت وقیح اور بلند پایہ رکن، ملک زمان ہمدانی نے اس پارٹی سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے۔ زمان ہمدانی علی گڑھ کے دورِ اول کے بہترین تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور طالب علمی کے زمانے

میں محمد علی بشوکت علی۔ حسرت موہانی وغیرہ کے ہم عصر رہ چکے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ پنجاب میں اکسٹراسٹنٹ کمنڈر ہو گئے تھے۔ اور سن ۱۹۳۲ء میں ڈپٹی کمنڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ پنشن کے بعد وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو گئے تھے۔ میاں فضل حسین سے ان کے تعلقات سن ۱۹۲۰ء سے چلے آ رہے تھے۔ جب میاں صاحب سیالکوٹ میں پریکٹس کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے اور زمان مہدی وہاں بہ سلسلہ ملازمت تعینات تھے۔

زمان مہدی نے اپنی پوری ملازمت کے دوران ہی فوجی خدمت کے اس جذبہ کا بار بار مظاہرہ کیا۔ جو کسی زمانے میں علیگڑھ کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ جب ڈننگمری اور روہتنگا کے اضلاع میں ڈپٹی کمنڈر تھے۔ تو انہوں نے محض اپنی ذاتی کوشش سے ان دونوں شہروں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عظیم الشان اجلاس منعقد کرائے۔ اور ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مسلمان لیڈروں کو مدعو کیا۔ دننگمری میں تنہا ان کی کوشش سے نادار اور کم استطاعت مسلمان طلبہ کی مدد کے لئے ایک بہت بڑا ٹرسٹ قائم کیا گیا جس سے ہزاروں نوجوان فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ سن ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے موقع پر انہوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود اترکوں کے لئے چندہ جمع کر کے ہندوستان کی مرکزی انجمن کے پاس روانہ کیا۔

میرے مقرب دوست اور اردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندہری نے جب شاہنامہ اسلام لکھا۔ تو زمان مہدی گوہرنوالہ میں ڈپٹی کمنڈر تھے حفیظ گوہرنوالہ گئے۔ تو زمان مہدی نے شاہنامہ کی فروخت میں اس گرم جوشی

سے جتنہ لیا۔ گویا وہ ڈپٹی کمشنر تھے۔ بلکہ ایک قومی رضا کار تھے۔ انہوں نے شاہنامہ کی ایک ایک جلد پان پان سو روپے میں فروخت کرائی۔ اس کے علاوہ وہ ہر سال انجمن حمایت اسلام کے اجلاس پر بہت بڑی رقم فراہم کر کے انجمن کو بھیجا کرتے تھے۔

زمان مہدی کے لیگ میں شامل ہونے پر ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔ لیکن علامہ اقبال کو خصوصیت سے بہت مسرت ہوئی۔ وہ زمان مہدی کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت چونکہ خراب تھی۔ اور انہیں پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے بورڈ کے ہر جلسے میں شریک ہونے کی زحمت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ زمان مہدی خان کو ان کی جگہ پارلیمنٹری بورڈ کا صدر منتخب کر لیا جائے۔ لیکن بورڈ کے تمام

میرے والد مرحوم: منفقور سرفضل حسین کے بڑے مداح اور معاون تھے چنانچہ میاں صاحب کے انتقال سے چند روز قبل وہ ان کی عیادت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ وہ دن تھے کہ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ خدا آپ کو تندرستی عطا فرمائے اور آپ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جنت برزخ میں سلامت رہیں۔ لیکن چونکہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے ہمیں بتا دیجئے کہ آپ کے بعد ہم کس کو اپنا لیڈر سمجھیں۔ میاں صاحب نے جواب دیا: خدا جس کو چاہے گا لیڈری کے منصب پر کھڑا کر دے گا۔ اس میں میرا کوئی اختیار نہیں۔ والد مرحوم نے پوچھا کہ سرسینڈر کے متعلق کیا رات ہے؟ میاں صاحب نے چپیں جوڑ کر سر منہ آٹا کہا: "ہاں مجھنی آدمی ہے" پھر والد مرحوم نے پوچھا: "اور زمان مہدی؟" اس پر میاں صاحب نے فرمایا: "وہ بہتر آدمی ہے۔"

ممبروں نے اس تجویز سے اختلاف کیا۔ اور عرض کیا کہ اس مرحلہ پر ڈاکٹر صاحب کا پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے مستعفی ہو جانا۔ بورڈ کے وقار کو بہت کم کر دینا البتہ زمان مہدی کو بورڈ کا ڈپٹی پریزیڈنٹ منتخب کر لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان مہدی کی تنظیمی قابلیت پر بڑا اعتماد تھا۔ اس لئے انہوں نے بورڈ کے ممبروں کی تنفقہ عرضداشت کے باوجود یہی فیصلہ کیا کہ اسٹیفن صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ تاکہ زمان مہدی کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔

بارہاں ہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بورڈ کی رکینٹا نریک نہیں کریں گے اور جیسے کسی مہم میں مشورے کی ضرورت پیش آئے گی۔ وہ سرنگھم ہر وقت دیتے گئے تیار ہوں گے۔ آخر کار بورڈ کو اس خواہش کے سامنے مجبوراً سر جی ہکا دینا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا استعفیٰ لکھ کر غلام رسول خاں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ ۳۱ اگست کو بورڈ کے اجلاس میں پیش کر دیا جائے۔

جب غلام رسول خاں نے ۳۱ اگست کے جلسے کا ایجنڈا اجاڑی کیا۔ تو اس میں ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ استعفیٰ کی شق بھی تھی۔ یہ خبر اڑتی اڑتی یونیسٹ پارٹی کے صدر دفتر ہیرڈن ولیمز بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ وہاں فوراً مسرت و کامرانی کے شادیاں لگے۔ کہ لو اقبال نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اب مسلم لیگ کا ڈھونگ بھی ختم سمجھو۔ سید نور احمد اس زمانے میں سول بلٹری گزٹ کے ناہ نگار تھے اور ان کا قلم یونیسٹ پارٹی کی حمایت کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ انہوں نے جونہی یہ خبر سنی۔ فوراً ایک جلی عنوان چپکا کر

سول میں مضمون لکھ دیا۔ کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے حالات ناکفہ بہ ہو چکے ہیں۔ اندرونی خلفشار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ باہمی رقابتیں زوروں پر ہیں۔ کام کرنے کے لئے آدمی نہیں ملتے۔ روپے کی سخت کمی ہے۔ آخر کار اس صورتِ حال سے تنگ آ کر غلام اقبال نے بورڈ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

سول کا یہ پرچہ ڈاکٹر صاحب کے ملاخطہ سے گذرا۔ تو انھیں سخت غصہ آیا۔ کہ ہمارے حریف کیسے ادب سے وار کرنے اور ہمیں کس کس طریقے سے بدنام کرنے پر آمادہ رکھائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے فوراً غلام رسول خاں کو بلا کر زبانی حکم دیا۔ کہ ان کا استعفیٰ ۳ اگست کے اجلاس میں پیش نہ کیا جائے۔ پھر اس مضمون کی ایک باضابطہ تحریری اطلاع بھی سکریٹری کو بھیج دی۔ کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب کے ساتھ نمایاں اور سربراہانہ اصحاب کی ایک فہرست تیار کر کے غلام رسول خاں کے حوالے کی۔ اور فرمایا کہ خود ان کی طرف سے بورڈ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ ان سائمنڈ میونسپلٹی کو بورڈ میں شامل کر لیا جائے۔

۳ اگست کو برکت علی اسلامیہ ہال میں بورڈ کا اجلاس ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب نامہ نازی مزاج کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ اس لئے ملک برکت علی نے صدارت فرمائی۔ جلسے میں چالیس آدمی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا استعفیٰ پیش نہ ہوا۔ اور ملک زمان مہدی خاں کو بورڈ کا ڈپٹی چیرمین منتخب کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ نشر و اشاعت اور پبلیکیشن کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جن کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا کہ اس حلف نامے کا مسودہ



تیار کرے جس پر اسمبلی کے مسلم لیگی اُمیدواروں کو اپنے دستخط ثبت کرنا ہونگے۔  
 ابتداء میں اس سب کمیٹی کے پانچ ممبر تھے۔ یعنی علامہ اقبال۔ ملک زمان دہلوی  
 غلام رسول خاں۔ چودھری افضل حق اور مولوی منظر علی انور۔ لیکن چند روز  
 بعد چار نئے آدمیوں کا اضافہ کیا گیا۔ جن میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔  
 میاں عبدالمجید۔ ملک پرکت علی اور عاشق حسین بٹالوی شامل تھے۔

۳۱ ستمبر کو سر سکندر حیات خاں ریزرو بینک سے مستعفی ہو کر واپس لاہور

پہنچ گئے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ عام آدمیوں کی طرح بے کار رہتے۔ اس لئے منصوبہ  
 یہ تیار کیا گیا کہ نواب مظفر خاں بیماری کا عذر پیش کر کے چار مہینے کی رخصت  
 پر چلے جائیں۔ اور ان کی جگہ سر سکندر کو ریونیو ممبر بنا دیا جائے۔ اس  
 منصوبے کی تیاری میں سب سے بڑا ہاتھ خود پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن  
 کا تھا۔ نواب مظفر خاں بالکل تندرست و توانا۔ اور اچھے بھلے تھے۔ یہ خود  
 ساختہ بیماری صرف اس لئے ظہور میں آئی۔ کہ گورنر کو اندیشہ تھا۔ کہ جب تک  
 سر سکندر حیات خود حکومت کے اعلیٰ منصب پر بیٹھ کر الیکشن کی جنگ نہیں  
 لڑیں گے۔ یونینسٹ پارٹی کی سونپسید کامیابی محال تھی۔ اب ایک طرف  
 تو سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور دوسری طرف گورنر کے بعد  
 پنجاب کے سب سے بڑے حاکم بھی وہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس  
 دوگانہ حیثیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جس جس حلقے میں یونینسٹ اُمیدوار کا  
 پلڑا کمزور نظر آتا تھا۔ وہاں سر سکندر نے اپنے سرکاری عہدے کا پورا وزن  
 ڈال کر اس پلڑے کو برابر کر دیا۔ آگے چل کر یہ بات واضح کر دی جائے گی۔ کہ

اس سازش میں گورنر۔ سر سکندر اور پنجاب کے تمام بڑے بڑے سرکاری اہل کار  
شریک تھے۔ اور ان لوگوں نے تحریص و ترغیب اور تہدید و تحویف کے تمام حربوں  
سے مسلح ہو کر۔ ہر اس شخص کا سر کھینچنے کی کوشش کی۔ جس نے یونیسٹ امیدوار  
کی مخالفت کی تھی۔

احرار یوں تو مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن  
کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ انہوں نے اس بورڈ سے جو توقعات قائم کر رکھی تھیں  
وہ نظام رپوری نہیں ہو سیں۔ انہیں سب سے بڑی غلہ انہی یہ تھی کہ جناح نے  
بمبئی کے تاجروں اور اُدھ کے تعلقہ داروں سے کئی لاکھ روپے جمع کئے ہیں  
جو آئندہ الیکشن میں لیگی امیدواروں کے کام آئیں گے۔ اس معاملے میں  
مبتلا ہو کر چودھری افضل حق اور مولانا عبید الرحمن وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے  
تھے۔ کہ اس فنڈ سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ پنجاب کے حصے میں ضرور آئے گا  
اور یہ ایک لاکھ روپے کی رقم جلسے، جلسوں کے علاوہ اخباری پراپاگنڈے پر  
خسرج ہوگی۔

احرار کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک برکت علی، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین  
وغیرہ مہروف آدمی ہیں۔ انہیں ہائی کورٹ کی پریکٹس سے فرصت ہی کہ  
ہے۔ کہ وہ پنجاب کا دورہ کریں۔ اور شہر بہ شہر دُصوم و دُھماڑی پتوں پر جا کر  
دُھواں دُھار تقریروں کا جادو بکھیریں۔ اور ہر جگہ اس فن میں یرِطو لے  
رکھتے تھے۔ اور سالہا سال سے اُن کی زندگیاں انہی ہنگاموں کے لئے وقف  
ہو چکی تھیں۔ اس لئے اُن کا اندازہ تھا کہ جن کے فن میں سے پنجاب کو جو

ایک لاکھ روپیے کا۔ اُس کا بیشتر حصہ اُنہی کی مرضی اور صوابدیت سے خرچ ہو گا۔

عجیب بات ہے کہ سر فضل حسین ایسا سمجھ دار آدمی بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ کہ جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے جمع کر لئے ہیں چنانچہ جب اُنہوں نے آغا خاں سے یونیسٹ پارٹی کے لئے مالی امداد طلب کی۔ تو اپنے خط میں یہ بھی لکھا:

..... ”جناح کتنا پھرتا ہے۔ کہ اُس نے بمبئی کے کرڈرپتی تاجروں

اور راجہ محمود آباد سے اس بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے حاصل کر لئے ہیں

جناح کی ان باتوں نے ہماری مشکلات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا

ہے۔ ہمارے یہاں کے اخباروں، بالخصوص اُردو اخباروں کی مالی

حالت چونکہ ہمیشہ محذوث رہتی ہے۔ اس لئے وہ آنے والے

الیکشن سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے ابھی سے منہ کھولے

بیٹھے ہیں..... ان غیر معمولی حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ

میں آپ سے اعانت کی درخواست کر دوں۔“

تعب ہے کہ سر فضل حسین نے یہ بات کہاں سے سنی تھی۔ کہ بمبئی کے کرڈرپتی

سٹیٹوں اور راجہ محمود آباد نے جناح کو لاکھوں روپے عطا کئے ہیں۔ راتم التحریر کو

اچھی طرح یاد ہے کہ سر جناح نے اپنی کسی تقریر یا اپنے کسی بیان میں اشارہ

بھی یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے پاس لاکھوں کا سرمایہ موجود ہے۔ لاکھوں کا کیا ذکر ان کے پاس تو چند ہزار کی رقم بھی نہ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو اپنی اپنی الیکشن کے مہمان خود برداشت کرنا ہوں گے۔

بہر حال جب احرار کو پتہ چلا کہ پارلیمنٹری بورڈ کے پاس کوئی رقم نہیں ہے تو انہوں نے سوچا کہ اپنے اپنے الیکشن پر اپنی ہی جیب سے خرچ کرنا پڑا تو پھر وہ آئندہ انتخابات میں جناح کاتوشل کیوں اختیار کریں کیا احرار اتنے گئے گذرے ہیں۔ اور کیا پنجاب میں ان کی اتنی ساکھ بھی باقی نہیں کہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ کے بغیر الیکشن کی جنگ بھی نہ جیت سکیں گے؟ (ان خیالات سے متاثر

ہو کر چومرہی افضل حق، مولوی منظر علی اظہر اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں زود باجریہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کس مسئلہ کو مابہ التمزاع قرار دے کر ہم سے علیحدگی اختیار کریں گے۔

جب اسمبلی میں جانے والے مسلم لیگی امیدواروں کا حلف نامہ تیار کر کے کے لئے مقررہ سب کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ تو غلام رسول خاں نے حسب ذیل مسودہ منظوری کے لئے پیش کیا :

”خدمت آنریری سکریٹری صاحب !

پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ۔ لاہور۔

(۱) میں اپنے آپ کو آئندہ اسمبلی کے انتخاب کے لئے حلقہ ... سے

بلور امیدوار پیش کرتا ہوں۔

(ب) میں مبلغ چھاس روپے (صورتِ خواتین امیدوار چھاس روپے) بذریعہ

منی آرڈر یا چیک یا نقد اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

(ج) میں اقرار صراح کرتا ہوں کہ میں پنجاب پروانٹشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

کے فیصلے کا اپنی نامزدگی کے متعلق پابند رہوں گا۔

(د) میں علناً اقرار کرتا ہوں کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے

پروگرام کو منظور کرتا ہوں۔ اور ہر ممکن طریقے سے اس پروگرام کو کامیاب

بنانے کی کوشش کروں گا۔

(ه) میں اقرار صراح کرتا ہوں کہ اگر پنجاب پروانٹشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

نے مجھے آئندہ اسمبلی کے لئے اپنا امیدوار نامزد کیا۔ تو میں کسی اور پارٹی

کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر اسمبلی کے انتخاب کا خواہاں نہیں ہوں گا۔

(و) میں اقرار صراح کرتا ہوں کہ میں اپنی حیثیت میں اسلامی اوقاف کی حفاظت

حسب مشائے شریعت کروں گا۔

(ز) میں اقرار صراح کرتا ہوں کہ میں ہر ممکن طریقے سے مسجد شہید گنج کی

واگذاری کے لئے کوشاں ہوں گا۔ اور اس مقدس اور قدیم مسجد کی مسامحی۔

اور اسے غیر اسلامی طور پر استعمال کرنے کی بوند موم اور قبح حرکت کی گئی ہے

اس کے تدارک کی پوری کوشش کروں گا۔“

سب کمیٹی کے احرار ممبروں کو مذکورہ بالا مسودہ کی شق (ه) منظور نہیں تھی

لیکن اس شق کی معقولیت اس قدر نمایاں اور بدیہی تھی کہ انہیں اختلاف کی

جرات نہ ہو سکی۔ تاہم جب غلام رسول نماں نے مسجد شہید گنج کے بارے میں شوق  
 (رز) پڑھی تو مولانا حبیب الرحمن چکسا کر بولے: "یہ شوق احرار کو پریشان کرنے کے  
 لئے رکھی گئی ہے۔"

اُن دنوں احرار کی یہ حالت تھی کہ وہ مسجد شہید گنج کے نام سے بدکتے تھے۔  
 اور عام مسلمانوں میں اُن کی ہوا بکڑ جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ جب جولائی ۱۹۳۵ء  
 میں یہ مسجد مسما کی گئی۔ تو اہلکار نے کسی قسم کا قدم اٹھانے کی بجائے۔ سکوت  
 مصلحت آمیز اختیار کر لیا تھا۔ گذشتہ ایک سال سے پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے  
 بڑا ہنگامی مسئلہ یہی تھا کہ شہید گنج کو کیونکر واکڈا کر لیا جائے۔ اسی ضمن کے لئے  
 سول تاجر مانی شردے کی گئی۔ اور تحریک کے بڑے بڑے کارکن جیلوں میں چلے گئے  
 اسی غرض کے لئے مسٹر جناح کو لاہور آکر حکومت سے عارضی طور پر مصالحت کرانا  
 پڑی۔ اور اسی ضمن کے لئے عدالت میں قانونی چارہ چینی کی گئی۔ یہ کیونکر ممکن  
 تھا کہ مسلم لیگ۔ ایسے اہم مسئلے سے چشم پوشی اختیار کرتی۔ درآن حالیکہ مسلمان  
 اپنی تمام قومی جماعتوں سے توجیہ کہتی تھی۔ کہ جب تک وہ مسجد کی بازیابی کے لئے  
 کوئی حتمی وعدہ نہ کریں گی۔ انھیں الیکشن میں مسلمانوں سے ووٹ لینے کا کوئی  
 حق نہیں ہے۔

غلام رسول نماں نے مولانا حبیب الرحمن کو دیوانہ کی طرح لے کر اپنے گھر کے دروازے  
 میں کہا کہ "میں شہید گنج کی بازیابی پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔  
 اس مسئلے کو ہم کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ کل الیکشن کے موقع پر  
 کسی حال میں مسلمان ہم سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا مسلمان لیگ۔ جاکر ووٹ لگا کر آئے

کی حاجی ہے یا نہیں۔ تو کیا ہم اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیں گے؟  
 مولانا حبیب الرحمن فوراً بولے "بہت اچھا۔ مجھے اس شق پر کوئی اعتراض  
 نہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ شق بھی بڑھا دیجئے کہ مسلم لیگی امیدواروں کو اتنا  
 صلح کرنا چاہیے کہ وہ اسمبلی میں جا کر مرزاٹیوں کو مسلمانوں سے خارج کر کے  
 ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمن نے یہ نئی شق پیش کر کے بہن حیران  
 ہی نہیں بلکہ پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزاٹیت یا غیر مرزاٹیت  
 کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جلسی قومی اور ریاستی  
 سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مرزاٹیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے۔ ایک  
 لایحی بات تھی۔

زماں مہدی خان اُس وقت جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا  
 حبیب الرحمن سے کہا کہ "بے سوہمہ گڑا کہجئے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا  
 موقع محل ہے؟"

مولانا نے چمک کر فرمایا: "جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیا بی آج پنجاب کے  
 تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے۔ کہ مرزاٹیوں  
 کو مسلمانوں میں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو  
 میری بات پر یقین نہیں آتا۔ تو چلئے ہم اسی وقت موچی دروازہ کے باغ میں ایک  
 جلسہ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کر لیتے ہیں۔"

مولانا کی رائے درست تھی۔ احرار نے سالہا سال کے پراپاگنڈے سے

مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر رکھی تھی۔ اور اگر اس امر کے متعلق کسی حلیہ عام میں استصواب کیا جاتا۔ تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلفت نامہ میں ایک نئی شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی "میں اقرار معاصح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا۔ تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر درازمیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دینے جانے کے لئے انتہائی کوشش کروں گا"

دوسرے روز غلام رسول خاں حلفت نامے کا مسودہ لے کر غلامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انھیں سارا واقعہ سنایا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے مرزائیت کے متعلق نئی شق بڑھانی جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ کوئی اعتراض کیا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے کے بعد سب کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا۔ جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر پارلیمنٹری بورڈ نے کسی شخص کی درخواست منظور کر کے اسے آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کی اجازت دیدی تو اس امیدوار کا فرض ہوگا کہ وہ پان سو روپے بورڈ کے فنڈ میں جمع کرائے۔ چودہری افضل حق نے اس مسئلے کی مزید وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا کہ "یہ پان سو روپے کس مقصد سے جمع کرائے جائیں گے؟"

غلام رسول خاں نے جواب دیا کہ "بورڈ کو تمام امیدواروں کی الیکشن کے سلسلے میں مختلف قسم کے اشتہارات اور پمپنٹ طبع کرانا ہوں گے۔ پھر ان امیدواروں کی حمایت میں مسلم لیگ کے بیڈروں کو ان کے انتخابی حلقوں میں



دورہ کرنا ہوگا۔ آخر ان کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟

چوہدری افضل حق بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ کہنے لگے: ”واہ حضرت۔

پان سو روپے صرف اشتہارات اور پمفلٹ کے لئے۔ الیکشن کا خرچ الگ۔ میں

تو پان سو میں الیکشن بھی لڑ سکتا ہوں۔ اور شادی بھی کر سکتا ہوں۔“

میں انکار سے چوہدری صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے عرض کیا

”نیکی اور پوچھ پوچھ، خدا کے لئے دونوں کام کیجئے۔“

احرار اس پان سو کی شرط پر بگڑ گئے۔ اور چند روز کے بعد انہوں نے

پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ یوں مسلم لیگ اور احرار کا عارضی اتحاد ہمیشہ

کے لئے ختم ہو گیا۔

مسلم لیگ کی تحریک بڑھا شروع ہوئی۔ تو اور نوگن نے بھی اس طرف توجہ

کی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پارلیمنٹری بورڈ کی رکنیت کا حلقہ وسیع ہونے لگا۔ نئے آنے

والوں میں سردار مظفر علی خاں تڑبانش بیسٹر۔ محمد عظیم خاں ایڈووکیٹ۔ شیخ

محمد جان سوداگر انارکلی، حافظ فیروز الدین سوداگر برانڈ۔ تھورڈ۔ شیخ محمد حسن

ریٹائرڈ سینیئر سب جج اور سید تصدق حسین بھیردی وغیرہ قابل ذکر تھے۔ اب

تک پارلیمنٹری بورڈ کا کوئی مستقل دفتر نہیں تھا۔ غلام رسول خاں ٹپیل

روڈ پر سٹا بھنگے میں رہتے تھے۔ وہیں اکثر لکھنے پڑھنے کا کام کیا جاتا تھا

لیکن چونکہ الیکشن روز بروز قریب آ رہے تھے۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ الگ

دفتر قائم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایڈورڈز روڈ پر چند کمروں کا ایک محقر سا

مکان کرایہ پر لیا گیا۔ اور محمد عظیم خاں کو اس دفتر کا انچارج مقرر کیا گیا

محمد عظیم خاں میرے بڑے پرانے اور عزیز دوست تھے۔ وہ لاہور میں نکالت کرتے تھے اور میونسپل کمشنر بھی تھے۔ ان کے دادا خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں اپنے زمانے میں لاہور کے سب سے معزز انیک نام اور سربراہ آدوہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ افسوس کہ عظیم عین جوانی میں انتقال کر گئے۔

یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ محمد عظیم خاں کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی باری باری سے دفتر میں کام کیا کریں گے۔ غلام رسول خاں۔ ملک زمان ہمدی خلیفہ شجاع الدین ملک برکت علی۔ سردار منظر علی خاں قزلباش اور عاشق حسین بٹالوی۔ اسکے علاوہ ایک فٹنٹس کمیٹی بھی تشکیل مکی گئی۔ جس میں اصحاب ذیل شریک تھے۔ منظر علی خاں قزلباش۔ میاں عبدالمتان۔ سید محمد علی جعفری۔ شیخ جان محمد۔ شیخ محمد حسن۔ حافظ فیروز الدین۔ ملک نور الہی۔ ملک زمان ہمدی میاں عبدالمجید اور غلام رسول خاں۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا مینی فیسٹو مرتب کرنے۔ اور اس کی موہجے بھر میں نشر و اشاعت کرنے کے لئے سبھی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں یہ لوگ شامل تھے۔ سید تصدق حسین بھیردی۔ خلیفہ شجاع الدین منظر علی خاں قزلباش۔ شیخ محمد حسن۔ محمد عظیم خاں۔ عاشق حسین بٹالوی۔ ملک برکت علی۔ ملک زمان ہمدی اور غلام رسول خاں۔

ایک کمیٹی پر اپا گنڈے کے لئے۔ اور ایک کمیٹی اس غرض کے لئے بنائی گئی کہ پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کر کے۔ عوام کو پارلیمنٹری بورڈ کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرے۔ ان کمیٹیوں میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ کچھ اور لوگ

بھی شامل ہوئے۔ مثلاً میاں محمد شفیع سکریٹری انٹر کالجیٹ مسلم برادرز۔ مولانا عبدالحق خان۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ پیر تاج الدین وغیرہ۔

ظاہر ہے علامہ اقبال کسی کمیٹی میں بھی شامل نہیں تھے۔ اور ان کی صحت کے پیش نظر یہی مناسب خیال کیا گیا تھا۔ کہ انہیں اس ضمن میں حتی الوسع زحمت نہ دی جائے۔ لیکن ہر کمیٹی کے کام کی رُو داد سے ان کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ غلام رسول خاں، ہر دوسرے روز، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملہ کی اطلاع کرتے تھے۔

علامہ اقبال اپنے ۹ جون ۱۹۲۶ء کے خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں۔

”..... مجھے اُمید ہے کہ جو اعلان بورڈ شائع کرے گا۔ اس میں پوری حکیم کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح بحث کی جائے گی۔ اور اس سلسلہ میں مخالفوں کی طرف سے جو اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ ان کا بھی ثانی جواب موجود ہوگا۔ بورڈ کو چاہیے کہ اپنے اس بیان میں اس امر کی وضاحت بھی کرے۔ کہ آج ایک طرف حکومت ہے اور دوسری طرف ہندو۔ اور ان دونوں کے درمیان خود مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے۔ بورڈ کا فرض ہے۔ کہ اس بیان کے ذریعہ سے مسلمانوں کو تشنبہ کر دیا جائے۔ کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کی موجودہ سکیم کو منظور نہ کیا۔ تو گزشتہ پندرہ سال میں ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ تمام تر ضائع کر بیٹھیں گے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر دیں گے۔“

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ اگر آپ یہ بیان اخبارات  
کو دینے سے پہلے مجھے دکھا دیں۔" لہ

ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا خط مسٹر جناح کو دستی بھیجا تھا۔ مسٹر جناح اس  
وقت پارلیمنٹری بورڈ کے اڈمنسٹریٹو اجلاس کے لئے لاہور ٹیٹراپٹ لائے ہوئے تھے  
اور ہوٹل میں مقیم تھے۔ جس بیان کی اہمیت کا ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں بار  
بار ذکر کیا ہے۔ اور جسے وہ اخبارات میں چھپنے سے پہلے ذیورڈیکٹوریٹ سمجھتے تھے۔ وہ  
آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا مینیسٹرو تھا۔ اسی مینیسٹرو  
مسلم لیگ نے اپنی آئندہ پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ یہی مینیسٹرو آئندہ مسلم لیگ  
کی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بننے والا تھا۔ اور اسی مینیسٹرو سے اپنے اور بیگانے  
مسلم لیگ کے سیاسی موقف سے آگاہ ہونے کا حق رکھتے تھے۔

یہ پورا مینیسٹرو اس کتاب کے ضمیمہ میں درج کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں تنا  
عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک سندھوستان کی آزادی، سندھو  
مسلم اتحاد، بدیشی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد، اور اقتصاد  
بد حالی کو رفع کرنے کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ کا مینیسٹرو کانگریس کے  
مینیسٹرو سے رتی برابر بھی کم نہیں تھا۔ مسلم لیگ نے اس خود غرض، زہرت  
پندا اور حکومت کے ہمارے یس گروہ کی بھی خدمت کی تھی۔ جو سن ۱۹۲۰ء سے  
صوبائی حکومتوں پر قابض چلا آ رہا تھا۔ اور جس نے اپنی بھائی کیلئے رائے عامہ

کے آثار کے خطوط جناح کے نام ارسال کیے تھے۔

پراعتماد کرنے کی بجائے ہمیشہ سرکاری بلاک پر انحصار کیا تھا۔ لیگ نے یہ کہہ کر کہ :

”.... مانٹیکو چیفورڈ اصل حالات کے نفاذ کے بعد یہ قومی مطالبہ روز بروز تقویت پکڑنے لگا۔ کہ سندھوستان میں حیدرآباد مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو جانی چاہیے۔ مسلمان اس مطالبہ میں باقی اقوام کے ہم نوا تھے۔ اور آزادی وطن کی جدوجہد میں وہ کسی طرح بھی سندھوں سے پیچھے نہ تھے.... لیگ اب بھی اس مطالبے پر قائم ہے کہ موجودہ صوبائی اور مجوزہ مرکزی آئین کو فوراً بدل کر اس کی جگہ جمہوری اور خود اختیاری حکومت مستوار کی جائے۔“

گویا کانگریس کو اپنا دست تعاون سپین کیا تھا۔

لیگ کے اس مینی فسٹو میں جن اہم امور پر خصوصیت سے زور دیا گیا تھا وہ یہ تھے۔

۱:- تمام شدہ آئین قوانین کی ترمیم۔

۲:- عوام کی بنیاد پر آزادی میں نخل انداز ہونے۔ اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کرنے والے قوانین کا انسداد۔

۳:- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات میں تخفیف۔

۴:- سندھوستان کی فوج کو قومی فوج بنانا۔

۵:- سندھوستانی مسرت و حریت کا فروغ۔

۶ :- سندھوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لئے شرح سکھ اور شرح مبادیہ میں ضروری ترمیم۔

۷ :- دیہاتی آبادی کی معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح۔

۸ :- دیہاتی آبادی کے ترصنے میں تجزیہ۔

۹ :- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دینا۔

۱۰ :- ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنا۔

اسی مینی فسٹو کو دیکھ کر پروفیسر کوپ لینڈ نے لکھا تھا کہ :

”... مسلم لیگ کے انتخابی مینی فسٹو، جو مسٹر جناح کی زیر ہدایت

تیار کیا گیا تھا، اور کانگریس کے مینی فسٹو میں کسی ضروری اور اہم

امر کا اختلاف نہیں تھا۔ مجوزہ فیڈرل حکومت کی سخت مذمت کی گئی

تھی۔ اور اگرچہ صوبائی آئین کو بھی قابل اعتراض ٹھہرایا گیا تھا —

با اس سبب یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس آئین سے امکانی حد تک فائدہ

اٹھانا چاہیے۔ لیگ کے مینی فسٹو کا اہم ترین جزو وہ ہے۔ جہاں

میشاق لکھنو کو سندھوستان کی آئینی دستوری تاریخ کا سب سے

درخشاں باب قرار دیا گیا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہوتا ہے

کہ مسٹر جناح مسلم لیگ اور کانگریس کے اسی اتحاد کو دوبارہ زندہ

کرنا چاہتے تھے جو ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تھا۔“

INDIA: A RESTATEMENT By, Sir Reginald -  
Coupland, Page 152

پروفیسر کوپ لینڈ کی یہ رائے بالکل درست ہے۔ مسٹر جناح اس وقت شدت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ صوبائی حکومتوں کو ان رجعت پسند عناصر سے پاک کیا جائے۔ جو گزشتہ سولہ سال سے ان پر قابض چلے آ رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے ترقی پسند عنصر اور کانگریس کے درمیان اتحاد قائم کر کے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خواہش بہر حال شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ سر دوست اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے۔ اس کتاب کے ایک آئندہ باب میں اس موضوع پر مفصل بحث کی جائے گی۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے جو مینی فسٹوشال کیا۔ اس کا پروگرام بھی کم و بیش اسی خطوط پر مرتب کیا گیا تھا۔ جو مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے قائم کئے تھے۔ مثلاً قومی مفاد کے تحت یہ امور درج تھے۔

(۱) ٹیکسوں کے گہراں بوجھ میں کمی (۲) نظام حکومت کے اختراعات میں کمی اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لئے معتدبہ رقوم کا قیام (۳) عوام کی بنیادی آزادی کے مخالف قوانین کا انسداد۔ اور ان قوانین کی تیسخ۔ جو صوبے کی اقتصادی تباہ کاری کا باعث ہیں۔ (۴) تشدد آمیز قوانین کی تیسخ (۵) صوبے کے تمام طبقوں کے درمیان اتحاد، محبت اور باہمی تعاون کے جذبات کو ترقی دینا۔

تنظیم اور ترقی زداعت کے تحت یہ امور درج تھے:

(۱) مقروض کاشتکاروں کے قرض کا بوجھ کم کرنے کے لئے امداد باہمی کے بنکوں کا قیام۔ اور ان بنکوں کو ہندوستان کے ریزرو بنک سے انفکاک رہن

اراضی کی غرض سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے مزید آسانیاں بہم پہنچانا۔ (۲)  
 مالیہ کی موجود شرح میں کمی۔ اور عتیق الامکان مالیہ کی تشخیص پر اپنی اصولوں  
 کا اطلاق کرنا۔ جن کی بنا پر انکم ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے۔ (۳) منڈیوں۔  
 منڈی بورڈوں۔ ڈپوٹوں اور سٹوروں کا قیام (۴) موجودہ پیداوار کو بڑھانے  
 کے لئے ایسے اداروں کا قیام۔ جہاں زراعت کے متعلق تجربات ہوں۔ (۵)  
 ایسے اداروں کا قیام جہاں کاشتکاروں کو پمفلٹوں۔ لکچروں اور ریڈیو کے  
 ذریعہ سے منڈیوں کے حالات۔ اجناس کے نکاس اور زراعت کے جدید طریقوں  
 کے متعلق مذکورہ اطلاعات بہم پہنچائی جاسکیں۔ (۶) پنجاب کی پیداوار کو  
 بیرونی اور غیر ملکی مقابلے سے محفوظ رکھنے کا انتظام۔ اور غیر مالک کے زرعی  
 حالات کے مطابق معلومات بہم پہنچانا۔ (۷) گھوڑوں اور دیگر مویشیوں  
 کی ترقی تسل کا انتظام۔ (۸) مالکوں اور مزارعوں کو دیہاتی اور قصباتی  
 سرمایہ داروں کے ظلم سے محفوظ رکھنا۔ (۹) قانون انتقال اراضی پر پنجاب  
 کی حمایت۔ (۱۰) ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا۔ اور گھریلو صنعتوں کا  
 مدد۔ (۱۱) ٹیکنیکل اداروں کا قیام۔

مزدوروں کی فلاح و بہبود کے تحت یہ امور درج تھے:

۱۱) معقول اجرتوں کا بندوبست (۲) کم از کم اجرت مقرر کرنے کے لئے  
 مختلف بورڈ قائم کرنا۔ (۳) کام کرنے کے اوقات میں کمی (۴) حادثات کیلئے  
 معقول معاوضے کا بندوبست۔

معاشرتی اصلاحات کے تحت یہ امور درج تھے:



(۱) مسلمانوں کے اقتصادی اور تمدنی حالات کو بہتر بنانے کے لئے موثر اقدام  
 (۲) مسلمانوں کی بہتری کے لئے صوبے کے تمام ذرائع سے پورا فائدہ اٹھانے کے  
 لئے عملی اقدام۔ اور وہیہائی اور نصیباتی مفاد کی مصنوعی تفریق کو دور کر کے  
 مسلمانوں کو قومی اتحاد کے سلسلے میں منسلک کرنے کی ہر ممکن کوشش (۳) پس  
 ماندہ اقوام کی ترقی (۴) ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، اور زچہ خانوں کا قیام۔ جہاں  
 مریض، بچوں اور عورتوں کے لئے خاص انتظام ہو۔ (۵) دیہات اور نصیبات میں  
 صفائی کا بہتر انتظام۔ (۶) پینے کے لئے پاکیزہ اور صاف پانی کی فراہمی (۷) ٹرکوں  
 کی تعمیر اور درستی۔ (۸) روشنی کے بہتر انتظامات۔ (۹) شراب اور دیگر  
 منشیہ اشیا کے استعمال کا انسداد (۱۰) ایسی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا۔ جن  
 سے بے روزگاری دور ہو۔ مثلاً بے روزگاری کا بیمہ۔ بیروزگاروں کو کام مہیا  
 کرنے کے اداروں کا قیام۔ اور غریب لوگوں کی امداد کے قوانین۔

اسلامی قانون اور تمدن کی حفاظت کے ذیل میں یہ امور درج تھے:

(۱) تمام مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت (۲) اسلامی  
 تمدن کی حفاظت کے لئے موثر اقدام (۳) جملہ اسلامی اوقاف کی بہتر تنظیم کے  
 لئے شرعی اسلامی کے مطابق موثر قوانین پاس کرانا۔ (۴) مساجد اور دیگر تقدس  
 مقامات کی مرمت اور حفاظت کے لئے موثر قوانین پاس کرانا (۵) اردو زبان اور  
 اردو رسم الخط کا تحفظ و ترقی۔

تعلیم کے ذیل میں یہ امور درج کئے گئے تھے۔

(۱) ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دینا (۲) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق

ایک وسیع النظر یا ایسی اختیار کرنا۔ اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق طریق تعلیم تجویز کرنا (۳) صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو ترقی دینا۔ (۴) پنجاب یونیورسٹی کے دستور اساسی اور نظام میں ایسی ضروری اصلاحات کرانا جن سے یونیورسٹی کے سٹڈی کیٹ اور دوسری متعلقہ مجالس اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو سچی حصہ نمائندگی حاصل ہو جائے۔

سرکاری ملازمتوں کے متعلق یہ امور درج تھے:

(۱) سرکاری ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر۔ اور جلد از جلد ان کے کماحقہ تناسب کا تعین (۲) حکومت خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کو ان کا جائز تناسب۔ اور حصہ نمائندگی دلانا۔

آخر میں یہ سبق درج تھی۔ کہ نئے دستور اساسی سے پورا فائدہ اٹھانے۔

اور آئینی ترقی کے حصول کے لئے صوبے کی مختلف قوموں۔ اور سیاسی جماعتوں میں یکجہتی اور تعاون کو بڑھانا۔ اور اس امر کا قطعاً یقین کرادینا۔ کہ ہر فرقے اور جماعت کو اپنے معتقدات اور ان پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی ہوگی اور کسی اقلیت کو اپنے مذہب یا ملت تعداد کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے گا۔

جب پنجاب میں انتخابات کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو علامہ اقبال نے محسوس کیا۔ کہ مسٹر جنات کو پھر ایک بار یہاں تشریف لانے کی تکلیف دینا چاہیے تاکہ مسلم لیگ کی انتخابی مہم کا آغاز بھی انہی سے کرایا جائے۔ مسٹر جنات نے بڑی خوشی سے یہ دعوت قبول فرمائی۔ اور ۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں رونق افروز ہوئے۔ اس سے قبل جب وہ جون میں پارلیمنٹری بورڈ کے

افتتاحی اجلاس کے لئے لاہور آئے تھے۔ تو ہم صرف چھ، سات آدمی اُن کے استقبال کے لئے سٹیشن پر گئے تھے۔ غلام رسول خاں کی خواہش تھی۔ کہ اب کی استقبال بہتر طریق سے ہونا چاہیے۔ سب سے بڑی ذمّت یہ تھی کہ احرار یا مجلس اتحادِ ملت کی طرح مسلم لیگ کے پاس یاوردی رضا کاروں کا کوئی جشن نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں راجہ عبدالعزیز نے بڑی مستعدی سے کام لیا۔ وہ عین وقت پر لاہور چھاؤنی کی انجمنِ اسلامیہ کے یاوردی رضا کاروں کا ایک پورا دستہ لے کر آ گئے۔ اس طرح مسٹر جناح کی تشریف آوری کے وقت لاہور کے سٹیشن پر اچھی خاصی رونق اور جہل پہل ہو گئی۔ راجہ عبدالعزیز لاہور ہائی کورٹ کے بار روم میں سیڈ کارک تھے۔ لیکن ملازمت کے مجبوزہ اوقات کے بعد اُن کا بیشتر وقت لیگ کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔

مسٹر جناح نے اس مرتبہ دو ہفتے لاہور میں قیام فرمایا۔ پھر چند روز کے لئے پشاور بھی تشریف لے گئے تھے۔ ۱۱ اکتوبر کی شام کو دہلی دروازہ کے باغ میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہوا۔ علامہ اقبال کا چختہ ارادہ تھا۔ کہ وہ اس جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ لیکن اسی تمام اُن کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اسی لئے ملک نمان ہمدی خان نے صدارت کی۔ جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا۔ حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ مسٹر جناح نے انتخابی ہم کا آغاز کرتے ہوئے۔ ایک نہایت زور دار تقریر کی۔ جو اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کی گئی ہے۔

مسٹر جناح کی یہ تقریر اس اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ کہ اس میں انہوں نے

نہایت اختصار لیکن جامعیت سے وہ تمام اصول بیان کر دیئے تھے جن کی بہتار پر مسلم لیگ پنجاب کے انتخابات میں حصہ لینے کا عزم رکھتی تھی۔ پوری تقریر میں ایک نکتہ بھی سندروؤں، سکھوں اور کانگریس کے خلاف نظر نہیں آتا۔ مسٹر جناح کے تمام حملوں کا ہدف یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جہاں تک اس صوبے کا تعلق ہے، مسلم لیگ کو اگر کسی جماعت سے جنگ پیش آنے والی ہے۔ تو وہ یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس تقریر کے دو چارجے یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

”..... کیا میں سرسکندر حیات خاں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر وہ اہل

پنجاب کے غیر فرقہ دارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے اس قدر بیتاب تھے۔ تو آج سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریزرو بنک کی ملازمت

اسی خواب کو نثر مندہ تعبیر کرنے کے لئے قبول کی تھی؟ اس بلندی پر قدم

کی تکمیل کے لئے انہوں نے اس سے پہلے کیوں استعفاء دیا؟ میں

پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سرسکندر حیات خاں کو ایف ای

وزارت سنبھالنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب

سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ یہ تمام رد و بدل صرف اس لئے ہو رہا ہے

کہ یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں وزارتیں اور عہدے تقسیم ہوتے

رہیں۔ یہ پارٹی جو خود غرض اور عام افراد پر مشتمل ہے۔ اور جسکو

حکومت پنجاب کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہے۔ یقیناً اس

قابل ہے۔ کہ اس کی جی کھول کر مذمت کی جائے!

جب مسٹر جناح نے یونینسٹ پارٹی پر یہ در پر حملے کئے

تولاہور کی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اردو اخبارات میں سے صرف روزنامہ احسان لیگ کا عامی تھا۔ انگریزی اخباروں میں سول اور ٹریڈ یون کبھی کبھار لیگ کی خبر شائع کرتے تھے۔ سول میں آئے دن سپر نورا احمد۔ میاں احمد یار خاں دولتاناہ اور نواب زاوہ خورشید علی خاں کے مفاہمت چھپتے تھے۔ جن میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف سخت زہرا کلا جاتا تھا مسٹر جناح کی مذکورہ بالا تقریر کے جواب میں احمد یار خاں دولتاناہ نے سول میں لکھا:

”... میرے معزز دوست مسٹر جناح لاہور کے دوپٹروں کو ہالے خلافت مشعل کرنے میں مصروف ہیں۔ اور تعجب ہے کہ وہ یہ سب کچھ اس دعوے سے کر رہے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد ہو۔ اور پنجاب میں گورنر کی وزارت نہ قائم ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح جس کام کا ایک دفعہ ارادہ کر لیں۔ پھر ان کو اس کام سے باز رکھنا ممکن نہیں۔ تاہم میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مسٹر جناح ہم سے خواہ مخواہ معنت میں جنگ مول لے رہے ہیں۔ ہم ان سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ ہماری مرضی کے خلاف ہمیں جنگ پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہم تو ان سے مناسبت کے متمنی تھے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی قسم کے زبانی سمجھوتے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔“

”اگر مسٹر جناح نے اپنی موجودہ ہم کو ترک نہ کیا۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں پنجاب میں سواتے ناکامی اور مالیوسی کے کچھ حال نہ

سودھا کچھ بعید نہیں۔ کہ مسٹر جنٹل کی اس قابل اعتراض روش سے تنگ آکر۔ آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے نمائندے مسلم لیگ گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔ اور اُس کی بجائے انڈیا پنڈنٹ رہنا پسند کریں۔ یا پھر لیگ کے مقابلے میں دوسری جماعتوں سے مل کر کسی اقتصادی پروگرام کی بنا پر علیحدہ پارٹی بنالیں۔“

جب دولتانا کا یہ بیان شائع ہوا۔ تو مسٹر جنٹل پشاور میں تھے۔ انہوں نے وہیں سے سول ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر کو ایک طویل خط لکھ کر احمد یار خاں دولتانا کے اس بیان کی رد چھیاں اڑا دیں۔ انہوں نے فرمایا:

”... مسلم لیگ کے جس پروگرام پر میں لیگ کے صدر کی حیثیت سے آج کل عمل کر رہا ہوں۔ یہ پروگرام آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی میں ایک باضابطہ قرارداد کے ذریعے طے کیا تھا۔ جس وقت یہ قرارداد منظور ہوئی تھی۔ تو احمد یار خاں دولتانا اجلاس میں موجود تھے۔ اور انہوں نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ کیا اس وقت انہیں پنجاب کے حالات کا علم نہیں تھا۔ یا کیا اس وقت انہوں نے پنجاب کی سیاست کا تجزیہ نہیں کیا تھا؟ بے شک یہ صحیح ہے۔ کہ جب میں کسی طے شدہ پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیتا ہوں۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس پروگرام کی خلاف ورزی۔ یا اس پروگرام سے بدعہدی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی

ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنہیں اس قسم کی بد عہدی خلاف  
 درزی اور وعدہ شکنی کرنے میں ضمیر کی کوئی سرزنش محسوس نہیں  
 ہوتی..... میں احمد یار خاں دولتانا سے پوچھتا ہوں۔ کہ وہ  
 کون سا زبان سمجھوتہ تھا۔ جو انہوں نے یونینسٹ پارٹی کی طرف  
 سے مجھ کو پیش کیا تھا۔ اور جسے میں نے قبول کرنے سے انکار کیا ہے؟  
 یہ بڑا اہم معاملہ ہے اور ان کا فرض ہے۔ کہ وہ کھلے بندوں عوام کو  
 بتائیں کہ یونینسٹ پارٹی کے کس رکن نے اپنی پارٹی کی نمائندگی  
 کرتے ہوئے، میرے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی خواہش کی تھی..... بسٹر  
 دولتانا کہتے ہیں کہ اگر مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ خواہ  
 ممنوعہ جنگ جاری رکھی۔ تو آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے  
 مسلمان نمائندے۔ لیگ کے خلاف کسی اور پارٹی سے تعاون کرنے  
 پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد یار خاں دولتانا کے یہ الفاظ  
 ان کے ارادوں کی غمازی۔ اور ان کی نیت کی صحیح ترجمانی کرتے  
 ہیں۔ مقدر آزاؤں کا یہ بے ضمیر حجتھا۔ جسے یونینسٹ پارٹی کا نام  
 دیا گیا ہے۔ اگر برسرِ اقتدار ہو گیا۔ تو کیا پنجاب اور گجرات  
 دونوں جگہ یہی سمجھ کرے گا؟ اے

۳۱ اکتوبر کو محمد عظیم خاں نے مسٹر جناح کے اعزاز میں، اپنے مکان پر چائے

۱۷ سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء

کی ایک پزیرناہٹ دعوت تھی۔ یہاں بھی مسٹر جناح نے ایک مختصر لیکن بہت زور دار تقریر کی اور مسلم لیگی کارکنوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ کہ آئندہ الیکشن کے لئے ضروری سرمایہ فراہم کریں۔ چنانچہ اسی تقریب میں ملک زمان مہدی خان خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی نے اپنے حصے کا پان پان سو روپیہ ادا کر دیا۔ ۱۷ اکتوبر کو ڈی۔ لے۔ وی کالج۔ سناتن دھرم کالج۔ دیال سنگھ کالج وغیرہ کے سندھو طلبہ نے مسٹر جناح کے اعزاز میں ایک جلسہ لاجپت رائے ہال میں منعقد کیا۔ جس کی صدارت سر منڈوہر لال نے فرمائی۔ اس جلسہ میں سر منڈوہر لال کی تحریک پر حاضرین نے بالاتفاق یہ قرارداد منظور کی۔ کہ مسٹر جناح سندھوستان کے بہت بڑے اور قابل فخر محب وطن لیڈر ہیں۔

جب پنجاب میں یہ کچھ سو رہا تھا۔ تو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ میں بھی رد و بدل جاری تھا۔ یو۔ پی سے نواب چھتاری۔ سر محمد یوسف اور نواب زاوہ لیاقت علی خاں مرکزی بورڈ کے ممبر نامزد کئے گئے تھے۔ لیکن اب ان تینوں نے بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یو۔ پی کی یہ ایگریکلچرل پارٹی گویا پنجاب کی یونینٹ پارٹی کا منشی اور ہمزاد تھی۔

نواب زاوہ لیاقت علی خاں کے استعفیٰ نے عجب صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔

۱۷ سول ملٹری گزٹ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء



اب ان کے استعفیٰ کے بعد ایک کا کوئی سکریٹری نہیں تھا۔ بہار سے تید حسین امام اور تید عبدالعزیز نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے اپنی عازت سے مجبور ہو کر۔ بلاوجہ مسلم لیگ کے خلاف سب وشم کا افسوسناک سلسلہ شروع کر دیا۔ اور مسٹر جناح کو مجبوراً انہیں پارلیمنٹری بورڈ سے نکال دینا پڑا۔

لاہور کے اردو اخباروں میں، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ صرف روزنامہ احسان لیگ کا حامی تھا۔ اس لئے مسلم لیگ کے پراپا گنڈے کا نام تر واد مدار احسان پر تھا۔ اس موقع پر ملک برکت علی نے بہت بڑی قربانی کی۔ انہوں نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے صرف کر کے انگریزی کا ایک سہفت روزہ اخبار نیو ٹائمز جاری کر دیا۔ علامہ اقبال نے بڑی خوشی سے اس اخبار کی سرپرستی قبول فرمائی۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہے۔ اخبار کے سرورق پر ان کا نام نامی بطور سرپرست چھپتا رہا۔ نیو ٹائمز ۱۹۳۹ء کے اوائل تک جاری رہا۔ لیکن چونکہ خسارہ بے حد ہو رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً بند کرنا پڑا۔ تاہم اس اخبار نے اپنی سوا دو سال کی زندگی میں بڑے زبردست مقالے اور مضامین شائع کئے۔ مسٹر جناح الترمذی اس کا مطالعہ فرماتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں ان کے اور پنڈت نہرو کے درمیان مراسلت ہوئی۔ اور پنڈت نہرو نے مسلمانوں کے مطالبات سے تجاہل عارفانہ کا اظہار کیا۔ تو مسٹر جناح نے ان کو نیو ٹائمز کا پیرچہ بھیج دیا۔ جس میں اسی موضوع پر ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

اسی دوران میں ایک روز سردار احمد بخش خاں ہمارے سکریٹری غلام رسول خاں کے پاس آئے۔ احمد بخش سرسکندر حیات کے بہت قریبی عزیز تھے۔ اور غلام رسول کے پرانے دوست بھی تھے۔ دونوں بیرسٹری کے زمانے میں اکٹھے ہی انگلستان میں رہ چکے تھے۔ احمد بخش خاں نے غلام رسول کو سرسکندر کا یہ پیغام دیا کہ اگر لیگ پارلیمنٹری بورڈ الیکشن سے دست بردار ہو جائے۔ تو مسلم لیگ کے دو ممبروں کو سرسکندر بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھیجنے کو تیار ہیں۔ لیکن شرط یہ تھی کہ ملک برکت علی کو اسمبلی کی رکنیت قطعاً نہیں دیا جائے گی۔ بات یہ تھی کہ سرسکندر اور ملک برکت علی کے تعلقات بہت کشیدہ تھے اور یہ کشیدگی ۱۹۲۱ء سے چلی آرہی تھی۔ جب سرسکندر کے انتخاب کے خلاف ان کے حریف سر محمد امین سنس آبادی نے اپیل کی تھی۔ تو ملک برکت علی نے اس اپیل کی پیروی کر کے۔ سرسکندر کو پنجاب کونسل سے خارج کر دیا تھا۔ ملک برکت علی نے اس اپیل میں یہ مطالبہ کیا تھا۔ کہ سرسکندر کو آئندہ کبھی انتخاب میں کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن ٹریبونل نے ایسا سخت قدم اٹھانے کی بجائے صرف ان کا انتخاب نا جائز قرار دینے پر اکتفا کیا تھا۔

سردار احمد بخش چاہتے تھے۔ کہ اگر علامہ اقبال پارلیمنٹری بورڈ کے دو ممبروں کو نامزد کر دیں۔ تو سرسکندر انہیں بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھیج دیں گے۔ جب غلام رسول خاں نے یہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اسے پلٹا تامل کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ دلہا

گوارا نہ تھا۔ کہ ملک برکت علی سے یوں بے وفائی کی جائے۔ اور دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان فرمائی۔ کہ لیگ کا مقصد محض یہ نہیں۔ کہ اسمبلی کی دو نشستیں حاصل کر لی جائیں۔ بلکہ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔ اور اگر ہم نے صرف دو نمبر یوں کی بھیج مانگا کر۔ اصل تحریک سے چشم پوشی کر لی۔ تو سارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں۔ ہم نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ جو لوگ لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں بورڈ کے پاس اپنی درخواستیں بھیج دیں۔ اس اعلان کے جواب میں آٹھ امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ (۱) ملک برکت علی (۲) خلیفہ شجاع الدین (۳) ملک زمان مہدی خان (۴) راجہ غضنفر علی خان (۵) سردار کریم بخش حیدری (۶) میاں عبدالمجید (۷) مظفر علی خان قزلباش (۸) مشتاق علی خان ملک برکت علی پنجاب کے مشرقی قصباتی حلقے سے کھڑے ہو رہے تھے۔ جس میں جالندھر۔ فیروز پور۔ فقیر۔ سوئی پور۔ ننگور۔ پٹی۔ اور پٹی کی شہر شامل تھے۔ خلیفہ شجاع الدین لاہور شہر۔ ملک زمان مہدی تحصیل حافظ آباد راجہ غضنفر علی خان تحصیل پنڈوان خان۔ سردار کریم بخش حیدری تحصیل علی پور۔ اور مشتاق علی خان ضلع رشتک سے امیدوار تھے۔ تحصیل لاہور سے دو امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک میاں عبدالمجید پیرسٹر ایٹ لار۔ اور دوسرے سردار مظفر علی خان قزلباش۔ پارلیمنٹری بورڈ نے یہ امر واضح کر دیا تھا۔ کہ اگر کسی شخص کو بورڈ نے اپنا امیدوار نامزد کیا۔ تو

وہ شخص کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر الیکشن میں کھڑے ہونے کا مجاز نہیں ہوگا۔ میاں عبدالمجید نے بلا تامل یہ بشرط منظور کر لی۔ لیکن سردار منظر علی خاں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ اور جب بورڈ نے میاں عبدالمجید کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ تو منظر علی خاں قزلباش یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ان کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

لاہور شہر سے خلیفہ شجاع الدین کی کامیابی کا نظام کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کے مقابلے میں دو بڑے زبردست امیدوار تھے۔ ایک میاں سیر الدین جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے۔ اور دوسرے مشہور نوز مسلم بریٹر خالد لطیف کا با۔ جو مجلس اتحاد ملت کے امیدوار تھے۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ خلیفہ شجاع الدین لاہور شہر کی بجائے کسی اور حلقے سے کھڑے ہو جاتے۔ تو بہتر تھا۔ لیکن انہوں نے مشورہ قبول نہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش بھی تھی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے میاںوں کی تمام جماعتوں کو اس امر پر متحد ہو جانا چاہیے۔ کہ ہر حلقے میں یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اہنوس کہ اس ضمن میں مسلم لیگ۔ مجلس اتحاد ملت اور احرار کا کوئی باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اور اکثر حلقوں میں یہ باہمتیں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئیں۔

اگر تیسرے دو آدمیوں نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ایک یونینسٹ پارٹی کے امیدوار شیخ محمد صادق۔ اور دوسرے احرار کے امیدوار شیخ حاتم الدین اس مقابلے میں شیخ محمد صادق کا پٹرا بھاری نظر آتا تھا۔ اور ہر لیشہ خفا

کہ کہیں یونیورسٹی پارٹی کو کامیابی نہ ہو جائے۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا ہونے پر آمادہ کیا۔ جو سنہ ۱۹۳۱ء کی تحریک سول نافرمانی میں تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے۔ اور اب امرتسر کی بجائے لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ امرتسر میں ڈاکٹر کچلو کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا بھی چراغ نہ جل سکتا تھا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ کچلو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے۔ اور اُدھر کانگریسی ٹکٹ پر اُن کی کامیابی کے امکانات قطعاً نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا۔ اور ڈاکٹر کچلو کو انڈی پنڈنٹ کھڑا ہونے پر رضامند کر لیا۔ چنانچہ جب اُنہوں نے امرتسر کے شہری حلقے سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا۔ تو ایک پبلک جلسے میں لوگوں نے پوچھا کہ ”آپ کس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں؟“ تو اُنہوں نے جواب دیا۔ ”کچلو ٹکٹ“۔

سر سکندر مسلم لیگ کے ڈومینڈاروں کے سخت خلاف تھے۔ ایک ملک برکت علی اور دوسرے زمان ہمدی۔ اور ان دونوں کو شکست دینے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ زمان ہمدی کے خلاف تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ تحصیل حافظ آباد میں جن لوگوں کی امداد و اعانت کے وعدے پر زمان ہمدی کھڑے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ایک ایک کر کے روگردانی اختیار کر لی۔ البتہ ملک برکت علی کا معاملہ بہت بڑھا تھا۔ سر سکندر نے اس حلقے سے پہلے مولوی غلام محی الدین نقوری کو کھڑا کرنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ اُن کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ تو پھر بڑی کوشش سے جالندھر چھاؤنی

کے ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ کو یونینسٹ پارٹی کا امیدوار بنایا گیا۔

علامہ اقبال مرزا حمید اللہ بیگ کو جانتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک آدمی

بھیج کر حمید اللہ بیگ کو لاہور بلایا۔ اور خود اُن سے درخواست کی کہ ملک

برکت علی کا مقابلہ نہ کریں۔ لیکن مرزا حمید اللہ بیگ نے یہ کہہ کر اپنی مجبوری کا

اظہار کیا۔ کہ سر سکندر اُن سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے چکے ہیں۔ کہ وہ

ملک برکت علی کے مقابلے سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ احرار نے بھی

اس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کر دیا تھا۔ یہ فیروز پور کے ایک وکیل شیخ

غلام سیدر تھے۔

جوں جوں الیکشن کی تاریخ قریب آرہی تھی۔ لیگی کارکنوں کی قلت

کو ہم بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ بڑے بڑے جاؤد بیان خطیب اور پیشہ ور

مقرر یا تو مجلس احرار میں تھے اور یا مجلس اتحاد ملت میں۔ اور گورنر سے لے

کر پٹواری تک سرکار کا پورا خالوادہ۔ یونینسٹ پارٹی کی پشت پر تھا۔ البتہ

مولانا شوکت علی اپنی بے شمار مصروفیتوں میں سے ایک ہفتے کی مہلت نکال

کر لاہور تشریف لائے۔ اور انہوں نے ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین

اور ڈاکٹر کچلو کی حمایت میں امرتسر۔ جالندھر۔ لاہور۔ فیروز پور۔ مویشیار پور

وغیرہ شہروں کا دورہ کیا۔ علامہ اقبال نے بھی لیگی امیدواروں کی تائید

میں بار بار اعلان شائع کئے۔ جو روزنامہ احسان میں بالائتسرام چھپتے رہے۔

اور پوسٹروں کی صورت میں امیدواروں کے انتخابی حلقوں میں بھی تقسیم

کئے جاتے تھے۔

حکومت پنجاب کا ریونیو نمبر سونے کے باوجود سرسگند گھلم گھلا ریونیٹ  
 امیدواروں کی حمایت میں صوبے بھر کا دورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک طرف  
 تو سندھ و سجھا پارٹی کے لیڈر راجہ نرندر ناتھ کے حریف سیٹھ دامیا کو بیٹھ جانے  
 پر مجبور کر دیا تاکہ راجہ صاحب پلاٹ مقابلہ منتخب ہو سکیں۔ اور دوسری طرف ہر  
 قابل مسلمان امیدوار کے خلاف اپنے آدمی گھڑے کر کے۔ راستہ روکنے کی  
 کوشش کی۔

اس الیکشن میں مجھے اور غلام رسول غاں کو شب و روز کام کرنا پڑا۔ پینٹ  
 پوسٹر۔ اور اخباری بیان لکھنے کا سارا کام میرے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ  
 مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ بڑے بڑے مجمعوں میں الیکشن کی تقریریں بھی کرنا  
 پڑیں۔ میں اس فن سے بالکل بے گانہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے کبھی کبھی لاہور  
 کے دائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ادبی موضوعات پر تقریریں کرنے کا اتفاق  
 ہوتا تھا۔ لیکن سقف آسمان کے نیچے۔ جاڑے کی راتوں میں۔ دس دس ہزار  
 انسانوں کے مجمع میں، جہاں حامیوں کے نعرہ ہائے تخیل کے علاوہ مخالفوں  
 کی تبرا بازی بھی سمع خراشی کرتی تھی، الیکشن کی ہنگامی سیاست پر تقریریں  
 کرنا۔ میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ پھر سب سے بڑی برکت یہ تھی کہ لوگ  
 مسلم لیگ کے نام اور کام سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جلد کا نام بھی اکثر لوگوں  
 نے نہیں سنا تھا۔ البتہ اقبال کا نام ایک ایسا گھراسکہ تھا۔ جسے ہم بے دریغ  
 چلاتے تھے۔ میں نے انہی دنوں یہ محسوس کیا۔ کہ اقبال صرف پڑھے لکھے لوگوں  
 ہی میں نہیں، بلکہ عوام میں بھی کتنا مقبول تھا۔ مجھے رہ کر یہ خیال آتا تھا

کہ کاش ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی ہوتی۔ اور وہ پنجاب کے چند بڑے بڑے شہروں کا ایک دفعہ دورہ کر لیتے۔ تو فضا بالکل صاف ہو جاتی۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک دن زمان مہدی کے سامنے بڑی حسرت سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

۸ جنوری سے ۲۸ جنوری ۱۹۳۴ء تک مجھے مسلسل ملک برکت علی کے حلقہ انتخاب کا دورہ کرنا پڑا۔ اس دوران میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سرسکندر حیات اور اُن کے حواریوں نے کس شدت سے مخالفت کا طوفان کھڑا کیا تھا۔ نواب ممدوٹ مرحوم نے فقور اور فیروز پور میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے اثر و رسوخ۔ اور اپنی کوششوں کا آخری شمار تک مسلم لیگ کی مخالفت میں صرف کر دیا تھا۔ ۲۷ جنوری سے جالندہر شہر میں پولنگ شروع ہونے لگا تھا۔ اور ۲۶ کی شام کو سرسکندر اپنی موٹر میں وہاں پہنچے۔ جالندہر کے چودہری عبدالحمید ہاٹے بہت بڑے معادن اور سرگرم کارکن تھے۔ سرسکندر نے انہیں چکے دے کر موٹر میں بٹھالیا۔ اور راتوں رات بھگا کر نامور لے گئے۔ جہاں چودہری شہاب الدین نے انہیں اپنے بٹکے میں بند کر کے۔ ایک طویل درس دیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک برکت علی ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ کہ کوئی سبھلا آدمی اُن کی مدد کرے۔ دوسرے دن جب سرسکندر کو یقین ہو گیا۔ کہ اب چودہری عبدالحمید اُن کے بتائے ہوئے پروگرام سے منحرف نہیں ہوں گے۔ تو اُن کو چھٹی دی گئی۔ اور وہ بمشکل غروب آفتاب کے بعد واپس جالندہر پہنچ سکے۔ جہاں انہوں نے



ہلے پاس آکر۔ اور ایک مجمع کے رُوبرو۔ یہ ساما واقعہ بیان کیا۔

جانندہ گویا پورے حلقہ انتخاب کا مرکزِ اعضاء تھا۔ اور اس مرکز میں ہماری کامیابی اگر کسی شخص کی بہت دکوشش کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہے تو وہ قاضی بشیر حسین صدر میونسپل کمیٹی جانندہ تھے۔ قاضی صاحب صدر بلدیہ کے علاوہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ اور اس لحاظ سے گورنر سے کم ڈپٹی کمشنر تک سرفیسر کا دباؤ ان پر ڈالا گیا۔ پہلے انہیں مختلف قسم کے انعام و اکرام کا لالچ دیا گیا۔ جب وہ اس دامِ سم رنگِ زین میں قدم رکھنے پر تیار نہ ہوئے۔ تو پھر دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آنریری مجسٹریٹ سے برطرفی اور صدارت سے برخاستگی کی دھونس بھی دی گئی۔ لیکن قاضی صاحب کے قدم پھر بھی نہ ڈلگائے۔

اب سرسکند کو ایک اور چال سوچھی۔ ان کے بڑے بھائی سرلیاقت حیات خاں بھوپال میں وزیر تھے۔ چنانچہ سرلیاقت کے ذریعے سے نواب بھوپال سے کہا گیا۔ کہ وہ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سید وزیر علی کو جو بسلسلہ ملازمت بھوپال ہی میں مقیم تھے، قاضی بشیر حسین کے پاس بھیجیں۔ سید وزیر علی نے کرکٹ میں جس قدر ترقی کی تھی۔ وہ تمام تر قاضی صاحب کی مُرتبانہ شفقت اور توجہ کا نتیجہ تھی۔ جانندہ کے گورنمنٹ ہائی سکول سے لے کر علیگڑھ تک قاضی صاحب سید وزیر علی کی سرپرستی کرتے رہے۔ وزیر علی نے بادلِ ناخاستہ جانندہ آکر یہ ناگوار فرض ادا کیا۔ لیکن قاضی صاحب پھر بھی اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ سید وزیر علی سے میرے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۸ء

میں کرکٹ کا میچ کھیلنے کے لئے لاہور آئے۔ تو انہوں نے یہ سارا واقعہ خود منہ  
کو سنایا تھا۔

اب تک قاضی صاحب پس پردہ رہ کر مدد کر رہے تھے۔ لیکن ۲۸ جنوری  
کو وہ تمام مصلحتوں کو پس پشت پھینک کر، ایک رضا کار کی طرح، ہمارے  
پولنگ سٹیشن پر آ کر کھڑے ہو گئے، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب  
اہل جالندھر کو ادھر ہی کا رخ کرنا ہو گا۔ چنانچہ ۲۸ جنوری کے پولنگ نے  
الیکشن کا فیصلہ کر دیا۔ ادرملک برکت علی صرف نوے ووٹوں کی اکثریت  
سے جیت گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ اگر ہمیں اس الیکشن میں بھی ناکامی ہوتی۔ تو  
پنجاب میں مسلم لیگ کا کیا حشر ہوتا۔ ملک برکت علی کی یہ کامیابی ہمارے  
صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک کا ایک ایسا انقلاب آفریں موڑ ہے۔ جس کی  
اہمیت کا صحیح اندازہ اس دور کا مورخ ہی کر سکتا ہے۔

۹ فروری کی سہ پہر کو جالندھر سے نوں پر ملک برکت علی کی کامیابی کا بخبردار  
موصول ہوا۔ اور ساتھ یہ پیغام بھی پہنچا۔ کہ اسی شام اہل جالندھر ایک  
بہت بڑا جلوس نکال رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں فوراً وہاں پہنچ جانا چاہئے۔  
ہم لوگ اسی وقت موٹر میں روانہ ہو گئے۔ لیکن پہلے علامہ اقبال کے دو لاکھ  
پر حافز ہونا ضروری سمجھا۔ تاکہ یہ خوشخبری ان کو سنا دی جائے۔ جاوید منزل  
کے احاطے میں داخل ہوتے ہی۔ بے اختیار ہمارے منہ سے زندہ یاد کے نعرے  
نکل گئے۔ ڈاکٹر صاحب اندر کمرے میں بیٹے ہوئے تھے۔ یہ شور سن کر فوراً

بامبر آمدے میں آگئے۔ اور ملک برکت علی سے بغلیگر ہو گئے۔ شدت جذبات اور ذور مسرت سے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ امیدواروں میں سے صرف دو کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور شاہہ غضنفر علی خاں۔ میاں عبدالحمید کی کامیابی بظاہر یقینی نظر آتی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے آخری روز پولنگ تسلی بخش نہ ہوا۔ اور وہ ڈھائی سو ووٹوں سے ہار گئے۔ اب قاعدے کی رو سے ہوتا تو یہ چاہیے تھا۔ کہ لیگ کے دونوں کامیاب امیدوار مل کر بیٹھے۔ اور پارلیمنٹری بورڈ کے مشورے۔ اور علامہ اقبال کی ہدایت سے۔ آئندہ طرز عمل اور طریق کار کا فیصلہ کرتے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے تعجب انگیز واقعہ یہ ہے۔ کہ شاہہ غضنفر علی خاں نے اپنی کامیابی کے بعد بورڈ کے دفتر میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ سیدھے یونیٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے۔ اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونیٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔

شاہ صاحب کے اس فعل سے یگی حلقوں میں حیرت اور فسوس کی لہر پھیل گئی۔ مسلم لیگ کے مخالف اخباروں نے اس پر خوشیاں منانا شروع کیں۔ اور مستحضر و استہزایہ سے بھرپور نظیں شائع کیں۔ شاہ صاحب نے یونیٹ پارٹی میں شامل ہوتے وقت جو اعلان کیا۔ اس میں انہوں نے مسلم لیگ کو ترک کرنے کی دو وجوہ بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ حالات موجودہ پنجاب میں یونیٹ پارٹی سے بہتر جماعت اور کوئی نہیں۔ دوسری یہ کہ جہاں تک

سیاسی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی۔ تو معاملہ زیادہ شرمناک صورت اختیار نہ کرنا لیکن تم یہ سوا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اسی جلسے میں راجہ غضنفر علی خاں کا حیر مقدم کرتے ہوئے۔ سر سکندر حیات نے جو تقریر کی۔ اُس میں انہوں نے فرمایا کہ:

”راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایمارے مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شروع ہی سے انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے“

سوال یہ ہے کہ اگر راجہ صاحب کے نزدیک یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے پروگرام یکساں تھے۔ تو پھر انہوں نے اُس جماعت کو کیوں ترک کیا۔ جس کے ٹکٹ پر وہ کامیاب ہوئے تھے۔ مزید برآں انہوں نے ابتدا ہی میں اپنی تقدّر آزمائی کے لئے یونینسٹ پارٹی کو کیوں پسند نہ فرمایا۔

سر سکندر نے یہ کہہ کر کہ شروع ہی سے راجہ صاحب نے اُن کو اپنے خفیہ ارادوں سے مطلع کر رکھا تھا۔ گویا ایک شرمناک راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سبقت دار نیوٹا مکر نے لکھا:

یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکا ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی خاں اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد و پیمانہ قائم ہیں۔ تو پارلیمینٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا۔ جو ذریعہ مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا..... ایک

غضنفر علی کا کیا ذکر ہے۔ مسلم لیگ افراد کے بل بوتے پر نہیں۔ بلکہ اپنے اصولوں کی بنا پر زندہ رہے گی۔ اور جب تک یہ جماعت ان اصولوں پر قائم ہے، جو ہمیشہ اس کے لئے موجب افتخار رہے ہیں، وہ ہر قسم کی منافقت کا پر وہ چاکا کر کے۔ اور ہر قسم کے فریب سے بے نیاز ہو کر۔ اس راستے پر گامزن رہے گی۔ جو آزادی وطن اور استقلال قومی کی منزل کی طرف جاتا ہے۔" لہ

انتخابات کے دوران میں مسٹر جناح نے بار بار اس طرف اشارہ کیا تھا کہ مسلم لیگ اگرچہ کانگریس کے ساتھ ہر قسم کا اتحاد کرنے کو تیار ہے۔ لیکن مسلمان کانگریس میں جذب ہو کر۔ اپنی جداگانہ قومی ہستی کو مٹا دینے پر تیار نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب سے مسٹر جناح، انگلستان سے واپس آئے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ کہ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کی طرح کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی پائیدار مفاہمت ہو جائے۔ تاکہ ہندو اور مسلمان مل کر استخلاص وطن کی جدوجہد میں حصہ لے سکیں۔ لیکن اس ضمن میں انہیں سب سے زیادہ مایوسی پیڈت جو اسرلال نہرو کی ہندو اور تیز زبانی سے ہوئی۔

جب ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں فرقہ دارانہ فیصلے (کیونل ایوارڈ) کا سوال پیش ہوا تھا۔ تو مسٹر جناح کی کوشش اور مسٹر سچولاسچائی ڈلیانی کی ہوش مندی سے کانگریس نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا

لہ ۲۲ فروری ۱۹۳۷ء

کر لیا تھا۔

اس سے قبل ڈاکٹر انصاری کی ذات گرامی سے مرعوب ہو کر کانگریس کی مجلس عاملہ بھی اس ضروری معاملے میں غیر جانب داری اختیار کر چکی تھی۔ لیکن اب کہ انتخابات کے موقع پر کانگریس نے اپنا مینی فیسٹو شائع کیا۔ تو یہ غیر جانب داری ختم ہو گئی۔ اور مینی فیسٹو میں یہ شق بڑھادی گئی۔ کہ کانگریس فرقہ دارانہ فیصلے کو ختم کر کے دم لے گی۔

نپڈت نہرو نے ۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو بالو ہگت نارائن لال دپٹہ کو اپنے خط میں صاف لکھا تھا کہ ”فرقہ دارانہ فیصلے کے متعلق کانگریس ایک غیر جانبدار اور مبہم رویہ اختیار نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اور جیسا کہ مینی فیسٹو میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ ہم اس فیصلے کو بالکل قبول نہیں کرتے“۔

اس کے علاوہ جب مسلم لیگ نے الیکشن میں حصہ لینے کا عزم کیا۔ تو نپڈت نہرو نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے۔ انتہائی تبخیر سے اعلان کیا کہ آج ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں۔ یعنی نیشنل کانگریس اور برطانوی حکومت۔ باقی جتنی جماعتیں ہیں۔ ان کو یا کانگریس کے پیچھے چلنا پڑے گا۔ یا حکومت کا ساتھ دینا ہو گا۔“

اس قسم کی افسوسناک اور لاطائل باتوں کے جواب میں سوشل جارج کو مجبوراً اعلان کرنا پڑا کہ ”سندھ وستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں نیشنل کانگریس برطانوی حکومت اور مسلمان۔ ہم نہ کانگریس کے حیمہ بردار بننے کو تیار ہیں۔ اور نہ حکومت کی کاسہ لسی کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری اپنی قومی پالیسی اور ہمارا

اپنا قومی پروگرام ہے۔“

مسٹر جناح نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔ کہ کانگریس خواہ مخواہ مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں۔ اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ ... کانگریس کو چاہیے کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں دخل نہ دے۔ ورنہ بدمزگی پیدا ہوگی۔

پنڈت ہرزاس پر سخت گرجے اور بر سے۔ انہوں نے ایوسی ایٹڈ پرسن کو ایک طویل بیان دیتے ہوئے۔ مسٹر جناح پر ناروا حملے کئے۔ اور کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ سیاست ہی ایک لالینی اور مضحکہ انگیز دعوائے ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ جس کا نام ہندوستانی ہے۔ اور تنہا کانگریس اس کی نمائندگی کا استحقاق رکھتی ہے۔ اور عریان کے آخر میں کہا:

”..... مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف اُس گروہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ جو متوسط طبقے کے بالائی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمان عوام کے ساتھ جس قدر مجھے ربط و ضبط رہا ہے۔ مسلم لیگ کے اکثر لیڈروں کو نصیب نہیں ہوا۔ مسلمان عوام کے افلاس، مصائب اور فاقہ کشی کا علم جس قدر مجھے ہے۔ اتنا علم اُن لیگی لیڈروں کو سرگز نہیں۔ جو اسمبلی کی نشستوں اور ملازمتوں کے بڑارے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو گروہوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کی یکساں نمائندگی کا دعویدار ہوں۔“

جب پنڈت نہرو کی ضد نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو خواہ مخواہ ناراض کر کے۔ حالات و واقعات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ تو علاوہ اقبال نے اس افسوسناک کیفیت کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ جو اسرلال کے مداح تھے۔ اور کانگریس کے سہ دو لیڈروں میں جو اسرلال کو غنیمت سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس صورت حال سے متاثر ہو کر حسب ذیل بیان جاری کیا۔ جو سول کے علاوہ نیوٹانگزم میں بھی شائع ہوا تھا۔

”..... میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزت ہے۔ انہوں نے آزادی وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کئے۔ اور قربانیاں گوارا کی ہیں۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کہہ بغیر نہیں ہ سکتا۔ کہ انہوں نے بلاوجہ مسٹر جناح کے ساتھ الجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے۔ اور سب سے معتد علیہ لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے۔ وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں ہے۔ لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے۔ حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی قوم پرستی اور حب وطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔

” مسٹر جناح کا آخر قصور کیا ہے۔ جس پر پنڈت نہرو اس قدر طیش میں آ رہے ہیں؟ صرف یہی کہ انہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کی اس روش کو غلط قرار دیا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کے حقوقوں



میں اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ مسٹر جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ اپنے خیالات و عقائد اور اپنے مطمح نظر کے اعتبار سے، کانگریس سے بے حد قریب ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ جہاں تک مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے بھیجنے کا سوال ہے۔ کانگریس اس مسئلہ میں دخل نہیں دے گی۔ بلکہ یہ معاملہ کلیۃً مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کیا جائے گا۔

اگر کانگریس مسلمانوں میں بھی اتنی ہی مقبول ہوتی۔ جتنی کہ سندھوں میں ہے۔ تو پھر نیڈت نہرو کو یقیناً یہ حق حاصل تھا کہ وہ کانگریسی ٹکٹ پر مسلمان امیدوار کھڑے کرتے۔ لیکن یہ ایک اظہر من الشمس اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ابتداء سے کہ اب تک صرف گنتی کے چند مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت گواہی کی ہے۔ مسلمان عوام ہمیشہ کانگریس سے الگ تھلگ رہے ہیں مسلمانوں کے اس طرز عمل سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ خدا نخواستہ جذبہ آزادی سے محروم ہیں۔ بلکہ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ سندھوں اور مسلمانوں کے درمیان بعض بنیادی اختلافات ہیں۔ اور جب تک ان اختلافات کو باہمی اہتمام و تفہیم سے رفع نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان اور سندھو کانگریس کے پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے۔

یہ صحیح ہے کہ مسٹر سی۔ آر۔ واس ایسے نراخ دل انسان لئے مسلمانوں

کے خدشات کو دور کرنے کی بڑی قابلِ تحسین کوشش کی تھی۔  
 لیکن اُن کے انتقال کے فوراً بعد پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے  
 کے تعصب نے اس رواداری کا خاتمہ کر دیا۔ میں یہ بھی تسلیم کرنے  
 کو تیار ہوں۔ کہ پنڈت جواہر لال نہرو واقعی کچھ عرصہ مالوی اور  
 مونجے کی ذہنیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن  
 حال ہی میں اُنہوں نے فرقہ دارانہ فیصلے کے متعلق کانگریس کی  
 غیر جانبداری کو جس طریقے سے ختم کیا ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے  
 کہ وہ بھی آخر کار وہاں سبھا کے روز افزوں اثر سے مغلوب ہو گئے  
 ہیں۔ پنڈت نہرو کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر اب مسلمانوں کو اُن پر  
 بھی چنداں اعتماد نہیں رہا۔

”غلاوہ ازین پنڈت نہرو کو یہ سرگرمیوں نہیں دیتا کہ وہ اس بات کا  
 شور مچاتے پھریں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے  
 بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس  
 اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ہے۔ یا یہ کہ وہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں  
 اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔“

”میں پوچھتا ہوں کہ کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط درجے کے  
 بالائی اور متمول طبقے سے تعلق نہیں رکھتے؟ افلاس اور بھوک کا نام  
 لے لے کر خلیطِ محبت کرنے۔ اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں  
 کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو

بہ نظرِ غائر نہ کھا جائے۔ مسٹر جناح اپنے اس دعوے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگریس کو مسلمانوں کے انتخابی حلقوں میں اپنے امیدوار نہیں کھڑے کرنا چاہئیں۔ اس نصیحت سے ناراض ہونے کی بجائے کانگریس کا فرض سمجھا۔ کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوتی۔

”مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائیگا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور کیسے ارفع مقام کے مالک ہیں۔ اور اس احساس کے بعد وہ مسٹر جناح کو ناراض کرنے کی بجائے۔ اُن کی امداد و اعانت سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے جیسے کہ مرکزی اسمبلی کے کانگریسی لیڈر اب تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ممکن ہے پنڈت نہرو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے۔ جنتِ الجحتمار میں رہنا پسند کریں۔ اور یہ اصرار کرتے جائیں۔ کہ مسلمانوں کی نیابت کا حق بھی کانگریس ہی کو حاصل ہے اگر انہوں نے ایسی ضد کی۔ تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے سندھوستان کی آزادی کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ پنڈت نہرو کو چاہیے۔ کہ وہ مسٹر جناح سے معذرت کر کے۔ اُس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ جو اُن کی جلد بازی اور ناتجربہ کاری نے پیدا کر دی ہے۔“

# ”مسلم رابطہ عوام“ کی تحریک

جب مسٹر جناح کو پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی کی اطلاع دی گئی۔ تو انہوں نے جواب میں۔ صوبائی لیگ کے سکریٹری کو ذیل کا حوصلہ افزا نامہ لکھا:

”ڈیر مسٹر سلام رسول۔ آپ کا خط ملا۔ میں ممنون ہوں۔ کہ آپ نے پنجاب کی صورتِ حال کو واضح اور مستقیم طریق پر بیان کیا ہے۔ سر محمد اقبال کا والا نامہ بھی ملا تھا۔ جس کا جواب میں نے بھیج دیا ہے۔ اس جواب کی ایک نقل آپ کو بھیجتا ہوں۔ میں آپ کی بہادری اور بے باکانہ مساعی کی داد دیتا ہوں۔ آپ کو ناکامی کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے معاملے میں پنجاب کی شکست دراصل فتح ہے۔ یہ کچھ کم نہیں۔ کہ آپ نے پنجاب کی سر زمین میں مسلم لیگ کا جھنڈا لگا دیا ہے۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں۔ کہ ہم کس حد تک کامیاب

ہوتے ہیں۔ کوئی ذمی شعور انسان پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں مُعجز  
نمائی کا دعوے نہیں کر سکتا۔ اور ہمیں تو ایک عظیم الشان مہم درپیش  
ہے۔ میں آپ کی کامیابی کا متمتنی ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

سندھستان کے چھ صوبوں کے الیکشن میں کانگریس کو غیر معمولی کامیابی  
حاصل ہوئی تھی۔ اور اس میں ایوان کی کل نشستیں ۲۱۵ تھیں، جن میں سے  
کانگریس نے ۱۵۹ پر قبضہ کیا۔ بہار میں ۱۵۲ نشستوں میں سے ۹۸ کانگریس کے  
حفظ میں آئیں۔ صوبجاتِ متوسط میں ۱۱۲ میں سے ۷۰، بمبئی میں ۱۷۵ میں سے  
۱۸۶، یو۔ پی میں ۲۲۸ میں سے ۱۳۴ اور اڑیسہ میں ۶۰ میں سے ۳۶ نشستوں  
پر کانگریس کا قبضہ ہو گیا۔ البتہ پنجاب، بنگال، سرحد، سندھ اور آسام میں کانگریس  
کو ایسی کامیابی نہ ہو سکی۔ پنجاب میں ایوان کی کل نشستیں ۷۵، ان میں سے  
صرف ۱۸ کانگریس کے حفظ میں آئیں۔ بنگال میں ۲۵۰ میں سے ۵۴، سرحد  
میں ۵۰ میں سے ۱۹، سندھ میں ۶۰ میں سے ۱۳، اور آسام میں ۱۰۸ میں سے ۳۳  
نشستوں پر کانگریس قبضہ کر سکی۔

کانگریس کی اس فتح پر ایک نظر ڈالتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ  
جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، کانگریس کو ان کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً  
کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ سندھستان بھر کے مسلمانوں کی کل نشستوں کی مجموعی  
تعداد ۵۰۰ تھی، جن میں سے صرف ۲۵ پر کانگریس قبضہ کر سکی اور ان ۲۵

میں سے ۵ نشستیں صوبہ سرحد میں شامل تھیں۔ گویا صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے بڑے عظیم میں کانگریس کو صرف ۱۰ مسلمان اپنے حامی و مددگار مل سکے۔ مداس میں چار۔ بہار میں چار اور پنجاب میں دو مسلمان کانگریس ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ یو۔ پی۔ صوبجاتِ متوسط۔ بنگال۔ سندھ۔ اڑیسہ اور آسام میں ایک مسلمان بھی کانگریس ٹکٹ پر منتخب نہ ہو سکا۔

پنجاب کے کامیاب امیدواروں میں ایک تو میاں افتخار الدین تھے۔ جو قسبل قصور، ضلع لاہور سے کھڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے چودہری محمد حسن جو لدھیانہ کے دیہی حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں امیدواروں کی کامیابی میں کانگریس کو رتی برابر بھی دخل نہیں تھا۔

میاں افتخار الدین کی کامیابی کے تین اسباب تھے۔ اول اُن کی بہادری۔ دوم اُن کی دولت اور سوم اُن کا مقابلہ ایک ایسے شخص سے آپڑا تھا۔ جسے سر سکندر حیات لا محالہ شکست دینا چاہتے تھے۔ میاں افتخار الدین کے مقابلے میں خان بہادر سردار حبیب اللہ تھے۔ جو ۱۹۲۳ء سے مسلسل پنجاب کونسل کے ممبر چلے آ رہے تھے۔ سردار حبیب اللہ سر فضل حسین کی پارٹی کے زبردست رکن تھے۔ اور وزارت سازی میں سر سکندر کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے سر سکندر کو اُن سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس الیکشن پر سر سکندر نے اپنے سرکاری افسر سوئیچ کو کام میں لاکر سردار حبیب اللہ کو ایک ایسے شخص سے شکست دلائی جو بادی النظر میں کانگریس کا امیدوار تھا۔

چودہری محمد حسن کا معاملہ مختلف تعلقہ چودہری صاحب اہمیرانہ میں وکیل تھے

اور اپنے کردار کی بلندی اور عس کی بے لوثی کے باعث سہرہ درہ میں بے حد مقبول  
 تھے۔ ضلع کے سرکش حکام کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ عوام کی مدد کرتے تھے۔ غربانے کے  
 مقبول ہیں بغیر فیس کے، مفت پیڑھی کرنے سے بھی انھیں دریغ نہ تھا.....  
 دیانت داری اور اخلاص میں بھی اُن کا پایہ بے حد بلند تھا۔ اپنی انہی خوبیوں  
 کے باعث وہ سہرہ حکومت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ یونیورسٹی پارٹی نے  
 اُن کے خلاف ایک نہایت معمولی اور بے حیثیت آدمی کھڑا کیا تھا۔ پھر اپنے  
 حلقہ انتخاب میں چودہری محمد حسن کی برادری بھی کافی تھی۔ لوگوں میں  
 ریاست کا شعور بالکل نہیں تھا۔ اس لئے چودہری صاحب آسانی  
 سے کامیاب ہو گئے۔

الیکشن کے نتائج برآمد ہونے کے بعد۔ جب کانگریس کو اپنی طاقت اور قوت  
 کا احساس ہوا۔ تو پنڈت نہرو نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں ایک آل انڈیا  
 نیشنل کنونشن منعقد کی۔ جہاں ہندوستان کی تمام صوبائی اسمبلیوں کے اُن اراکین  
 سونمبروں کو، جو کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، مدعو کیا۔ اس کنونشن  
 میں پنڈت نہرو نے جو تقریر کی۔ اس کے ایک ایک لفظ سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ  
 وہ گویا اٹھارویں صدی کے مرہٹہ بیچار کی طرح دہلی تک تو ہندوستان کو فتح  
 کر چکے ہیں۔ اور اب عنقریب اپنی فتوحات کا رخ ایک طرف بنگال و آسام  
 اور دوسری طرف لاہور و پشاور کی طرفنا پھیرنے والے ہیں۔

فتح و نصرت کے اس نقشہ میں جو اہل لائ کو صرف ایک محاذ ایسا نظر آتا تھا  
 جو اُن کو، بیچار کے سامنے ابھی تک سرنگور نہیں ہوا تھا۔ وہ خاند ہندوستان کے

مسلمانوں کا تھا۔ اگر اس بزرگوار کے مسلمان بھی اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے کانگریس میں جذبہ توجہ دیتے۔ تو آج جواہر لال سندھوستان کا بادشاہ تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ کانگریس کی ساری کوششوں کے باوجود مسلمان اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم تھے۔ تاہم جواہر لال، مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے اپنے نطق کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیرا۔ تو فرماتے لگے۔

”ہم لوگ بدستگیر اس دہم میں مبتدار ہے۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں سے مفاہمت یا سمجھوتہ کرنے سے مسائل کا تصفیہ نہ جائے گا۔ اس ہتھیار میں پڑ کر ہم نے عوام کو نظر انداز کرنے رکھا۔ یہ طرز عمل غلط اور یہ پالیسی بے کار تھی۔ آئندہ ہم کبھی اس طرف رجوع نہیں کریں گے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمانوں کو ایک انگ اگردہ تصور کر کے سندھوستان سے سمجھوتہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں یہ انداز فکر قرین دستاویز نہیں ہو تو ہو۔ موجودہ زمانے میں اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج کل ہر چیز پر اقتصادی نقطہ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک افلاس بے کاری اور قومی آزادی کے مسائل ہیں، مسلمانوں، سکھوں اور مسیحیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چوٹی کے فرقہ پرست لیڈر ہر وقت حقیقہ، سنسے اور ہٹوارے کی آبی کرتے رہتے ہیں کہ ان کی قوم کو ملازمتوں میں کتنا حصہ ملے گا۔ اور اپنی اپنی کتنی نشستیں حاصل ہوں گی۔ ان لیڈروں کو چھوڑ کر۔ جب ہم براہ راست عوام سے ملنے ہیں۔ تو جو یہ وہی شے کہ مسائل کا درما



نظر آتے ہیں۔ جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ یعنی افلاس اے بے کاری اور قومی آزادی کی لگن۔ اس نام نہاد فرقہ دارانہ مسئلے کے حل کا بھی یہی طریقہ ہے۔ کہ لیڈروں کو نظر انداز کر کے۔ براہ راست عوام سے ربط و ضبط پیدا کیا جائے۔

”عہد حاضر میں ہمارے ہاں جو حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سندھوستان کے مسلمانوں میں کیا تعلیم یافتہ اور کیا جاہل، اضطراب کی ایک وسیع لہر چلی نکلی ہے کوئی اچھی اور معقول قیادت منبہر نہ آنے کی وجہ سے۔ یہ لوگ ہولکے جھبونکے کی طرح، اُدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی موجودہ بے بسی کے احساس سے سخت دل گرفتہ ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں نے انھیں سیاسی اعتبار سے سخت کمزور کر دیا ہے۔ اگرچہ برطانوی بلوکیت نے انھیں قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے کے لئے۔ کچھ نہایت معمولی اور ادنیٰ اہمیت کی مراعات عطا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

”تمام مسلمان، کیا بڑھے اور کیا جوان، اور کیا ان کے اخبارات آج اپنے خیالات و اعمال کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں کہ فرقہ پرستی کی لعنت سے دامن چھڑا کر۔ اپنے آپ کو حریت و ترقی کی تحریکوں سے وابستہ کریں۔ وہ یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ کانگریس کے ریلے نے کس طرح ہندوؤں کی فرقہ دارانہ

جامعتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر۔ عوام کے دل و دماغ پر اپنا  
سنگہ بٹھا دیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر مسلمان اُداس و مغموم  
مورسے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گویا ادارت سمجھنے لگے ہیں۔ اُن کا  
بھی جی چاہتا ہے۔ کہ وہ آج کی کامیابیوں میں حصہ دار بنیں  
اور مستقبل کی کامیابیوں میں شریک ہوں۔ نہ صرف کامیابی و  
کامرانی میں شریک ہوں۔ بلکہ وہ ذمہ داریوں اور ذرائع کا پوجہ  
اُٹھاتے ہیں بھی شرکت کرنا چاہتے ہیں۔

” اگرچہ الیکشن میں ہمیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ اور ہم مسلمانوں  
کے حلقوں سے اپنے امیدوار منتخب نہیں کرا سکے۔ لیکن اسکے  
باوجود مسلمان عوام پر ہم کامیاب دستِ خرد ہیں۔ یہ لیگ یقیناً فرقہ پرستی  
کی سنت کو ترک کرنے پر کسی حد تک آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہمارا  
کاہ ہے کہ ان حالات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور مسلمان عوام اور  
ان کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے۔ ایک  
کوہِ نوحے کی فرقہ پرستی سے پاک کر دیں“

قطع نظر اور امور کے۔ جو امر لال نے اپنی اس تقریر میں یہ بات بالکل درست  
کہی تھی۔ کہ کانگریس کی کامیابی نے ہندوستان کے مسلمانوں میں، ایک ہم گیر  
اُداسی، پریشانی اور بے بسی کا احساس طاری کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو

سہ ماہی انیولرجہ - ۱۹۲۰ء جلد اول -

گویا ادارت سمجھنے لگے تھے۔ ہندوستان میں کانگریس کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اُس کا ایک مرکزی نظام تھا۔ جس کے تحت پشاور سے مدراس تک نہایت طاقتور شاخوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کانگریس کے صدر کے ایک اشارے پر یہ پورا نظام حرکت میں آجاتا تھا۔ اور جگہ جگہ جلسے اور مظاہرے شروع ہو جاتے تھے۔ مسلمان اس قسم کی مرکزیت سے محروم ہو گئے تھے۔ پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور سرحد اگرچہ اُن کی اکثریت کے حصے تھے۔ لیکن یہاں ہر حصے میں الگ الگ جماعتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ جن کے درمیان کوئی باہمی ربط و ضبط موجود نہیں تھا۔ اقلیت کے حصوں میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور کوئی مرکزی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ اندیشہ تھا کہ یہ جگہ جگہ پکھری ہوئی مسلمانوں کی ٹولیاں۔ کانگریس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے اندر بہ جانیں گی۔

ان علامات میں علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو دیکھ لکھے۔ پہلا خط ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا ہے۔ یعنی دہلی کنونشن کی کارروائی پڑھتے ہی۔ اُنہوں نے یہ خط لکھا۔ جس میں فرماتے ہیں :

”میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ صدارت ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے اس نتیجے میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُس کو بھی آپ نے بخوبی محسوس کر لیا ہوگا۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوئے گئے۔ کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو۔

کم از کم اس بات کا ایک نا درموقع ضرور دیا ہے۔ کہ وہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا میں رونا سونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔

”اس لئے میری رائے ہے۔ کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ۔ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تضحی کے ساتھ۔ یہ حقیقت بیان کیجئے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جدا گانہ سیاسی ہستی کے مالک ہیں۔ اور اس حیثیت سے ان کا سیاسی مصلح نظر کیا ہے۔“

”یہ امر بے حد ضروری ہے۔ کہ اندرون و بیرون ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے۔ کہ ملک میں محض اقتصادی مسائل ہی نہیں ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے، تو مسلمان ہند کے لئے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔“

بہر حال کلچر کا مسئلہ کسی طرح بھی اقتصادی مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے۔  
 ”اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ  
 اس طرح ان مسلمان ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا جنہوں  
 نے مسلمانانِ سندھ کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں  
 قائم کر رکھی ہیں۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ سندھوؤں پر یہ حقیقت اچھی  
 طرح منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی  
 مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی۔ اور وہ اپنی جہاں تہذیبی  
 کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روزیں دہلی آ رہا ہوں  
 پھر اس موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو ہوگی۔“  
 دوسرا خط ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں :  
 ”میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا وہ خط جو میں نے دو ہفتے سوئے لکھا تھا  
 آپ کی خدمت میں پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو  
 دہلی کے پتے سے بھیجا تھا۔ اور جب میں نے دہلی پہنچ کر دریافت کیا  
 تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔  
 ”میں نے اس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً دہلی  
 میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کر کے حکومت اور سندھوؤں کو  
 ایک بار پھر مسلمانانِ سندھ کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔“

۱۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (رشیخ محمد اشرف)

"عالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اور بعض ایسے  
 وجہ سے جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ پنجاب  
 کے مسلمانوں کا رجحان بڑی سرعت سے کانگریس کی طرف بڑھتا جا  
 رہا ہے۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ جلد از جلد عورتوں کو  
 میری اس تجویز کا فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو  
 آئندہ اگست تک ملتوی ہو چکا ہے۔ اور ادھر حالات ایسے ہیں کہ مزید  
 انتظار یا تاویل کئے بغیر مسلمانوں کی قومی پالیسی کا دوبارہ اعلان کر دینا  
 بے حد ضروری ہے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے چند بڑے بڑے  
 مسلمان لیڈر ملک کا دورہ کر لیں۔ تو کنونشن بہت کامیاب  
 رہے گی۔" لے

علامہ اقبال بیمار تھے۔ اور وہی صرف اس لئے گئے تھے کہ اپنے معالج حکیم  
 نابینا صاحب کو نبض دکھا سکیں۔ لیکن انہیں پنڈت نہرو کی کنونشن سے اس  
 قدر تشویش تھی کہ وہ بڑی شدت اور بڑے اصرار سے مسٹر جناح کو بار بار لکھتے  
 ہیں کہ اسی پنج پر خود مسلمان ممبروں کی بھی کنونشن ہونی چاہیے۔  
 مسٹر جناح جن مشکلات میں اس وقت گھرے ہوئے تھے۔ ان کا صحیح اندازہ  
 آج نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تین تہا آل انڈیا مسلم لیگ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا  
 ہوئے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے مستغنی ہو جانے کے بعد لیگ کا کوئی

لے اقبال کے خطوط جناح کے نام - (شرح محمد اشرف)

سکرٹری نہیں تھا۔ ساری خط و کتابت مسٹر جناح کو خود کرنا پڑتی تھی۔ ان کے پاس کوئی ٹائپسٹ بھی نہیں تھا۔ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ اقلیت کے صوبوں میں۔ کانگریس کی عظیم شان کامیابی نے۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک عجیب محسوس ہوا۔ جگہ جگہ یہ آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کہ اب مسلمانوں کی اقلیت اسی میں ہے کہ وہ اپنی جداگانہ تنظیموں کو توڑ کر کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ خود کانگریسی لیڈر اس یقین میں مگن تھے۔ کہ اب کوئی دن کی بات ہے۔ یہ جداگانہ انتخاب، یہ فرقہ وارانہ فیصلہ اور یہ اقلیتوں کے تحفظات ختم کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر کانگریس پورے بزرگ عظیم کی واحد نمائندہ جماعت بن کر۔ اپنی مرضی اور اپنی شرائط پر برطانوی حکومت سے گفت و شنید کرے گی۔

ان حالات میں جناح کا سب سے پہلا کام یہ تھا۔ کہ وہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہونے سے بچائیں اور انہیں مرکزیت سے ادھر ادھر ہٹانے نہ دیں۔ چنانچہ عین جس وقت علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی۔ مسٹر جناح لکھنؤ پہنچ کر۔ اس کوشش میں مصروف ہو چکے تھے۔ کہ یو۔ پی اسمبلی کے تمام مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیں۔

میرے سامنے اس وقت ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا روز نامہ سٹیٹسین ہے۔ جس میں اخبار نند کور کے نامہ نگار کے قلم سے روڈا دورج ہے :

نو گز سشٹنہ الزار کو مسٹر جناح نے یو۔ پی اسمبلی کے ان مسلمان ممبروں سے

جو انڈی پنڈنٹ یا نیشنل ایگزیکیوٹو پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے، مفصل گفتگو کی تھی۔ مسٹر جناح بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں۔ کہ تمام مسلمان ممبر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مسلم لیگ پارٹی کا ایک اجلاس سلیم پور ہاؤس میں ہوا تھا۔ جہاں اسی موضوع پر دیر تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ آخر رات کے ساڑھے گیارہ بجے مسٹر جناح وہاں سے اٹھ کر نواب سر محمد یوسف کے مکان پہنچے۔ جہاں غیر لیگی ممبران کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر جناح نے ان کو وہ شرائط پیش کیں۔ جو مسلم لیگ پارٹی نے مرتب کی تھیں آخر کار اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ غیر لیگی ممبر اپنی اپنی جماعتوں سے مستعفی ہو کر۔ اور مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ یہ معاملہ تقریباً رات کے ایک بجے ہوا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر مسٹر جناح واپس سلیم پور ہاؤس گئے۔ تاکہ لیگ پارٹی کو یہ خوش خبری سناسکیں۔

عزیز فرمائیے۔ مسٹر جناح کی عمر۔ اُس وقت ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی آرام و راحت اور تمول میں گذاری تھی۔ دکالت کے ابتدائی دو، چار برسوں کی مشقت کے بعد قدرت نے انہیں زندگی کی تمام آسائشیں اور نعمتیں بڑی فراخ دلی۔ اور فیاضی سے ہیا کر دی تھیں۔ پتا سے ان کا یہ معمول چلا آ رہا تھا۔ کہ وہ گرمیوں میں سیر و تفریح کے لئے یورپ



چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن اب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر جب تو اے انسانی کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، انہوں نے سٹب بیداریاں شروع کر دی تھیں۔

پنجاب میں سرسکندر نے اپنی وزارت قائم کر لی تھی۔ جس میں خود ان کے علاوہ پانچ آدمی شریک تھے۔ مسلمانوں میں سے ملک خضر حیات ٹوانہ۔ اور میاں عبدالحی۔ سندھوؤں میں سے چودھری چھوٹو رام اور سرمنوہر لال۔ اور سکھوں میں سے سرسندر سنگھ جڈیہیہ لئے گئے تھے۔ سکھوں کی دو مختلف جماعتیں اسمبلی میں تھیں۔ ایک اکالی پارٹی تھی۔ جس کے دس ممبر تھے۔ اور دوسری کا نام خالصہ نیشنل پارٹی تھا۔ جس کے تیرہ ممبر تھے۔ سرسکندر نے خالصہ نیشنل پارٹی کے لیڈر سرسندر سنگھ جڈیہیہ کو اپنی وزارت میں شامل کیا تھا۔ اس کے علاوہ دو سکھ یونینسٹ پارٹی۔ اور چار سکھ کانگریس پارٹی میں بھی شامل تھے۔ سرسندر سنگھ کو وزارت میں جبکہ دینے سے یہ بات واضح ہو گئی تھی۔ کہ یونینسٹ پارٹی سکھوں کی نمائندگی کا دعوے نہ کر سکتی تھی۔

سندھو ممبروں میں سے کانگریس کے علاوہ دس آدمی یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ جو تمام کے تمام گورننگ بورڈ، رُہتک اور حصار کے جاٹ تھے۔ ان کے لیڈر چودھری چھوٹو رام تھے۔ دس سندھو ممبروں کی ایک الگ جماعت بھی تھی جس کا نام سندھو الیکشن بورڈ پارٹی تھا۔ اس کے لیڈر راجہ نرندر ناتھ تھے۔ سرمنوہر لال کو اسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے وزارت میں شامل کیا گیا تھا۔ سرمنوہر لال کی شرکت اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ یونینسٹ پارٹی

کٹیہ ہندوؤں کی بھی نمائندگی کا دعوائے کرنے کے قابل نہ تھی۔

۸ اپریل ۱۹۳۴ء کو پنجاب اسمبلی کے سپیکر کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اور علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ چودہری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا کیا جائے۔ ڈاکٹر کچلو انڈی پینڈنٹ امیڈوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے تھے۔ اور اپنے ایشیاء و قربانی۔ اور اپنے کردار کی بلندی کے اعتباراً سے اسمبلی کے پورے ایوان میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہ ایک شخص تھے۔ جو، سیاسی عقائد سے قطع نظر۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ اگر انتخاب میں پارٹی کی بے جا پابندی عائد نہ کر دی جاتی۔ تو خود یونین پارٹی کے بہت سے ممبر چودہری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر کچلو کو ووٹ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور چودہری شہاب الدین کامیاب ہو گئے۔

دہلی کی آل انڈیا نیشنل کنونشن کے ختم ہوتے ہی۔ پنڈت نہرو نے اپنی ساری توجہ مسلمانوں کی طرف مہذول کر دی۔ ان کو اس بات کا وہم ہو گیا تھا کہ مسلمان عوام تو دل سے کانگریس کے ساتھ ہیں۔ یہ محض چند سرنہرے مسلمان لیڈروں کی شرارت ہے۔ کہ وہ انہیں بہکا کر غلط راستے پر ڈال رہے ہیں چنانچہ پنڈت نہرو نے مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کرنے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر و نتر الہ آباد میں ایک الگ محکمہ قائم کر دیا جس کا نام مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کائیکٹ) رکھا گیا۔ اس محکمے کے ذمہ دار میرٹ ایک عزیز دوست ڈاکٹر مندا شرف مقرر کئے گئے۔ ڈاکٹر اشرف مسلم یونیورسٹی

علیگڑھ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اور بہت معقول تنخواہ لیتے تھے۔ لیکن اپنے سیاسی عقائد اور جذبہ ایشیا کے تحت انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹریٹ میں صرف پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کر لیا۔

کانگریس کی اس نئی تحریک یعنی مسلم رابطہ عوام کی غرض و غایت۔ اور اس کے طریق کار کو اپنی عبارت میں بیان کرنے کی بجائے۔ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ خود ہوا ہلال کے الفاظ یہاں نقل کر دیئے جائیں تاکہ اصل تصویر سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو نیشنل ہندو تے سندھوستان کی تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔

” ایکشن کے سنگانے کے دوران میں۔ اور اس کے بعد بھی۔ ہمارے

ہاں اکثر اس سلسلہ پر بحث ہوتی رہی ہے۔ کہ مسلمان عوام کے ساتھ

کانگریس کا رابطہ کیونکر استوار کیا جائے۔ ہمیں اپنے دورے کے

سلسلہ میں جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔

کہ مسلمانوں میں اس بات کی بڑی خواہش پائی جاتی ہے۔ کہ وہ

کانگریس کا پیغام سنیں۔ اور کانگریس کی تحریک آزادی میں شریک

بھی کریں۔ لیکن چونکہ باقسمتی سے ہم نے مسلمانوں کو اب تک

نظر انداز کئے رکھا ہے۔ اور یوں بھی کانگریس میں تجربہ کار مسلمان

کارکنوں کا سخت قحط ہے۔ اس لئے مسلمان عوام کے اس شوق پور

ان کی اس بیداری کا ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

دو اسی وقت سے کانگریس کے بڑے بڑے رہنما اس مسئلہ پر غور و خوض کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو کانگریس میں کیوں نہ شامل کیا جائے۔ تاکہ ہماری تحریک آزادی پہلے سے بھی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جائے۔ اور مسلمان اپنی حیثیت اور اہمیت کے مطابق کانگریس کے کاموں میں حصہ لے سکیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب ہم ملک کے بنیادی مسائل۔ مثلاً آزادی حاصل کرنے کی تڑپ۔ یا انڈیا اور بے کاری کو دور کرنے کی عواض پر غور کرتے ہیں۔ تو صاف نظر آتا ہے کہ ان مشرک معاملات میں ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور مسیحیوں میں کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ جھگڑا صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب گنتی کے چند بڑے بڑے لیڈر فرقہ دارانہ حقوق کے ہزاروں کی بحث شروع کر دیتے ہیں۔"

"اندریں حالات سب سے مقدم اور ضروری کام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو کانگریس کا ممبر بنایا جائے۔ جب اُن کی ایک کثیر تعداد کانگریس میں شامل ہو جائے گی۔ تو وہ لوگ خود بخود کانگریس کے کاموں میں حصہ لیں گے۔ اور اس طرح اپنی کارکردگی سے کانگریس کی پالیسی پر سچی نظر انداز ہوں گے۔ میں آپ کی صوبائی کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ اس معاملہ پر خصوصی توجہ کرے۔ اور مسلمان ممبر بھرتی کرنے کا کام

فوراً تہذیب سے شروع کر دیا جائے۔ میں یہ بات دثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ بے شمار مسلمان کانگریس کی رکنیت قبول کرنے کو تیار ہیں۔ صرف ان تک پہنچنا آپ کا کام ہے۔

”میری رائے میں ہندوستان کے ہر صوبے کی کانگریس کمیٹی کو چاہیے کہ اپنے ہاں مسلم رابطہ عوام کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کرے جس کے نگران امدکار کن شہر امد و بہات میں پھیل جائیں۔ اور مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کریں۔ میں اس کے لئے کوئی ضابطہ واضح اور معین لائحہ عمل تجویز نہیں کر سکتا۔ یہ کام آپ کی صوبائی کمیٹی کا ہے۔ کہ وہ مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر جو طریقہ عمل مؤثر سمجھے اختیار کرے۔ بہر حال یہ ضروری ہے۔ کہ مسلمان ممبروں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیا جائے۔ امد کانگریس کے کاموں میں مسلمانوں کی دلچسپی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ کانگریس کے مسلمان ممبر اپنی الگ دلچسپیاں دہیا کریں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مجموعی طور پر کانگریس ایسا پروگرام اختیار کرے۔ جس سے مسلمان سبھی خاصی دلچسپی کا اظہار کریں۔

”آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر دفتر واقع الہ آباد میں۔ اس غرض کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر دیا گیا ہے، ہندوستان کی جملہ صوبائی کانگریس کمیٹیوں میں مسلم رابطہ عوام کی جتنی شاخیں کھولی جائیں گی وہ سب کی سب الہ آباد کے مرکزی محکمے کے تحت کام کریں گی۔

مناسب یہی ہے کہ آپ مرکز کو اپنی کارگزاریوں کی باقاعدہ اطلاع بھیجتے رہیں۔ ہم آپ کو اس کام کے لئے مختلف پوسٹر اور پمفلٹ بھی تیار کرتے رہیں گے۔

”اسی سلسلہ میں ایک اور ضروری گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ کانگریس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اردو میں شائع نہیں کئے جاتے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں، جلسوں کی اطلاع نہیں ہونے پائی یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مہربانی فرمائیے کہ اپنے صوبے کی ضلع دار اور مقامی کانگریس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کر دیجئے کہ وہ آئندہ اردو میں بھی اشتہار شائع کیا کریں۔ بالخصوص پنجاب، یو۔ پی اور دہلی کے صوبوں۔ اور سندھ و تان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری ہے۔“

جو اسرلال نے مسلم ماس کانٹیکٹ کا محکمہ قائم کر کے۔ اور کانگریس کمیٹیوں کے نام پر گشتی مراسلہ جاری کر کے۔ گویا اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ اب کانگریس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی۔ اور اس کے بجائے وہ براہ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی۔ اور انہیں بہلا بھلا کر۔ ڈوادہ کا کر دینا اور بھلا کر۔ چکے دے کر اور ہر قسم کے سبب بلیغ دکھا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئیگی

سے روزنامہ سول ملٹری گزٹ۔ محدثہ ۲ اپریل ۱۹۳۷ء

ہر اسرائیل کے زانج میں فدا دینے والی بانی کے علاوہ ایک اور عنصر بھی شامل ہے جس کا نام ہے فریبِ نفس۔ وہ بعض اوقات صاف اور بدیہی حقائق کو دیکھنے سے محض اس لئے انکار کر دیتے ہیں۔ کہ ان کے نہاں خانہ و ماغ میں۔ ان کے تصورات و توہمات نے جو دنیا تعمیر کر رکھی ہے۔ وہ ان خارجی حقائق سے مختلف ہے۔

سندھ و ستان کے اچھوتوں کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امجدی کارپنڈت نہرو کی اس نئی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

”مسلم رابطہ عوام کی تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے۔ یا ان سے بے نیاز و بے پروا ہو کر عام سندھوؤں اور مسلمانوں میں سیلہ سی یگانگت پیدا کی جائے۔ اگر اس تحریک کی تحلیل اور اس کا تجزیہ کیا جائے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ برطانیہ کی قدامت پسند جماعت (کنزرویٹو پارٹی) کا منصوبہ تھا۔ کہ ”ٹوریوں کی دولت“ سے یبر پارٹی کو خرید لیا جائے۔ یہ تحریک جتنی فتنہ انگیز تھی۔ اتنی ہی بے معنی بھی تھی۔ کانگریس نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا۔ کہ دنیا میں بعض ایسی گراں بہا چیزیں بھی ہیں۔ جن کا مالک ان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہونے کے بعد۔ ان کو کبھی اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور کسی طرح دھوکہ اور فریب دے کر۔ اس شخص سے وہ متاعِ عزیز ہتھیالی جائے۔ تو سخت رنجش اور کشیدگی پیدا ہو جانے کا

احتمال ہے۔

” قوموں کی زندگی میں سب سے بیش قیمت سرمایہ اُن کا سیاسی اقتدار ہے۔ بالخصوص ایسی قوم کے لئے جسے آئے دن غنیمت کے حلوں کا ہدف بننا پڑے۔ اور جسے اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہمہ اوقات جدوجہد میں مصروف رہنے کی ضرورت پیش آئے یہ سیاسی قوت جان سے بھی زیادہ عزیز چیز ہے۔ یہی سیاسی قوت ایک ایسا حربہ ہے۔ جس سے یہ قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر غلط پراپاگنڈے کے زور سے۔ یا واقعات و حقائق کو منسوخ کر کے۔ یا اعزاز و مناسبت کا لالچ دے کر۔ یا سیم وزر کی جھلک دکھا کر۔ کسی قوم سے اُس کی سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کی جائے گی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اُس قوم سے گویا حفاظت خود اختیاری کا تمام اسلحہ چھین لیا گیا ہے۔ اور آئندہ اُسے ہمیشہ کے لئے مغلوب و محکوم بنا کر۔ اُس کی خودداری سلب کر لی جائیگی۔ “

” ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کریں۔ کہ ان سٹیمکنڈوں سے ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا خیال بالکل غلط اور فساد انگیز ہے۔ مکرو فریب کی ان مکروہ چالوں سے فریق مخالف کی آواز کو دبایا تو جاسکتا ہے۔ لیکن ان چالوں سے اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ اتحاد کی بجائے عداوت، کدورت اور مخالفت کی آگ پہلے



سے بھی زیادہ تندی کے ساتھ بھڑک اٹھے گی۔ کانگریس کی جاری کردہ  
 "تحریک مسلم رابطہ عوام نے یہ تمام فتنے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لئے  
 یہ بات بلا خوف ترویج کی جاسکتی ہے۔ کہ مسلمانوں میں پاکستان  
 کا تصور پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری اسی اہمقانہ تحریک  
 کے سرعاند سہتی ہے" ۱

ڈاکٹر امبیڈکار بہر حال سیاسی آدمی تھے۔ اب میں ایک ایسے شخص کی رائے  
 پیش کرتا ہوں۔ جو اہل علم کے طبقے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اور جنہوں  
 نے مسلم رابطہ عوام کی تحریک پر بالکل غیر جانبدارانہ انداز سے غور کیا ہے۔ الہ آباد  
 یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ ڈاکٹر بیٹی پرشاد لکھتے ہیں :

"..... انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد۔ جب  
 کانگریس کو چھ صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرنے کی امید نظر  
 آنے لگی۔ تو اس نے مسلم رابطہ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمان  
 عوام کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس تحریک کی بنیاد  
 اس مفروضہ پر تھی۔ کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ اقتصادی اور سیاسی  
 ہے۔ لہذا کانگریس کو سب قوموں کی نمائندہ جماعت بن جانا چاہئے  
 مسلم لیگ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ کانگریس کے برسر اقتدار ہو جانے

---

۱ "PAKISTAN OR THE PARTITION OF  
 INDIA" By Dr. Ambedkar, Page 337

کے بعد، کیا صوبائی حکومتیں اور کیا مرکز کی دفاتی حکومت ادوٹوں  
 جگے سے لیگ کو بے دخل کر دیا جائے گا۔ کانگریس کے ہائی کمان کا ضابطہ  
 اس قدر سخت۔ اور اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی۔ کہ خود کانگریس  
 کے اندر کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہونے کا قطعاً کوئی احتمال نہیں تھا۔  
 اس لئے کو لیٹننٹنم کی وزارتیں بننے کی بھی کوئی توقع نہیں کی جا  
 سکتی تھی۔ کانگریس کے پیش نظر یہ مقصد تھا۔ کہ اقتصادی دریاہی  
 پردگرم کا نعرہ بلند کر کے۔ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیے تاکہ  
 اس طرح سے مسلم لیگ کے پاؤں کے نیچے سے خود بخود زمین نکل جائے  
 یہ درست ہے کہ کانگریس نے اقتصادی اصلاح کا نعرہ بلند کیا تھا  
 لیکن کانگریسی لیڈر اس حقیقت کو فراموش کر گئے۔ کہ انسان صرف  
 روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔

آندھرا یونیورسٹی کے دانش چانسار ڈاکٹریسی۔ آر۔ ریڈی کی اس بارے میں  
 رائے ملاحظہ فرمائیے :

” کانگریس نے مسلم رابطہ عوام کی تحریک جاری کر کے۔ اکیلا در غلطی  
 کا ارتکاب کیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں  
 کو نظر انداز کر کے۔ مسلمان عوام سے براہ راست درخواست کی جائے

” INDIA'S HINDU MUSLIM QUESTION ” (1946)

By Beni Parshad (Page 74)

کہ وہ کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے اس تجویز پر عمل کرنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ کہ مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہو۔ اور ان کے اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر۔ مسلمانوں کو کانگریس میں جذب کر لیا جائے۔

” فرض کیجئے کہ ہندوستان کو سوراج مل جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آپ کسی غیر ملک، مثلاً جاپان سے گنت دشمنید کرتے ہیں، اس صورت میں جاپان کی حکومت کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے گی۔ کہ آپ بالابالا جاپان کے عوام کے پاس جا کر۔ ان سے معاملہ طے کریں۔ اگر آپ نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی۔ تو جاپانی حکومت یہ کہے گی۔ کہ میں جاپان کے عوام کی نمائندہ ہوں۔ جو کچھ کہنا سنا چاہتے ہو۔ مجھ سے کہو۔ اور اگر تم نے مجھ کو پس پشت ڈال کر۔ براہ راست عوام پر ڈور سے ڈالنے کی کوشش کی۔ تو میں تمہارے سفیر کو پیک بینی و دو گوش یہاں سے نکال دوں گی۔“

ان سب باتوں کے باوجود پنڈت ہنر دے ستور اس فریب میں مبتلا تھے کہ مسلمان عوام دل دجان سے کانگریس کے حامی ہیں۔ بس ایک مرتبہ ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ وہ خوشی سے لٹیک کہتے ہوئے۔ بھاگے آئیں گے۔

۱۰ "CONGRESS IN OFFICE"

By Dr. C. R. Reddy (Page 60)

مسٹر جناح اب بھی کانگریس سے آپر و مندانہ مفاہمت کے خواہاں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کانگریس اور لیگ کو مل کر حکومت چلانے کا موقع ملے گا تو فرقہ وارانہ رنجشیں ختم ہو جائیں گی۔ ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ آگے بڑھیں گے۔ اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی منزل روز بروز قریب آنا شروع ہو جائے گی۔ انہوں نے ۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو ایک اخباری بیان میں کہا:

”ہماری پالیسی بالکل صاف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ آئین سے چاہے وہ جیسا کچھ بھی ہے، حتی الامکان پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس پالیسی کے اندر وہ کبھی ہر ترقی پسند جماعت کے ساتھ اشتراک کرنے کو تیار ہیں۔ مسٹر راج گوپال اچاری نے حال ہی میں جس پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ لیگ کی پالیسی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ہم یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ مختلف صوبوں میں وزارتیں اور حکومتیں اس طرح چلائی جائیں۔ گویا گورنر کے خاص اختیارات کا وجود نہیں ہے“۔

۲۰ مارچ کو انہوں نے پھر فرمایا:

”اس وقت ہم ملک میں قومی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد کچھ مشکل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا چاہیے۔ کیونکہ لیگ کا پر وگرام قوم پرستی اور وطن دوستی

۱۹۴۰ء مارچ ۲۰

کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ہم کانگریس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے۔ اور کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کو خوشی تیار ہیں۔ لیکن اگر کانگریس نے انفرادی طور پر ہمارے دوست مسلمان کو، انعام و اکرام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی۔ تو اس کے نتائج چنداں خوشگوار نہیں ہونگے۔

مشر جنجوعہ کے اس ابتہاء کے باوجود کانگریس نے ہتھیہ کر لیا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں میں انتشار پھیلا کر ان کی صفوں کو داہم برہم کرے گی۔ چنانچہ سب سے پہلا حملہ یو۔ پی پر ہوا۔ اور تجویز یہ قرار پائی کہ یو پی کی مجلس قانون ساز کی کانگریس پارٹی کے جلسے میں۔ ان مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا جائے۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اور پھر باہمی گفت و شنید کے بعد۔ وہیں ان سے کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کرانے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیگ اس وقت اپنی ترقی و تنظیم کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گزر رہی تھی۔ اور خود مسلمانوں کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ کانگریس کی رضا فرودوں طاقت کے سامنے مسلم لیگ ٹھہر سکے گی۔ چنانچہ شکست خوردگی کے اس عالم میں بعض لوگ علانیہ کہنے لگے تھے۔ کہ اب کانگریس سے الگ رہ کر کام کرنا یا زندہ رہنا محال ہے۔

مشر جنجوعہ تنہا اس بڑے ہتھے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی کوئی مجلس عاملہ (ورکننگ کمیٹی) نہیں تھی۔ جس کے ممبروں سے بوقت ضرورت مشورہ کر لیا جاتا۔ لیگ کے سالانہ اجتماع کا بھی کوئی

۱۹۳۷ء مارچ ۱۹ء

امکان نہیں تھا۔ اس لئے ہندوستان بھر میں صرف جنگ کی ایک آواز تھی۔ جو ان حالات نامساعد میں کبھی کبھی بلند ہوتی۔ اور مسلمان یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی طرف سے پونے والا بھی کوئی شخص موجود ہے، جب یو۔ پی کی کانگریس پارٹی کی مذکورہ بالا سازش کی اطلاع مسٹر جنرل کو ملی۔ تو انہوں نے فرمایا:

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ یو۔ پی کی کانگریس پارٹی کے ایک اجلاس میں۔ جو ۲۲ مئی کو ہونے والا ہے۔ بعض ایسے مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا گیا ہے جو یو۔ پی کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ اس چال کی غرض و غایت سے یہ بالکل بے خبر ہوں۔ تاہم میں یہ واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر کسی فرد یا چند افراد نے کسی فریق کے ساتھ۔ یا بحد آخر کسی پورے صوبے کے ساتھ بھی۔ کوئی سمجھوتہ کر لیا۔ تو یہ سمجھوتہ عام مسلمانوں کو قطعاً پابند نہیں کر سیکے گا۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ کہ اس قسم کی قابل اعتراض اور ناپسندیدہ حرکتیں محض اس لئے کی جا رہی ہیں۔ کہ مسلمانوں کی قومی جمعیت میں انتشار پیدا ہو۔ ایسے لوگوں کے ساتھ گفت و شنید کرنا۔ جو جلب منفعت کے لئے آج مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ اور جنہیں اپنے ذاتی مفاد کے لئے۔ کل کانگریس میں شامل ہونے سے بھی دریغ نہیں۔ قطعاً سود مند نہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ یو۔ پی کے مسلمان اس نازک وقت میں مسلمان ہند کے خلاف نڈاری نہیں کریں گے۔ فریق ثانی کے ساتھ محض چند افراد کا سمجھوتہ اگرچہ کہ اس سمجھوتے سے دو ایک آدمیوں کو ذاتی فائدہ پہنچے

کا امکان بھی کیوں نہ ہو، ہمارے قومی مسائل کا حل نہیں ہے۔ یو۔ پی  
 اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر خلیق الزمان نے میرے ساتھ وعدہ  
 کیا تھا کہ وہ اپنے ہاں کے حالات سے مجھے مطلع کریں گے۔ میں اُن کو  
 اس سلسلہ میں کئی بار یاد دہانی بھی کرا چکا ہوں۔ لیکن گذشتہ تین ہفتوں  
 کے مسلسل انتظار کے باوجود انہوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔  
 میں اُن کی اس پُراسرار خاموشی کا مطلب سمجھنے سے معذور ہوں۔  
 مجھے اُمید ہے کہ وہ فریقِ ثانی کے ساتھ ایسی کوئی مفاہمت نہیں کریں گے  
 جسے انجام کار اُن کے صوبے ہی کے مسلمان نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان  
 کے مسلمان رد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

”محض چند متفرق افراد یا چند افراد کے کسی گروہ کے ساتھ قومی مسائل  
 کے تصفیے کی گفت و شنید کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں نکلے  
 گا کہ مسلمان قوم کی پوری جمیئت کو درہم برہم کر کے۔ اسے مختلف گروہوں  
 اور صوبائی حد بندیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔“

چھ صوبوں میں کانگریس کی واضح اکثریت کے باوجود آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے  
 فیصلہ کر دیا تھا کہ جب تک ان صوبوں کے گورنر صاحبان واضح اور غیر مشتبہ الفاظ  
 میں اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے کہ وہ اپنے اُن اختیارات کو، جو اُن کے  
 آئین اُنہیں حاصل ہیں، استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے۔ کانگریس ان

۱۔ منقول از ”نیو ٹائمز“ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۳۷ء

چھ صوبوں میں وزارتیں مرتب نہیں کر سکے گی۔ وہ خاص اختیارات کیساتھ صرف یہ کہ گورنر اس بات پر نگاہ رکھے، کہ اکثریت کے ہاتھ سے اقلیت کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔ اور اگر کسی صوبے کی وزارت اپنی اکثریت کے زعم میں کوئی ایسا قانون نافذ کرنے کی کوشش کرے، جس سے اقلیت کے حقوق کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو تو گورنر بطور مصلحت اس قانون کے نفاذ کو روک سکے۔

میری مانے ہے کہ اس بارے میں گورنر مجبور تھے۔ ان کے اختیارات خصوصی ۱۹۳۵ء کے دستور کا ایک جزو تھا۔ جس سے چشم پوشی یا صریح انکار آئینی لحاظ سے بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دلسرائے اور وزیر ہند دونوں نے کانگریس کے اس مطالبہ کو ناجائز قرار دے کر۔ اس قسم کا وعدہ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس نے اپنی اکثریت کے باوجود، وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور ایک نئی کشمکش پیدا ہو گئی۔ جو مسلسل تین مہینے تک چلتی رہی۔ آخر ۷ جولائی ۱۹۳۵ء کو دلسرائے کے ایک بیان سے سطلین ہو کر کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے صوبائی وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی، دلسرائے نے اپنے اس بیان میں اگرچہ صافت، واضح اور قطعی الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ صوبوں کے گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہہ دیا تھا۔ کہ صوبائی نظم و نسق کی حقیقی ذمہ داری وزیرانہ پیمانہ ہوتی ہے۔ اور گورنر ایک آئینی حکمران کی حیثیت سے وزارت کے فیصلے کا پابند سمجھا جائے گا۔ باقی رہا اختیارات خصوصی کا دائرہ۔ اس دائرہ میں گورنر حتی الوسع یہی کوشش کرے گا کہ اس کے اور صوبائی وزیروں کے درمیان



کوئی غیر ضروری نزاع پیدا نہ ہونے پائے۔

مشرقی جٹوں نے کانگریس کے اس تازہ فیصلے کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور فرمایا: "میں خوش ہوں کہ کانگریس نے صوبائی وزارتیں مرتب کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ بحالات موجودہ صوبائی آئین پر کاربند ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں..... مجھے افسوس ہے کہ جہاں تک اپنے آبائے وطن کا سوال ہے کانگریس اپنے راستے میں کسی بیکار اور غیر ضروری تقار کے احساس کو حائل نہیں ہونے دے گی اور صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ نجوشی اشتراک و تعاون کرے گی۔ میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ ہمارا ہاتھ، جو دوستی، تعاون اور اخوت کا ہاتھ ہے، ہر وقت حاضر ہے۔ ہم کانگریس کے ہر اس پروگرام میں شریک ہونے کو تیار ہیں جس کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہے۔ خواہ وہ پروگرام مجالس قانون ساز کے اندر نہ چلایا جائے۔ یا مجالس قانون ساز سے باہر اس کا نفاذ کیا جائے۔ آج ہندوستان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔" اس جملے کی نیک نیتی، خلوص، حب وطن اور سیاسی دور اندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ کہ وہ بار بار اپنا ہاتھ کانگریس کی طرف بڑھاتا ہے۔ اور دوستی

۱۹۳۷ء جولائی ۱۰ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۷ء

تعاون، اخوت اور متحدہ محاذ کا واسطہ دینے دے کر درخواست کرتا ہے، کہ آؤ ہم سب مل کر اپنے وطن عزیز کی خدمت کریں۔ آؤ! ایک مشترکہ پروگرام بنائیں جس سے عوام کی مصیبتیں رفع ہوں۔ آؤ! ایک ایسا محاذ قائم کریں۔ جہاں ہندو اور مسلمان شائد لہنا نہ کھڑے ہو کر بدیشی حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔

ہندوستان کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ کانگریس نے طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر۔ جناح کی اس پیشکش کو رد کر دیا۔ اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اُسکے ارمنانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ کانگریسی لیڈر مسلم رابطہ عوام کی تحریک میں مست تھے اور خیال کر رہے تھے۔ کہ اب جناح سے بات کرنا بے سود ہے۔ عنقریب خود مسلمان جناح کی قیادت کو رد کر کے۔ کانگریس کے حلقہ بگوش بن جائیں گے۔

مسلم رابطہ عوام کی تحریک کا پہلا ثمر یہ تھا۔ کہ کانگریس نے فیصلہ کیا کہ اگر مسلمانوں کے کسی حلقے میں ضمنی انتخاب ہوا۔ تو وہ پورے جوش و خروش سے اپنا اُمید دار کھڑا کرے گی اور مسلم لیگ کا مقابلہ کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا معرکہ بہرائچ (یو۔ پی) میں ہونے والا تھا۔ جہاں سے عام انتخاب میں مسلم لیگ کے ایک ممبر ٹھاکر اصغر علی کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے سے قبل ہی فوت ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بڑے انداز میں فرمایا تھا۔ کہ یہ نشست مسلم لیگ کی ہے۔ اور ہم اسے اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دینگے اُن کے الفاظ یہ تھے :

”بہرائچ کی نشست مسلم لیگ نے جیتی تھی۔ لیکن مجھے سخت افسوس ہے کہ جو ممبر اس حلقے سے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اللہ کو پائیے ہو گئے

ہیں اس نشست پر لازماً قبضہ کرنا چاہیے۔ اس لئے ہم نے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کانگریس بھی اس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر کانگریس نے ایسا کیا تو وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرے گی۔ اب چونکہ آئینِ جدید کو توڑنے کی شق کانگریس کے پروگرام میں سے خارج ہو چکی ہے۔ اس لئے مسلم لیگ اور کانگریس کے پروگرام میں عملاً کوئی فرق باقی نہیں رہا۔" مسٹر جناح کے اس واضح اور غیر مشتبہ اعلان کے باوجود کانگریس نے اپنے ٹکٹ پر رفیع احمد قدوائی کو ہراٹچے کے اس ضمنی انتخاب میں کھڑا کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے کانگریس کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلم لیگ کی یہ سونپیندی یقینی نشست بلا مقابلہ کانگریس کے حوالے کر دی۔

یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے اپنی جیتی ہوئی نشست۔ کیوں مفت میں کانگریس کی مجموعی میں ڈال دی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس وقت عام طور پر یہ افواہ مشہور تھی۔ کہ چودہری خلیق الزمان کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی کامیاب ہوئے ہیں۔ اور چودہری خلیق الزمان ہی کے ایار سے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔ چونکہ اس واقعہ کو بیس بائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے یہ کتاب

۱۹۳۶ء نیوٹانمز۔ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۶ء

لکھتے وقت مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا میرے ذہن سے بعض باتیں نکل گئی ہوں چنانچہ میں نے ڈاکٹر اشرف کو دہلی خط لکھ کر اس بارے میں مزید تصدیق کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ :

”رفیع قدوائی عام انتخابات کے بعد ایک حلقے سے چنے گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی کامیابی میں خلیق صاحب کو بھی دخل تھا۔“

اسی طرح الہ آباد کے حاجی نذیر محمد حسین نے، جو اس زمانے میں کونسل آف سٹیٹس کے نمبر تھے، اپنے ایک طویل بیان میں جو اپریل ۱۹۳۷ء کے تبصرے ہفتے میں ہندوستان کے بعض روزانہ اخبارات میں شائع ہوا تھا، چودھری خلیق الزما پر یہی الزام عائد کیا تھا۔

بہر حال اس سے بحث نہیں۔ کہ کس شخص کے ایسے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا کیا۔ یا کس شخص کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ رفیع قدوائی کے اسمبلی میں داخل ہوجانے کے بعد سیاسیات نے ایک ایسا رخ پلٹا۔ جو ہر اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے پریشان کن اور مسلم لیگ کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا۔

جولائی ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں ایک اور ضمنی انتخاب یو۔ پی میں ہوا۔ اب کی یہ معرکہ جھانسی میں تھا۔ یہاں کانگریس نے نثار احمد، شردوائی کو اور مسلم لیگ

۱۷ نیوٹانمز۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۷ء

نے رفیع الدین کو کھڑا کیا تھا۔ مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور نثار شرمانی کم و بیش ایک ہزار ووٹسے ہار گئے۔

لیگ اور کانگریس کی اس باہمی کشمکش سے دونوں زلفیوں میں بد مزگی بڑھنے لگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے جس متحدہ محاذ کا خواب مسٹر جناح نے دیکھا تھا وہ اس روز انہی کشمکش میں پریشان ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بعض وہ دہلے رکھنے والے لوگوں نے اخبارات کے ذریعے پیڈت ہنر کو تنبیہ کی۔ کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ رابٹ عوام کی تحریک کو بند کر دو۔ اور براہ راست مسٹر جناح سے مفاہمت کر لو۔ لیکن افسوس کہ اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا۔

مئی ۱۹۴۷ء میں مسلم رابٹ عوام کی تحریک نے پنجاب کا رخ کیا۔ اُس کی صورت یہ ہوئی۔ کہ خالد لطیف گابا چونکہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ اس لئے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں اُن کی نشست خالی ہو گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس خالی نشست کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا کی شخصیت، عظمت اور قومی خدمات کے پیش نظر۔ پنجاب کے کسی مسلمان کو اُن کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی جرات نہ ہو سکی۔ امرتسر کے شیخ محمد صادق بیرسٹر اور شیخ حاتم الدین بھی اس نشست کے امیدوار تھے۔ لیکن جوہنی اُنہیں معلوم ہوا۔ کہ مولانا کھڑے ہو رہے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے نام واپس لے لئے۔

البتہ اس موقع پر انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ، کانگریس آگے بڑھی اور

اُس نے مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے میں اپنا امیدوار گھڑا کر دیا۔ یہ امیدوار کون تھا؟ سنیے۔ لاہور میں ٹمپل روڈ پر ایک بزرگ خان بہادر میاں چراغ دین رہتے تھے۔ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایک ریٹائرڈ انسپکٹر تھے۔ اُن کے صاحبزادے میاں عبدالعزیز کانگریس کے امیدوار بن کر سامنے آگئے۔ خان بہادر چراغ دین ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ جن کے پورے خاندان کو سیاست سے دُور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ میاں عبدالعزیز ٹھیکیداری کرتے تھے۔ اور بہت مال دار آدمی تھے۔ تعلیم کے لحاظ سے وہ ٹل پاس بھی نہیں تھے۔ شمول رئیس سونے کی وجہ سے بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ اور کچھ ہی تھوڑا عرصہ قبل آنرییری مجسٹریٹ بننے کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میاں عبدالعزیز کو بیک ایکس امن، چین، تمول اور سرکار پرستی کے خول سے نکلنے اور مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے پر کانگریسی امیدوار بننا دینے کا سہرا میاں افتخار الدین کے سر تھا۔

میاں افتخار الدین اُس زمانے میں نئے نئے کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ اور حُسنِ خدمات کے بدلے، جو اس لال سے جلد از جلد خوشنودی کا پر دہ حال کرنا چاہتے تھے۔ میاں عبدالعزیز چونکہ رائی تھے۔ اس لئے میاں افتخار الدین نے یہی مناسب خیال کیا کہ سب سے پہلے اپنی ہی بہادر سی پرسیا سی ڈاکٹر ڈالین چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال سے کہہ کر میاں عبدالعزیز کو کانگریس کا ٹکٹ دلا دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے۔ کہ گوپی چند بھارگو اور ستیہ پال اس واقعے سے قبل۔ میاں عبدالعزیز کے نام، کام اور شکل و صورت سے بھی

واقف نہ تھے۔ خود میاں افتخار الدین کی اُس وقت یہ حالت تھی کہ وہ صرف دو سال قبل اپنی تعلیم ختم کر کے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ اور سن و سال کے اعتبار سے سنوڑا ہی منزل میں تھے جسے بقول شیخ "جوانی کی داتیں مرادوں کے دن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ و سیاست کے اتار چڑھاؤ مسلمانوں کے قومی مزاج اور مولانا ظفر علی خاں کے شاندار ماضی سے قطعاً بے خبر تھے۔ اسی لئے اُن سے یہ ایسی حرکت سرزد ہو گئی۔ جس سے پورے پنجاب کے مسلمانوں کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا۔ اور سینہ عم و غصہ کا محشر تان بن گیا۔

پنجاب کی ساری امانتیں برادری نے متفقہ طور پر مولانا ظفر علی خاں کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور کانگریس کے فریب خوردہ لیڈروں کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ قبائلی عصبیت کے نام سے مسلمانوں میں تشیت و افتراق کا بیج نہیں بوسکیں گے۔ اِدھر علامہ اقبال نے خان بہادر میاں چراغ دین کو بار بار پیغام بھیجا کہ خُدارا اپنے صاحبزادہ کو سمجھائیے کہ وہ سہو وڈوں کا آلہ کار نہ بنے۔ میاں چراغ دین بڑے ہوش مند بزرگ تھے۔ اُنہوں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ سچی عرض کیا کہ رسمی طور پر چند آدمیوں کا ایک بورڈ بنا دیجئے۔ جو مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کے معاملے میں ثالث یا فیصلہ کن بن کر فیصلہ کرادے۔

ظاہر ہے میاں عبدالعزیز اس غیر سادی مقابلے سے دست بردار ہونے کو بالکل آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے۔ اُن کی یہ خواہش بیجا نہ تھی۔ کہ اس قسم کا ایک ثالثی بورڈ بن جائے۔ جو فریقین میں تصفیہ کرادے

چنانچہ علامہ اقبال نے ملک برکت علی، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا اور بیگم شاہ نواز پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا، جس نے اپنا فیصلہ مولانا ظفر علی خاں کے حق میں صادر کر دیا۔ امدودہ انجام کار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

کانگریس کی اس حرکت سے دو فائدے یقیناً ہوئے۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ جہاں تک مسلمان عوام سے رابطہ استوار کرنے کا تعلق ہے، کانگریس کی جہالت، خود فریبی اور ابن الوقتی کا سمجھنا اعدا عین چوراہے میں پھوٹا۔ جو جماعت اپنے آپ کو انقلاب کی حامی اور برطانوی ملوکیت کی دشمن ظاہر کرتی تھی۔ اور جس کا یہ دعوے تھا، کہ وہ مفلس پس ماندہ عوام کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُس نے اسمبلی کے انتخاب میں مولانا ظفر علی خاں ایسے بطل حریت کے مقابلے میں اُس شخص کو اپنا ٹکٹ دیا، جو ابھی چند مہینے قبل آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ جسے عوامی یا سیاسی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور جس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دولت مند تھا۔ اور کانگریس اُس کی دولت کی آڑ میں اپنا ذاتی کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا، کہ سر سکندر نے سر سٹیجا محسوس کر لیا، کہ اگر کانگریس کی نئی تحریک یعنی رابطہ عوام نے مسلمان قوم کے گھر میں لقب لگائی، تو یونینسٹ پارٹی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یونینسٹ پارٹی ایک مخلوط جماعت تھی، جو ایک خاص قسم کے اقتصادی پروگرام پر قائم کی گئی تھی۔ اُدھر کانگریس بھی ایک مخلوط جماعت ہونے کا دعوے کرتی تھی، جس کا پروگرام اقتصادی اور سیاسی تھا۔ دونوں جماعتیں اپنے آپ کو فرقہ پرستی سے بالاتر سمجھتی تھیں۔ ظاہر ہے کانگریس اور



یونینٹ پارٹی کے باہمی مقابلہ میں۔ یونینٹ پارٹی کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسی لئے جب کانگریس نے پنجاب کے مسلمانوں پر یہ پہلا حملہ کیا۔ تو سر سکندر نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس معرکے میں صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کو بچا سکے گی چنانچہ مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کی اس چیلنج کے دوران میں سر سکندر کے آدمی بار بار ان کا پیغام لے کر۔ بہانے دفتر میں آتے تھے اور خود سر سکندر نے۔ اس سلسلہ میں ملک برکت علی سے خود ملنے اور مشورہ کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا نتیجہ بہت آہستہ آہستہ ہونے لگا۔ اور صوبائی وزارت بن جانے کے بعد۔ جب فقہا کسی قدر صاف ہوئی۔ تو بہانے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ اس صوبے میں مسلم لیگ کی حیثیت کیا ہوگی۔ کیا لیگ محض اُوپر کے طبقے کے لوگوں کا ادارہ بن کر رہ جائے گی۔ یا وہ کسی عوامی جماعت کی صورت اختیار کرے گی؟

الیکشن کے دوران میں ہم نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ مسلم لیگ کا عوام کے ساتھ کوئی ربط و ضبط نہیں تھا اور اکثر و بیشتر لوگ لیگ کے نام اور کام سے باہر نکلنا آشناتھے۔ حالات اس سرعت سے بدل رہے تھے۔ اور واقعات کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی تھی۔ کہ اب کسی سیاسی جماعت کا عوام سے الگ تھلگ ہو کر رہنا قطعاً ناممکن تھا۔ شکل یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی نظام اس وقت تک منظم نہیں ہوا تھا۔ اور خود مسٹر جنرل کی مصروفیتیں اس قدر زیادہ تھیں۔ کہ وہ ہونہار اس کام کی تفصیلات و جزئیات کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم علاوہ اقبال

کی رائے اس بارے میں بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ لیگ کو جلد  
از جلد ایک عوامی ادارہ بن جانا چاہیے۔ اور لیگ کی آواز کا ایک ایک نچے تک  
پہنچے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو  
مسٹر جنرل کو بھی لکھا تھا کہ :

”..... لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ کہ کیا وہ بدستور

ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی

ہے گی۔ یا ان مسلمان عوام کے ایک اجتماعی ادارے کی صورت اختیار

کرے گی۔ جنہوں نے اب تک، بعض معقول وجوہ کی بنا پر۔ لیگ

سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اس سیاسی جماعت کے زندہ رہنے کا سبب کوئی ادارہ

نہیں۔ جو عامۃ المسالین کی حالت سدھانے یا ان کی فلاح و بہبود

کے کاموں کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرتی ہے۔۔۔۔۔ اگر ایسا نہ

مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی ضرورت توجہ نہ کی، تو پھر مجھے یقین

ہے کہ مسلمان عوام بدستور سابق لیگ سے بے تعلق اور غافل

رہیں گے“ ۱

انہی خیالات کے پیش نظر علامہ اقبال نے، اپریل کے دوسرے نصف میں، اسم

لیگ کے چند کارکنوں کو اپنے دولت کدے پر بلایا۔ اور انہیں اس کے تعلق متبرہ

۱ علامہ اقبال کے خطوط جنرل کے نام (محمد اشرف)

کرنے کے بعد۔ صوبائی لیگ کے جنرل سکریٹری کوتا کیدی۔ کہ پنجاب کے مختلف شہروں کا فوراً دورہ شروع کر دیا جائے۔ تاکہ جگہ جگہ لیگ کی مقامی شاخیں قائم کی جاسکیں۔

۲۵ اپریل کو غلام رسول خاں نے پنجاب صوبائی لیگ کا ایک اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں کیا۔ جہاں ملک زمان ہمدانی خاں کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا یہ فرض تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی ضلع دار اور مقامی شاخیں قائم کرنے۔ اور عوام سے لیگ کا ربط و ضبط بڑھانے کی ایک جامع سکیم جلد از جلد مرتب کرے۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں یہ سکیم مرتب ہو گئی۔ جسے علامہ اقبال نے منظور فرمایا اور مئی کے دوسرے ہفتے سے ہم نے پنجاب کا دورہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں بہت سی مشکلات سبب رہیں۔ سب سے بڑی مشکل روپے کی کمی تھی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ ہمیں سے کوئی شخص پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور سیاستدان نہیں تھا ہر ایک کو اپنی اپنی روٹی کمانے کا دھندا اور پیشہ تھا۔ اور عام لیڈروں کی طرح دو دو ہفتے سفر میں رہنا۔ ہمارے لئے بالکل ناممکن اور غارخ از بحث تھا۔ تاہم جون کے آخر تک ہم نے امرتسر۔ جالندھر۔ فیروز پور۔ رتھک۔ لدھیانہ۔ پانی پت۔ انبالہ۔ بھیرہ۔ کیمبل پور۔ گواڑگاؤہ کا دورہ کر لیا۔ اندران مقامات پر لیگ کی ضلع دار مقامی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ اس دورے میں میاں فیروز الدین احمد مرحوم خادم خلافت سے حد مفید اور کارآمدی ثابت ہوئے۔ وہ برسوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے ہمراہ رہے۔ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے

طو طریقوں سے خوب واقف ہو چکے تھے۔

جولائی کے شروع میں یس اور ملک برکت علی ڈاھڑی چلے گئے۔ زمانہ بھدی اپنے گاؤں تشریف لے گئے۔ اور غلام رسول خاں کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی کا مہینہ لاہور میں ٹھہر کر اگست میں کشمیر چلے جائیں گے۔ یہی ڈاھڑی گئے ہوئے مشکل سے دو ہفتے گزرے تھے۔ کہ غلام رسول خاں کا تار گیا۔ کہ فوراً لاہور پہنچو۔ ہم واپس لاہور آئے۔ تو معلوم ہوا کہ فلسطین کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو رائل کمشن مقرر کیا تھا۔ اس کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے جس میں کمشن نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی ہے علامہ اقبال اس فیصلے سے منموم اور رنجیدہ تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ فوراً لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کرے۔ اس تجویز کی مخالفت کرے۔ خود علامہ مرحوم نے رائل کمشن کے اس فیصلے کے خلاف ایک زبردست بیان انگریزی میں لکھا تھا اور ان کا ارشاد تھا کہ یہ بیان جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا جائے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اب تک مسلم لیگ کے اتہام سے لاہور میں کوئی جلسہ عام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ یہ جلسہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء کو ملک برکت علی کی زیر صدارت موچی دروازے کے باغ میں منعقد ہوا۔ لیگ کی عوامی تحریک کا سب سے پہلا اور بڑا کامیاب جلسہ ثابت ہوا۔ اس جلسے میں فلسطین کے متعلق برطانوی حکومت کے لائے کی مذمت کرنے کے علاوہ۔ حکومت پنجاب سے آغا عبدالکریم شورش اور مولانا عبدالکریم آصف کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

شورش میرے کرم فرمائے قدیم ہیں۔ اند اگرچہ انہوں نے اپنی زبانِ قلم و زبانِ دہن کو میرے خلاف استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن انہیں شاید حقیقت

معلوم نہیں، کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سے اُن کی قید و بند کے خلاف پہلی امد  
 آخری مرتبہ جو صائے احتجاج بلند ہوئی تھی، وہ قرارداد میں نے ہی پیش کی تھی۔  
 فلسطین کے متعلق علامہ اقبال کا بیان آج بلاشبہ تبرکات میں شامل کرنا  
 چاہیے۔ یہ بیان اُن کی زندگی کے آخری سال کی اہم ترین تحریروں میں شمار کیا  
 جاتا ہے۔ اصل بیان انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن جلسہ عام میں علامہ رسول بخش  
 نے اُس کا اُردو ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ انگریزی بیان سوائے  
 نیوٹانم کے اور کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اب اُس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

”میں آپ لوگوں کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں، کہ عربوں کے ساتھ  
 جتنا انصافی کی گئی ہے، میں اُس کو اسی شدت سے محسوس کرتا ہوں  
 جس شدت سے ہر وہ شخص اُسے محسوس کرتا ہے جسے مشرقِ قریب کے  
 حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے  
 نہیں گزرنے پایا۔ اور انگریز قوم کو بیدار کر کے، اس بات پر آمادہ کیا جا  
 سکتا ہے، کہ وہ اُن وعدوں کو پورا کرے۔ جو اُس نے انگلستان کے  
 نام پر عربوں کے ساتھ کئے تھے۔ بہر حال یہ امر کسی حد تک موجبِ طہیان  
 ہے۔ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس موضوع پر، حال ہی میں جو بحث  
 ہوئی ہے، اُس میں تقسیمِ فلسطین کے مسئلے کا کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں  
 کیا گیا۔ لہذا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر، مسلمانانِ عالم کو چاہیے، کہ وہ  
 پوری بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کریں، کہ برطانیہ کے مذہبِ برین جس  
 عقدے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اُس کا تعلق صرف

فلسطین تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے عالم اسلام کو بڑی طرح متاثر کر رہا ہے۔

”اگر تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ خالصتاً اور کلیتاً مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیت المقدس میں تشریف لے گئے تھے — اور اس واقعہ پر بھی آج تیرہ سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے — تو ان کی تشریف آوری سے پہلے یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہودیوں کو فلسطین سے زبردستی نہیں نکالا گیا تھا۔ بلکہ جیسا کہ پروفیسر ہالنگز کی رائے ہے، وہ اپنی خوشی سے دوسرے مالک میں چلے گئے تھے۔ اور ان کے صُحُفِ مقدس کا بیشتر حصہ بھی فلسطین سے باہری قوم بند کیا گیا تھا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ فلسطین کا سوال کبھی بیبیوں کا مسئلہ نہیں بنا تھا۔ دورِ حاضر کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں تو اسے پیٹر کا وجود بھی مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا ہے۔ اگر بغرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ صلیبی جنگوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ فلسطین کو مسیحی مسلمان بنایا جائے، تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صلاح الدین کی فتوحات نے ایسی تمام کوششوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا تھا۔ لہذا میری نگاہ میں فلسطین کا مسئلہ سراسر اور کلیتاً مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔“

”مشرقِ قریب کے مسلمانوں کے بارے میں برطانوی شہنشاہیت

کے مذہب ارادوں کو جس بُری طرح مائل کشن تے اس رپورٹ میں  
بے تقاب کیا ہے۔ اُس کی مثال پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ فلسطین کو  
یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ صلیبت  
یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس تقدس اور مذہبی سرزمین پر۔ اپنا مستقل  
اقدام قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لئے ایک نیا ٹھکانہ  
پیدا کر رہی ہے۔ یہ اقدام ایک خطرناک تجربہ ہے۔ اور برطانوی پارلیمنٹ  
کے ایک رکن نے بھی اس کو خطرناک تجربے ہی سے تعبیر کیا ہے۔ بحر  
دوم میں برطانیہ کو جو مشکلات درپیش ہیں۔ یہ تجربہ اُن کو رفع نہیں  
کر سکے گا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ اُن مشکلات کو رفع کرنے  
کی بجائے۔ یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لئے بہت سے نئے  
مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

”عربوں کو جس جس طریقے سے تنگ کر کے اپنی ارض مقدس جس پر  
مسجدِ عمرہ قائم ہے افزودت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اُس میں ایک  
طرف تو مارشل لا جاری کر دینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری  
طرف عربوں کی قومی نیا صنی اور اُن کی روایتی وہاں لوزاری کے  
ہذیبات لطیف کو برا نکینچہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرز  
عمل گویا اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ برطانوی تدبیر کا اب دیوانہ نکل چکا  
ہے۔ یہودیوں کو زرخیز ارضی کی پیش کش کر کے۔ اور عربوں کو  
پتھر پٹی بنجر زمین کے ساتھ کچھ نقد رقم دے کر راضی کرنے کی کوشش

تعلُّا کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنیٰ  
درجے کی حقیر سودے بازی ہے۔ جو یقیناً اُس عظیم الشان قوم کے لئے  
موجب ننگ اور یا عثِ شرم ہے۔ جس کے نام پر عربوں سے آزادی  
کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ اُن کے درمیان ایک  
مشترکہ و متحدہ مذاق قائم کر دیا جائے گا۔

"میں اس مختصر سے بیان میں رائل کمشن کی رپورٹ کے تمام  
پیلوڈوں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں۔ تاہم یہ عرض کرنا  
ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانہ حال کی تاریخ سے بعض  
بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہئیں۔ تجربے نے یہ بات روزِ روشن کی  
طرح واضح کر دی ہے کہ مشرقِ قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی  
بقا صرف اس راز پر مضمرب ہے۔ کترکوں اور عربوں کا اتحادِ حلدانہ  
جلد قائم ہو جانا چاہیے۔ مجھے اشنوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کو عالم  
اسلام سے جدا کر دینے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے  
اس قسم کی خبریں بھی سننے میں آ جاتی ہیں۔ کہ ترک اسلام سے منحرف  
ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا  
گیا ہوگا۔ اس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پراپاکنٹے کا شکار  
بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اسلامی فتنہ اور اسلامی ہمدلی  
قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔

"یہ عرب ہی تھے۔ جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا جس نے



آگے چل کر ایشیا کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لئے عربوں کو چاہیے۔ کہ وہ ان نتائج کو سہرگزدہ فراموش نہ کریں۔ جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے استلار اور مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”دوسرا سبق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ عربوں کو چاہیے۔ کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں۔ کیونکہ بحالات موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت سہرگزدہ اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی مناسب نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

”تیسرا سبق یہ ہے۔ کہ آج منہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیت و غیرت کا امتحان ہے۔ خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب۔ منصبِ خلافت کی تینخ کے بعد۔ عالم اسلام کے لئے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے۔ اور جس سے سب سے زیادہ آہٹ کے نئے زمانے کی طاقتیں امدتاً تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔“

”بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی

ممالک کو اس اینگلو فرانسیسی ادارے سے، جسے غلطی سے جمعیتِ  
اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بدگمان و برگشتہ کر دے۔  
کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے اقوامِ مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت قائم  
کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔“

---

۲۲۲

.

•

# کانگریسی راج

جب مئی ۱۹۳۷ء میں ہم نے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا۔ کہ مسلم لیگ کا وہ کون سا پیغام اذہر و گرام ہے۔ جو عوام تک پہنچایا جائے گا۔ الیکشن ختم ہو چکے تھے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہو گئی تھی۔ اور کانگریس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں نظر نظام ہمارا سب سے بڑا ہدف یونینسٹ پارٹی ہی کو ہونا چاہیے تھا۔ الیکشن کے دوران میں ہمارا مقابلہ صرف یونینسٹ پارٹی سے تھا۔ سٹر جناح نے بھی انتخابات کے معرکے کا افتتاح کرتے وقت یونینسٹ پارٹی ہی کو مسلم لیگ کی حریف جماعت قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ یونینسٹ پارٹی ہی تھی۔ جو مخلوط جماعت ہونے کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوے کرتی تھی۔ اس دوران میں البتہ ایک تبدیلی ایسی ضرور ہوئی تھی۔ جس نے ہماری توجہ کو یونینسٹ پارٹی سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیا تھا۔ اس

تبدیلی کا مفصل ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ یعنی کانگریس نے....  
 .... مسلم رابطہ عوام کی تحریک جاری کر کے۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے۔ اہل ان کی  
 جمعیت میں رخنہ ڈالنے کی مذموم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ان کوششوں  
 کا ازالہ بھی بے حد ضروری تھا۔

باایں ہمہ جب ہم نے مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کی غرض سے پنجاب کا  
 زور شروع کیا۔ تو ہم اپنی تقریروں میں انرا "یونینسٹ پارٹی" ہی کو اپنے حلوں  
 کا نشانہ بناتے تھے۔ یہیں یقین تھا کہ کانگریس سے نہپٹ لینا کچھ زیادہ مشکل  
 نہیں۔ سب سے بڑا فتنہ یونینسٹ پارٹی کا وجود تھا۔ جس نے پندرہ سال سے  
 پنجاب کے مسلمانوں کو سیاسی بیداری سے محروم کر رکھا تھا۔ اور جس نے شہری  
 اور دیہاتی کی مصنوعی تقسیم پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ کھرا کر دیا تھا  
 اس کے علاوہ اس میں یہ بھی یقین تھا کہ جب تک یونینسٹ پارٹی کی قسم کی مخلوط  
 جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو کانگریس کی یورش سے بچانا آسان  
 نہیں۔ بہر حال جون کے آخر تک ہم نے جگہ جگہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف تقریریں  
 کیں۔ اس پارٹی کی سہیت ترکیبی اور پالیسی کی جی کھول کر مذمت کی۔ اور اس  
 کو مسلمانوں کی فوجی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ ان جلسوں  
 میں عوام بڑی خوشی سے شریک ہوتے۔ اور عورتوں سے ہماری تقریریں سنتے تھے۔ اور  
 جلسے کے بعد بعض لوگ سوال بھی کرتے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ عوام  
 میں سیاسی شعور پیدا ہوا تھا۔ سرسکندر جیات خاں تک ان جلسوں اور تقریروں  
 کی سرکاری رپورٹیں باقاعدہ پہنچ رہی تھیں۔ اور وہ سخت متفکر تھے۔ کہ اگر

مسلم لیگ کے کارکنوں کو یونین کھلی چھٹی ملی رہی۔ تو یہ لوگ انڈر ہی انڈر اُن کی وزارت اور یونینٹ پارٹی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔

یہ صورت حال تھی۔ جب کانگریس نے ہندوستان کی بساط سیاست پر ایک ایسی خطرناک اور غلط چال چلی جس نے حالات و واقعات کا رخ یکسر بدل دیا ۹ جولائی ۱۹۳۷ء کو کانگریس نے وزارتیں قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اے۔ پی۔ اے۔ پی۔ سی۔ پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور اڑیسہ میں کانگریس کو موقع حاصل تھا۔ کہ وہ اپنی اُس قومی پالیسی کا نفاذ کرے۔ جس کا وہ برسوں سے دعویٰ کرتی آرہی تھی الیکشن سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ نے جو بیٹی فریڈوشالٹ کئے تھے۔ اُن سے صاف عیاں ہوتا تھا۔ کہ ان دونوں جماعتوں کے تعمیری اور سیاسی پروگرام میں چنداں فرق نہیں ہے۔ خود مسٹر جتوہی و صاحبت سے فرما چکے تھے کہ مسلم لیگ۔ کانگریس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہے۔

پروفیسر کوٹپ لینڈ لکھتے ہیں کہ :

”مسلم لیگ نے اپنے مینی فیسٹو میں جس معاشرتی پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ کانگریس کی معاشرتی پالیسی سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ صنعت و حرکت کی ترقی۔ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور کاشتکاروں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کا پروگرام ان تمام امور میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان آئی اتفاق تھا سیاسی اور میں ہی ان دونوں جماعتوں کے درمیان بظاہر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ کانگریس کی طرح مسلم لیگ بھی شخصی آزادی کی

علم بردار۔ اور تمام جاہلانہ و متشددانہ قوانین کی تفسیح کی حامی تھی۔ فیڈریشن کی مخالفت میں بھی۔ مسلم لیگ نے کانگریس کی طرح پوری شدت سے ہوا زبند کی تھی۔ صوبوں کی حکومت خود اختیاری پر بھی مسلم لیگ نے قوم پرستانہ نقطہ نگاہ سے سخت اعتراض کئے تھے۔ اگرچہ اس بات کی حامی تھی۔ کہ یہ حکومت خود اختیاری، بڑی بھلی جیسی بھی ہے، اس سے پورا فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔“

آگے چل کر پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ :

”مسلم لیگ کے مینی فیسٹو کا اہم حصہ وہ تھا۔ جہاں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ لیگ کانگریس کے ساتھ اشتراک و تعاون کرے۔ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی۔ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کو نہ صرف سندھستان کی دستوری دہائی تاریخ کا ایک درخشاں باب قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ یہ میثاق گویا اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ ماضی میں سندھستان کی دو سب سے بڑی جماعتوں نے نگر و عمل کی وحدت اور اشتراک و تعاون کا کیا زبردست نمونہ پیش کیا تھا۔ اس میثاق کے بعد مسلمانوں نے ہمیشہ آزادی وطن کی تحریک میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ حصہ لیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ نئے دستور میں ایک اقلیت کی حیثیت سے اُنھیں تحفظات درکار ہیں۔ یقیناً فرقہ پرستی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص تاریخ عالم سے واقف ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ مطالبہ بالکل

طبعی اور فطری تھا۔ اور اس مطالبے کو قبول کر لینا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اقلیتوں کا دلی تعاون۔ اور ان کی خیر سگالی حاصل کرنے کا اس سے بہتر طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ اقلیتیں پورے اطمینان سے اکثریت پر اعتماد کر کے اپنی تقدیر اُسکے ہاتھوں میں سونپ سکیں۔

” جو لوگ میثاقِ لکھنؤ کی غرض و غایت سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں۔ کہ کانگریس نے اس موقع پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کی رعایت منظور کر دی تھی۔ وہ مسلم لیگ کے معنی فیٹو سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے۔ کہ ۱۹۱۶ء کی طرح مسلم لیگ پر کانگریس سے رشتہٴ اخوت استوار کرنے کی خواہاں تھی۔ مسٹر جناح کو ایک مرتبہ خود کانگریسی لیڈروں نے ”سندھ مسلم اتحاد کا سفیر“ کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج وہی جناح ان سے صرف ایک رعایت کا طلبگار تھا۔ تاکہ سندھوستان کی ان دو سب سے بڑی جماعتوں میں مضبوط دستہ قائم ہو سکے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں سندھ مسلم اتحاد کو جوٹو شگوار فضا سے طبع کی دستوں سے پیدا ہو چکی تھی۔ اس فضا کو صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟ کیا اس قسم کے خوش آئند اقدام سے سندھوستان کی وحدت اور انجام کار سندھوستان کی آزادی کے حصول کا سب سے بڑا مرحلہ نہ ہو جاتا؟“



"یہ ایک امر واقعہ ہے۔ کہ مسلم لیگ کا مینی فیسٹو اشتراک و تعاون

کی ایک کھلی ہوئی دعوت تھی۔ اور اگر کانگریس لیڈر اس دعوت کو قبول

کر لیتے تو آئندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات - اور

ہندوستان کے دستوری معاملات بالکل مختلف صورت - اور قطعی

طور پر جداگانہ رنگ اختیار کر لیتے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ انتخابات

سے قبل کانگریس اور لیگ کے باہمی اتحاد کی توقعات بہت بہت

انزائشیں۔ اگرچہ کانگریس اپنی قومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے۔

مسلمانوں کی نمائندگی کا بھی دعویٰ کرتی تھی۔ لیکن کم از کم انتخابات

کے دوران میں لیگ اور کانگریس کے درمیان منافہت پیدا ہو گئی

تھی۔ سو بجا بہت متحذہ ہیں تو لیگی اور کانگریسی لیڈر بہت بکا نکت

آمیز طریقے سے ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنے لگے تھے"۔

پروفیسر کوپلینڈ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ وہ آکسفورڈ میں تاریخ کے محکم

تھے۔ اور ان کی ساری زندگی علمی کاموں میں بسر ہوئی ہے۔ انہوں نے

ہندوستان، بالخصوص برطانوی دور کے ہندوستان پر جو تاریخی تحقیقات

کی ہے۔ اس کا خلاصہ نہایت قابل قدر کتابوں کی صورت میں موجود ہے

ان کا انداز فکر محققانہ اور غیر جانبدارانہ ہے۔ تاہم میں اس ضمن میں دوا ایک

INDIAN POLITICS (1936-1942)

By SIR REGINALD COUPLAND pages 14-15

باتوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ اقتباس میں ایک یہ فقرہ بھی موجود ہے۔ کہ :

”کیا یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو خوشگوا  
نصا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اس نفا کو اسی  
صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا“

یہ فقرہ بڑا بلیغ، معنی خیز اور حقائق آموز ہے۔ اس فقر کے پیچھے ہندوستان کے ایک خوشگوار دور کا ایک نہایت رُوح پرور باب ہمیں دعوتِ غور و فکر سے رہا ہے۔ اور جب تک ہم اُس باب کا اچھی طرح مطالعہ نہ کر لیں۔ ہم پر ایک طرف تو جناح کی عظیم الشان شخصیت کے بعض دلآویز پہلو منکشف نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف ہم اُس ٹریجڈی سے بھی کما حقہ آشنا نہیں ہو سکتے۔ جو کانگریسی لیڈروں کی بہت دسہری، ہند اور مصلحت ناشناسی سے ہندوستان پر نازل ہوئی۔

مسٹر جناح دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر واپس ہندوستان نہیں آئے تھے بلکہ انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور غالباً اُن کا ارادہ وہیں مستقل قیام کرنا کا تھا۔ ایک طرف تو وہ برطانوی حکومت کے ہتھکنڈوں سے سخت نالاں تھے اور دوسری طرف ہندو مسلم مناقشے نے انہیں بہت آزر دہ کر رکھا تھا۔ تاہم بعض حالات و واقعات کی بنا پر وہ ۱۹۳۷ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اور آتے ہی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی انڈی پیڈنٹ پارٹی کو دوبارہ زندہ کیا۔

۱۹۳۴ء کی مرکزی اسمبلی میں مختلف پارٹیوں کے عمبروں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

کانگریس	۴۴	نیشنل پارٹی	۱۱
انڈی نیشنل پارٹی	۲۲	یورپین	۱۱
سرکاری بلاک	۲۶	نامزد ممبر	۱۳

اس نکتے کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ کانگریس اور

نیشنلسٹ پارٹی کی مجموعی طاقت ۵۵ - اور حکومت کے حامیوں کی رجن میں یورپین بھی شامل کئے جاسکتے ہیں)۔ ۵ ممبر تھے۔ کانگریس اور حکومت کی اس باہمی آویزش میں مسٹر جناح کی انڈی نیشنل پارٹی کو ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ اگر یہ پارٹی حکومت کا ساتھ دیتی۔ تو کانگریس کو کسی معرکے میں بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اور اگر یہ پارٹی حکومت کے خلاف ووٹ دیتی۔ تو کانگریس کو ہر قدم پر کامیابی نصیب ہوتی۔

آئیے دیکھیں۔ کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی پارٹی نے کیا روش اختیار کی۔ اور کیا اس روش کو وطن دوستی و قوم پرستی کے نقطہ نگاہ سے قابل اعتراض کہا جاسکتا ہے۔ یا فخر و مباہات کی مستحق؟

اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ۲۱ جنوری سے ۹ اپریل ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ اور اس اجلاس میں ہندوستان کے قوم پرست عنصر نے، جس میں جناح اور کانگریس دست بدست شامل تھے، حکومت کو پے درپے شکستیں دیں۔ پہلی شکست سرت چندر بوس کی نظر بندی کے خلاف تحریک التوا پر ہوئی۔ دوسری شکست انڈو برٹش تجارتی معاہدہ کی تینخ پر ہوئی۔ تیسری شکست خدائی خدمت گاروں کی

کی تحریک کو خلاف قانون قرار دئے جانے پر ہوئی۔ چوتھی شکست ریلوے بجٹ پر تخفیف زر کے سلسلے میں ہوئی۔ پانچویں شکست کراچی میں پبلک پروگولی چلائے جانے کے خلاف ہوئی۔ چھٹی شکست سالانہ بجٹ کو مسترد کئے جانے پر ہوئی۔ اور ساتویں شکست وائسرائے کے اختیارات خصوصی سے منظور شدہ بجٹ کو دوبارہ مسترد کئے جانے پر ہوئی۔

جب اسمبلی کے پہلے اجلاس ہی میں حکومت کو یکے بعد دیگرے سات شکستیں ہوئیں۔ تو نئی دہلی سے لے کر لندن کے وائٹ ہال تک ایک کھلسلی چمکنی حکومت پریشان تھی اور ہر طرف کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح جناح کو کانگریس سے علیحدہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے پنجاب کے دو مسلمان ممبر بڑی آسانی سے حکومت کے ہاتھ بک گئے۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح نے اپنی پارٹی کے شیرازے کو بڑی سہر مندگی سے مجتمع کئے رکھا۔ سٹیٹسین جیسا بادشاہی اخبار بھی اس سیرتِ حالات پر بوجھلا گیا تھا۔ اس نے جناح کے خلاف ایک ادارہ لکھتے ہوئے۔ نہایت اوجھے انداز میں کہا کہ

..... ” ہمیں اس بات اور نمایاں حقیقت کو تسلیم کر لینے

میں کوئی تاامل نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ہندوستان کے سیاست دانوں اور صنعت کاروں کا ایک زبردست طبقہ برطانیہ کے خلاف ہے یہ طبقہ برطانیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کا حامی نہیں ہے۔ اور نہ تجارتی اور کاروباری معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ رنج و بغض کی بنا پر بذاتی فوائد

سے دستبردار ہو جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کانگریس پارٹی کو  
 ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس پارٹی کا سب سے بڑا  
 حربہ نسلی منافرت کا جذبہ ہے۔

وہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ کانگریس کو وقتاً فوقتاً ایسے حامی بھی  
 مل جاتے ہیں۔ جو برطانیہ کے ساتھ دشمنی رکھنے کی بنا پر کانگریس  
 کے ہم خیال سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً مسٹر جناح۔ جو اب تدار میں گول  
 میز کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن۔ اور فیڈریشن کے بڑے پُر جوش  
 حامی تھے۔ لیکن چونکہ انھیں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں  
 میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اب وہ حکومت سے ناراض ہیں  
 مسٹر جناح بیک وقت ریڈکشتیوں میں سوار ہیں۔ اُن کا ذاتی  
 رجحان مخلوط انتخاب کی طرف ہے۔ اور اُن کی خواہش ہے کہ  
 نشستوں کے تحفظ کا اصول منظور کر۔ سندھوؤں سے مخلوط انتخاب  
 کی بنا پر منافرت کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے  
 لیڈر بھی ہیں۔ اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ مخلوط انتخاب  
 قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اور نہ کانگریس کے ساتھ مل کر اصلاحات  
 کی مخالفت کرنا اُنہیں منظور ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اُن چودہ  
 نکات کے حامی ہیں۔ جو مسٹر جناح کے نام سے منسوب تو سوچنے  
 ہیں لیکن جنہیں مسٹر جناح کے دل کے ساتھ منداں مناسبت نہیں ہے۔

۱۲  
 لہ روزنامہ سٹیٹسین۔ مورخہ ۲ فروری ۱۹۳۵ء۔

اسمبلی کا دوسرا اجلاس ۲ ستمبر ۱۹۳۵ء سے ۲۵ ستمبر تک صرف ۲۴ روز جاری رہا۔ اس میں بھی حکومت کو دو شکستیں ہوئیں۔ پہلی شکست قبائلی علاقے پر یکم باری کے خلاف۔ اور دوسری شکست مسودہ قانون فوجداری کی ترمیم پر ہوئی۔ مسودہ قانون فوجداری کی ترمیم پر ایوان میں تین روز بحث ہوئی رہی۔ حکومت نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بعض مسلمان نمبروں کو اپنے ساتھ بلائے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن جناح کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ آخر اکہتر اور اگٹھ دو لوگوں کی تقسیم سے حکومت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۳۶ء کا اجلاس بھی بڑا پُر خروش تھا۔ اس اجلاس میں حکومت کو یکے بعد دیگرے چھ شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شکست سو بھاش چنڈر بوس کے بارے میں ہوئی۔ جن کا ہندوستان میں داخلہ حکومت نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ اور دوسری اہم شکست اٹاوا پیکٹ کو ختم کئے جانے کی تحریک پر ہوئی۔ قانون فوجداری کے ترمیم شدہ مسودے کی طرح حکومت نے اٹاوا پیکٹ کو بچانے کی بھی سر توڑ کوشش کی تھی۔ لیکن مسٹر جناح کی دھواں دھار تقریر کے بعد انڈی پنڈنٹ پارٹی کے سر رکن نے حکومت کے خلاف ردیٹا دیا۔ اور انجام کار صرف پانچ دو لوگوں کی کثرت سے حزب مخالف کو فتح ہوئی بجٹ کو اس مرتبہ بھی مسترد کروایا گیا تھا۔ جسے وائسرائے نے اپنے اختیار استِ خصوصی سے منظور کیا۔ پروفیسر کوپ لینڈ اس صورت حال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں دونوں مرتبہ اسمبلی نے بجٹ مسترد

کر دیا تھا۔ اور مجبوراً دائرہ سرائے کو اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر بجٹ منظور کرنا پڑا۔ ان دو برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مقدمات ہو کر ہیں شدت سے حکومت کی مخالفت کی۔ اور جس برس ہی طرح اُسے پریشان کیا۔ اُس کی مثال پہلے کبھی ہندوستان کے قوم پرست طبقے نے پیش نہیں کی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ۲۴ مواقع ایسے پیش آئے ہیں۔ جب اسمبلی کے دستروکے ہوئے قوانین کو حکومت نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر منظور کیا ہو۔ ان چوبیس میں سے آٹھ مواقع صرف ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں رونما ہوئے۔

”ہر چند کہ اس دفعہ ہندو یا مسلمان لیڈروں نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے کوئی اسپیل شائع نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے دارالسلطنتِ دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ قبل ازیں جب کبھی ہندوستان میں نئی اصلاحات کے نفاذ کا وقت قریب آتا تھا۔ تو حقوق کے بڑھانے کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن اب کہ صوبوں میں پہلی مرتبہ مکمل اور مرکز میں جُزوی طور پر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ فرقہ وارانہ تعلقات میں کسی قسم کی غیر معمولی تلخی کے آثار نظر نہیں آتے تھے“۔

INDIA: A RESTATEMENT, page 151

پروفیسر کوپ لینڈ کی حیرت بجا ہے کہ گاندھی اور جواہر لال دونوں خاموش تھے کسی نے بھی ہندو مسلم اتحاد کی اپیل شائع نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود مرکز سلطنت دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ جس کی زندگی بخش شعاعیں خود بخود سندھستان کے دور دراز علاقوں میں پھیل رہی تھیں۔

راتم التحریر ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کا زمانہ یاد ہے۔ جب پورا سندھستان جناح کی آواز پر کان لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ جب جناح قوم پرست ہندوؤں کی آنکھ کا تار ایتنا ہوا تھا۔ اور جب مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیوانی نے مسلم یونیورسٹی ضلعی گدڑھ میں تقریر کرتے ہوئے۔ کانگریس پارٹی کی تمام کامیابیوں کا سہرا مسٹر جناح کے سر باندھا تھا اس ماحول اور اس فضا میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپریل ۱۹۳۶ء میں اپنا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کیا تھا۔ جہاں صدر مخدوم نے اپنے خطبے میں فرمایا تھا۔ کہ

”..... برطانوی پارلیمنٹ زبردستی ہم پر ایک ایسا آئین نافذ نہیں رہی ہے۔ جسے کوئی شخص نہ پسند کرتا ہے۔ اور نہ منظور کرتا ہے۔ مسلسل کئی سال تک حکومت نے ہمیں کمیٹیوں، کانفرنسوں، رپورٹوں اور کمشنوں کے چکر میں اُلجھائے رکھا۔ اور اب اس چکر میں سے ایک ہٹوا نکلا ہے۔ جسے کانسی ٹیوشن ایکٹ کا لباس پہنا کر ہندوستان کو پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ آئین سراسر غیر جمہوری ہے جس سے ہندوستان کے رجعت پسند عنصر کے ہاتھ پہلے سے بھی



زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم آئندہ ترقی  
پسندانہ راستے پر گامزن ہو سکیں۔ یہ آئین جمہوریت اور آزادی کی  
ساری رُوح کو کچل کر رکھ دے گا۔“

کیا کانگریس کا بڑے سے بڑا "باعنی صدر" بھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بارے میں  
اس سے زیادہ تلخ لہجہ یا ان سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟۔ خود  
مسٹر جناح نے، ۲۹ فروری ۱۹۳۵ء کو سندھوستان کی مرکزی اسمبلی میں، اسی موضوع  
پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”... برطانوی حکومت نے ہم پر یہ آئین ٹھونسنے کا ہضم ارادہ  
کر لیا ہے۔ حالانکہ جس طرح میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں اسی  
طرح خود برطانوی حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں، کہ یہ نیا آئین  
اس آئین سے جو اس وقت رائج ہے، کہیں زیادہ لغو ہے۔ پھر  
سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت اس آئین کو ہماری مرضی کی خلاف  
کیوں ہم پر مسلط کرنے پر تلی ہوئی ہے؟“

”اگر یہ آئین جدید ہمارے ملک میں رائج ہو گیا، تو مجھے یقین ہے  
کہ اس کے نتائج نہایت خراب نکلیں گے۔ برطانوی سندھ اس تمام  
ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جو اس نے اب تک اپنے یہاں نائنہ حکومت  
قائم کرنے کے سلسلے میں کی ہے۔ اس آئین کے بارے میں سندھوستان  
کے کسی صوبے سے، بحیثیت موجودہ مشورہ نہیں کیا گیا۔ نہ کسی صوبے  
سے استفسار کیا گیا ہے، کہ آیا وہ سندھوستان کے متحدہ وفاق میں

اُن شرائط پر شریک ہونے کو تیار ہے۔ جو دالیان ریاست یا حکومتِ برطانیہ نے۔ اپنی صوابدید سے وضع کی ہیں۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آئین اس قدر ناقص ہے۔ کہ اس سے نہ تو کسی کی تسلی ہوتی ہے۔ اور نہ کسی کے قابل ترین مطالبات منظور ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

”جناب ڈالا! اگرچہ ہم بے بس ہیں۔ لیکن ہماری خودداری کا تقاضا ہے۔ کہ ہم آگے قدم بڑھا سکیں۔ ہم نے اس سکیم کا بخور مطالعہ کیا ہے۔ اور ہم اسے کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ میں اپنی رائے کے اظہار میں کسی قسم کے تاثر یا لپس و پیش کو رد نہیں رکھتا۔ مجھ کو یہ کہہ کہہ دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ کہ کیا تم ہمیشہ تاریکی میں ٹانگ لٹائیے مارنا پسند کر دو گے؟ میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی دھمکیاں بے کار ہیں۔ ممکن ہے کہ حکومت پھر بوجھے۔ کہ بہت اچھا۔ بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟ میرا جواب سن لیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبائی حکومت کی مجوزہ سکیم میں ترمیم کی جائے۔ مرکزی حکومت کی سکیم کو یکا نام ترک کر دیا جائے۔ اور سندھ و ستان کے اہل الرائے اصحاب کے سنورے سے پوری سکیم پر اس طرٹ نظر ثانی کی جائے۔ کہ برطانوی ہند میں جلد از جلد مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو سکے۔“

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو مؤرد و مقہور قرار دینے۔ اور سندھ و ستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کے لئے۔ مہر جناب کانگریس کے ہم نوائے۔ اگرچہ

۱۹۲۸ء میں وہ کانگریس کی احسان فراموشی تنگ دلی اور سہڈوانہ ذہنیت کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب تک اس بات کے آبدومند تھے کہ مسلمانوں کے لئے چند تحفظات منظور ہو جائیں۔ تو وہ دل و جان سے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی وطن کا متحدہ محاذ قائم کریں۔ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس میں آگے چل کر انہوں نے کہا۔

..... ” میرے ممتاز دوست نے فرمایا ہے کہ پہلے اقتدار حاصل

کر لیا جائے۔ پھر اس کا بٹوارہ سہی ہوتا ہے گا۔ معاف فرمائیے گا۔ یہ

ماتے میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں کہ

پہلے حصول اور پھر تقسیم ہو۔ ہم تعیناً راضی کا کوئی قطعہ نہیں خرید

رہے۔ نہ کوئی تجارتی یا کاروباری ہم شروع کر رہے ہیں۔ کہ بعد

میں اس کا منافع تقسیم کرنے بیٹھیں گے۔ اگر معاملہ یہی ہوتا کہ پہلے

مطلوبہ چیز حاصل ہو۔ اور پھر اس کے حقے بخرے گئے جائیں۔ تو بتائیے

کہ ہاتھ لگانے والی نے مرن بھرت کیوں دکھانتا؟ کیوں انھوں نے

سہڈوستان کے تمام لیڈروں کی رضا مندی اور منظوری سے اچھوتوں

کے ساتھ وہ معاہدہ کیا تھا جو پونا سکیٹ کے نام سے مشہور ہے؟ (لغزہ

ہائے تحمین) کیوں اچھوتوں سے صاف صاف نہیں کہہ دیا گیا تھا

کہ پہلے آزادی حاصل کر لیے۔ پھر بعد میں ہوتا رہے گا؟

(لغزہ ہائے تحمین)

”میں سمجھتا ہوں کہ ہاتھ لگانے والی اپنے اس فعل میں بالکل حق بجانب تھی

وہ جلتے تھے۔ کہ یہ پانچ چھ کروڑ انسان دراصل ہندو قوم ہی کا ایک جزو ہیں  
 میں نے خود انگلستان میں ہاتما گاندھی سے درخواست کی تھی۔ کہ اچھوتوں کے  
 ساتھ مفاہمت کر لیجئے۔ انہوں نے ابتدا میں میری بات ماننے سے انکار کر دیا  
 اور کہا کہ وہ اچھوتوں سے الگ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں  
 کیونکہ اس طرح ہندو سماج میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نے بار بار  
 درخواست کی۔ اور یقین کیجئے کہ میں نے مسلمانوں سے زیادہ اچھوتوں  
 کے لئے ہاتما گاندھی سے التجائیں کی تھیں۔ شروع میں تو وہ نطس  
 سے ٹس نہ ہوتے تھے۔ لیکن آخر کار انہوں نے معاملہ کی اہمیت سمجھ لی  
 تو آمادہ ہو گئے۔ میں اپنے ہندو بھائیوں کو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔  
 کہ انہوں نے قومی تحفظات عطا کر کے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔  
 اور یہ کس قدر خوشی کا مقام ہے کہ ہاتما گاندھی اب بھی انکی بہتری  
 کے لئے کام کر رہے ہیں۔

” میں آپ سے کہتا ہوں۔ کہ ہائے ساتھ کبھی اسی رواداری اور اسی  
 مصالحت کا سلوک کیجئے۔ ہمارا ہاتھ حاضر ہے۔ یہ دوستی اور اخوت کا  
 ہاتھ ہے۔ آپ بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے۔ ہم اتنا دیکھنے بالکل  
 تیار ہیں“

۱۰ سٹریٹ نے انہی اس تقریر میں گاندھی جی کے لئے التزام اور احترام ہاتما گاندھی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور  
 ہندوؤں کو HINDU BROTHERS کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ انکو محض ایک سرسری بات سمجھ کر  
 نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہ خیر سٹریٹ کے اس وقت کے جذبات و خیالات کی آئینہ داری کیلئے کافی ہے۔

مجھے لندن میں دو بڑے ذمہ دار انگریزوں سے ملنے۔ اور مسٹر جنرل کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن ہیں ایکس لارڈ جوونٹ اور دوسرے لارڈ ٹمپل۔ وہ ہیں لارڈ جوونٹ انگلستان کے بڑے نامور قانون دان تھے اور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۱ء تک لارڈ چانسلر کے محرز ترین عہدے پر فائز رہے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے بعد جب مسٹر جنرل لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ تو لارڈ جوونٹ بھی اُن دنوں یہاں پر یکیش کرتے تھے۔ اور مسٹر جنرل سے اُن کے مراسم نہایت اچھے تھے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں اُنکا انتقال ہوا۔ میں نے لارڈ جوونٹ میں ایک ملاقات میں یہ دریافت کیا تھا کہ ”۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک جب آپ کو مسٹر جنرل سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ تو مسٹر جنرل کے سیاسی خیالات کس قسم کے تھے؟“

لارڈ جوونٹ نے جواب دیا کہ ”مسٹر جنرل برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور تین سال کے عرصے میں میں نے کبھی اُن کی زبان سے ہاتھ کا ندھی۔ انڈین نیشنل کانگریس پاسند و قوم کے خلاف ایک لفظ نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ برطانوی حکومت کی

۴ LORD JOWITT.

۲ انگلستان میں دارالعوام کے صدر کو سلیکچر اور دارالامرار کے صدر کو لارڈ چانسلر کہتے ہیں لارڈ چانسلر کی حیثیت سے وہ پرلوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کی صدارت بھی کرتا ہے۔ اور دارالامرار کی اس منتخب کمیٹی کا جو انگلستان کی سب سے اعلیٰ عدالت اپیل ہے، صدر بھی وہی ہوتا ہے۔ ۲۰ ویں کورٹ کے ججوں کا تقریباً س کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے محکمہ ٹریڈوں کا تقریباً براہ راست وہ خود کرتا ہے۔

پالیسی کی مذمت کرتے تھے۔“

کم و بیش اپنی خیالات کا اظہار مجھ سے لارڈ ٹمپل وڈ نے کیا تھا جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک سر سیمونیل ہوور کے نام سے وزیر ہند رہ چکے ہیں۔ لارڈ جونٹ اور لارڈ ٹمپل وڈ کی رائے کو میں بالکل صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔ ۱۹۳۲ء کے آخر میں جب مسٹر جناح واپس ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ تو وہ برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور اس عزم صمیم کے ساتھ وطن گئے تھے کہ کانگریس سے جلد از جلد سمجھوتہ کر کے برطانوی حکومت کے خلاف محاذ قائم کریں گے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں انھوں نے مرکزی اسمبلی کے اندر اپنے اس عزم صمیم کو علی جاہ پہنایا کہ۔ دُنیا کو دکھا دیا تھا۔ کہ آئندہ وہ ہندوستان کی سیاست کو کس رخ پر چلانا چاہتے ہیں۔

اندریں حالات بقول پروفیسر کوپ لینڈ کے "کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہند مسلم اتحاد کی جو خوشگوار نمنا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اُس نمنا کو اب صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس نمنا کو یقیناً صوبائی حکومتوں تک وسیع کیا جاسکتا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں جب ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ تو عام خیال یہ تھا کہ اگر صدر کے تحت جب صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوگا۔ تو کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے مل کر وزارتیں مرتب کریں گے۔ اور اُس رجعت پسند عنصر کو ایوانِ حکومت سے خارج کر دیں گے۔ جو ۱۹۲۱ء سے اب تک ہندوستان کی سیاست پر قابض چلا آ رہا تھا۔ مسٹر جناح نے ایک ہیانتدار کھلاڑی کی طرح جس کا دامن بہ ہر قسم کے مکر و فریب سے پاک تھا، اپنے پتے

مرکزی اسمبلی میں سب کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ اب یہ فریق ثانی یعنی کانگریس کا کام تھا۔ کہ وہ بھی دیانتدار کھلاڑی کی حیثیت سے مسٹر جناح پر اعتماد کرتی۔

متعدد وجوہ سے یو۔ پی کو ہندوستان کے تمام صوبوں میں قلب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اول اس لئے کہ یہ علاقہ تین سو سال تک مغل حکومت کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کے آثار یہاں کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ دوم اس لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کی صحیح تہذیب اور ہندوستان کے صحیح ادب نے اسی نقطے میں فروغ پایا تھا۔ سوم اس لئے کہ یو۔ پی کے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن، علم و ادب اور قومی و ملی رہنمائی میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے تھے۔ چہاں کہ اس لئے کہ یہ صوبہ نہرو خاندان کا وطن ہونے کی وجہ سے کانگریسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ انہی وجوہ سے سائے ہندوستان کی نظریں یو۔ پی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو معاملہ وہاں طے ہوگا۔ اسی کا عکس پورے بڑے عظیم پر پڑے گا۔

۱۹۳۶ء میں یو۔ پی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک غیر رسمی سی مفاہمت ہو گئی تھی۔ کہ دونوں جماعتیں الیکشن میں ایک دوسری کی مدد کریں گی۔ چنانچہ جگہ جگہ کانگریسی امیدواروں نے لیگی امیدواروں کی حمایت کی۔ اور لیگی کارکنوں نے کانگریسی امیدواروں کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح سیاسی فضا نہایت خوشگوار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں۔ کہ :

..... یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا پہلو رقیبانہ نہیں

بلکہ دوستانہ تھا۔ اور جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ یہ توقعات  
تھیں۔ بلکہ بعض افراد نے ہمت افزائی بھی کی تھی۔ کہ مشترکہ وزارت  
بنے گی۔ البتہ کوئی معاہدہ نہ تھا! ۱

ڈاکٹر اشرف کی رائے درست ہے۔ کہ کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اور ایسا معاہدہ اس  
وقت ممکن بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کو ہرگز امید نہ تھی کہ اسمبلی میں اسے  
اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ کہ آئندہ وزارت سازی کے لئے اسے  
کسی دوسرے گروہ کا محتاج نہیں بنا پڑے گا۔ اس لئے ۱۹۳۶ء میں کانگریسی  
لیڈروں کا رویہ دوستانہ تھا۔ اور وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اگر مختلف صوبوں میں  
وزارتیں مرتب کرنے کی نوبت آئی۔ تو مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا ضروری  
ہوگا۔

لیکن ہوا کیا؟ جب ۱۹۳۶ء کے اوائل میں الیکشن کے نتائج برآمد ہوئے۔ اور  
کانگریس کو چھ صوبوں میں خلافت توقع بہت بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔ تو  
اس تنگ دست لیکن کم طرف انسان کی طرح، جسے عمر بھر کے انتظار کے بعد یکایک  
لاٹری سے بہت سی دولت ہاتھ آ جائے۔ کانگریس کا دماغ اس کامیابی سے چل  
گیا۔ مفاہمت کی جگہ حقارت نے لے لی۔ دوستی کی بجائے نفرت پیدا ہو گئی  
اور تعاون کی جگہ رعونت آ گئی۔ وہی جناح جو کل تک آزادی و حریت کا سپر سمجھا  
جاتا تھا۔ اب رجعت پسند بن گیا۔ وہی جناح جس کی مدد سے کانگریس نے مسلسل

۱ ڈاکٹر اشرف کا خط اس کتاب کے صنف کے نام۔ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۷ء



دو سال تک مرکزی اسمبلی میں حکومت کو پے در پے شکستیں دی تھیں۔ اب ایک  
 فرقہ پرست لیڈر تھارو سے دیا گیا۔ اور وہی جناح جس نے اپنے قول سے نہیں بلکہ  
 فعل سے۔ سندھوں اور مسلمانوں میں اُس وقت اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا تھا۔ جب  
 گاندھی اور نہرو منہ میں گھنٹنیاں بھر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب سندھوستان کا بدخواہ  
 سمجھا جانے لگا۔ یہ سب کچھ اُس اقتدار کے طفیل ہوا۔ جو کانگریس کو یکسخت  
 چھ صوبوں میں حاصل ہو گیا تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے؟

بادہ نوشین و ہشیار نشین سہل است

گر بدولت برسعی، مست نگر دی، مردی

جولائی ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے چھ صوبوں میں وزارتیں بنانے کا  
 فیصلہ کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا۔ کہ کیا ان وزارتوں میں مسلمانوں کو  
 بھی شامل کیا جائے گا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں، صوبائی گورنروں کے نام جو درجے  
 موجود تھیں۔ اُن میں درج تھا، کہ ہر صوبے کے گورنر کا فرض ہے، کہ وہ اپنے صوبے  
 کے کابینہ میں اقلیت کے نمائندوں کو بھی شریک کرے۔ اس لحاظ سے ضروری تھا۔  
 کہ کانگریسی صوبوں کی وزارتوں میں مسلمان بھی شامل کئے جائیں۔ یو۔ پی کی  
 اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد چھپا سٹھ تھی جن میں سے پینسٹھ غیر کانگریسی ممبر تھے  
 اور صرف رفیع احمد قدوائی ایک ضمنی انتخاب میں کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہو  
 کر آئے تھے۔ تمام غیر کانگریسی مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے  
 مسلم لیگی بن چکے تھے۔ اور اُن کے لیڈر چودھری خلیق الزمان تھے۔

گذشتہ دو سال کے واقعات کے پیش نظر ہر شخص کو یہی توقع تھی کہ آئندہ صوبائی حکومتوں میں کانگریس اور لیگ بل جُل کام کریں گی۔ لیکن جب وزارت ساری کا وقت آیا تو یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جن کو کانگریس نے یو۔ پی۔ بنگال۔ پنجاب اور سرحد کے پارلیمنٹری امور کا سربراہ بنا دیا تھا، چودھری خلیق الزمان کو خط لکھ کر چند شرائط پیش کیں۔ اور فرمایا کہ اگر یہ شرطیں ماننے کو تیار ہو۔ تو مسلم لیگ کے کسی ممبر کو ہم وزارت میں جگہ دے سکتے ہیں :

وہ شرطیں کیا تھیں۔ ملاحظہ فرمائیے :

- اول : یو۔ پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر بالکل ختم کر دیا جائے۔
- دوم : مسلم لیگ پارٹی کے تمام ممبر کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کر گے۔
- کانگریسی بن جائیں۔ اس طرف سے یہ لوگ کلینڈ کانگریس کے نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کے تحت آجائیں گے۔ اور آئندہ اپنے تمام اعمال و انعام کے لئے کانگریس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ کانگریس پارٹی کے جلسوں میں ان لوگوں کو شریک نہ ہونا ہوگا۔ جہاں دیگر کانگریسی ممبروں کی طرف سے یہ لوگ بھی ہر معاملہ میں دوست دیں گے۔
- سوم : کانگریس کی مجلس عاملہ سے مختلف اسمبلیوں کے کانگریسی ممبروں کے لئے جو ضابطہ عمل تیار کیا ہے۔ مسلم لیگ کے ان ممبروں کو اس آئندہ کانگریس کے ممبر سمجھے جائیں گے اس ضابطے پر باقاعدہ عمل کرنا ہوگا۔

چہارم: مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دیا جائے گا۔ اور آئندہ کسی انتخاب

میں مسلم لیگ کو اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کی اجازت نہیں

ہوگی۔ یہ کام کانگریس کے ذمے ہوگا۔ کہ وہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے

انتخاب میں اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرے۔

پنجم: تمام ممبروں کو کانگریس کے لائحہ عمل پر کاربند ہونا پڑے گا۔ اور

کانگریس کے اغراض و مقاصد میں تکمیل میں ہر ممکن کوشش کرنا

ہوگی۔

ششم: اگر کانگریس نے کبھی وزارت یا اسمبلی سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ

کیا۔ تو ان ممبروں کو بھی اس فیصلے کی پابندی کرنا پڑے گی۔

عزیز زبانی: کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کا نعیب بن کر جو شرائط

پیش کی تھیں۔ کیا وہ مسلم لیگ کو اشتراک و تعاون کی دعوت تھی؟ یا اس بات

کی لگارتھی کہ ہتھیار ڈال کر گھٹنے ٹیک دو۔ اور کانگریس کی غلامی کا پٹہ گردن

میں ڈال کر ہماری بارگاہ پر سر بسجود ہو جاؤ؟ کیا کوئی خود دار سیاسی جماعت ان

ذلت آمیز شرائط کو ایک لمحے کے لئے بھی قبول کرنے پر تیار ہو سکتی تھی؟ چنانچہ

جب مسٹر جلیح کو اطلاع ملی۔ تو انہوں نے صاف کہہ دیا۔ کہ ہم ایک مساوی فریق

کی حیثیت سے تعاون کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن اپنی جُداگانہ قومی ہستی کو

ختم کر کے۔ اپنے آپ کو مٹا دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

کاش مولانا ابوالکلام آزاد اس موقع پر اس جرات و ہمت اور اس غیرت

و حمیت کا ثبوت دیتے۔ جو کسی زمانے میں ڈاکٹر انصاری کا شیوہ خاص تھا!

۱۹۳۳ء میں جب کانگریس فرقہ دارانہ فیصلے کی مخالفت کرنے پر تلی ہوئی تھی تو ڈاکٹر انصاری نے ویانا سے گاندھی جی کو تار دیا تھا۔ کہ فرقہ دارانہ فیصلے کا بدل صرف ایک متفقہ فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک ایسا متفقہ فیصلہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ ہو جائے۔ کمیونل ادارہ کو برقرار رکھا جائے گا۔ اور اگر کانگریس نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ تو وہ کانگریس سے مستعفی ہو جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر انصاری کا بڑا عیب اور وہ بد بہ تھا۔ اور متعصب سے متعصب کانگریسی بھی ان کے سامنے جھک جانے پر مجبور تھا۔ چنانچہ ان کے اس انتباہ کے معاً بعد کانگریس نے کمیونل ادارہ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپے کمائے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے والیان ریاست ان کے زیرِ عمل رہتے تھے۔ اور وہ ایک ایک صاحب کی فیس ہزاروں روپے وصول کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ کمایا وہ ریٹائرمنٹ پر خرچ کر دیا وہ جب تک زندہ رہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہمیشہ ان کے مکان پر ہوتے تھے ان کے فوت ہو جانے کے بعد یہ اجلاس ورتھما میں ہوتے لگے تھے۔ واقعہ حال لوگ جانتے ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے ایک اجلاس پر وزیر اعلیٰ کے ہزاروں روپے اکٹھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری نہایت خندہ پیشانی سے یہ

---

ڈاکٹر انصاری کا پورا نام مختار احمد انصاری تھا۔ وہ مئی ۱۹۳۶ء میں ریل میں سفر کرتے ہوئے مارتنہ قلب سے فوت ہو گئے تھے۔

تمام مہارت برداشت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے انتقال پر دہلی کے دریا گنج والے مکان کے سوا اُن کے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ حالانکہ اُن کے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔

جب مسلم لیگ نے اپنی جداگانہ قومی سٹی کو ختم کر دینے سے انکار کیا۔ تو یو۔پی میں کانگریس نے رفیع احمد قدوائی کو وزارت کا منصب سونپ دیا۔ اور ساتھ ہی حافظ محمد ابراہیم کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، یہ لالچ دیا کہ اگر وہ لیگ سے مستعفی ہو کر کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انہیں وزارت عطا کر دی جائے گی۔ چنانچہ حافظ صاحب اس لالچ کا شکار ہو گئے۔ یہی حربہ کانگریس نے مدراس، بمبئی، صوبجات متوسط اور بہار میں استعمال کیا۔ مدراس میں سید یعقوب حسن اور بہار میں ڈاکٹر سید محمود کو وزیر بنا دیا گیا۔ بمبئی اور صوبجات متوسط میں کوئی مسلمان کانگریس ٹکٹ پر کامیاب نہیں ہوا تھا یہاں بھی وہی حافظ ابراہیم والا کھیل کھیلا گیا اور لٹین نوری اور محمد یوسف شریعت کو لیگ سے توڑ کر کانگریس میں شامل کیا اور انہیں علی الترتیب بمبئی اور صوبجات متوسط کا وزیر بنا دیا گیا۔

یہ سب کچھ گویا اس بات کا اعلان تھا۔ کہ آئندہ کانگریس کے علاوہ ہندوستان میں کسی اور جماعت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہوگا۔ اور اگر مسلمان اس ملک میں زندگی کا سانس لینا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی جداگانہ قومی تنظیم کو ختم کر کے۔ کانگریس میں جذب ہو جانا پڑے گا۔

میرٹھ ناچیز رائے میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد۔ ہندوستان کے مسلمانوں

کے لئے اس سے زیادہ پُر آشوب زمانہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے تیغ و تفلنگ سے مسلمانوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔ یہ سخت جان قوم اُس ابتلا سے پُرموہ و پریشان تو ضرور ہوئی تھی۔ لیکن انجام کار زندہ بچ نکلی تھی۔ اب سندھ نے اقتدار کے نشے میں مست ہو کر مسلمانوں کے قومی وجود کو ہرے ہی سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی اکثریت کے سیناب میں مسلمانوں کو بہا لے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بڑے عظیم کے مسلمان ایک عجیب قسم کی بھول بھلیاں میں پڑ گئے۔ انہوں نے بڑی کوشش اور کاوش سے اپنے لئے جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا تھا۔ اب وہی جداگانہ انتخاب جیسے وہ اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کانگریس کی ایک شاطرانہ ضرب سے پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ سندھوستان کے مسلمانوں نے حالیہ انتخاب میں بالائتفاق کانگریس کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اور صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے ملک میں صرف دس مسلمان کانگریس ٹکٹ پر کامیاب ہو سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کانگریس نے اعلان کر دیا تھا کہ تنہا وہی مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دے گی۔

یو۔ پی میں حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی۔ بمبئی میں لیسین نوری۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن۔ بہار میں سید محمود ادرسی۔ پی میں یوسف شریف کونڈس اس لئے وزارت میں جگہ دے دی گئی تھی۔ کہ وہ مسلمان تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے اپنے صوبے کی کاہنیاں کس کی نمائندگی کرتے تھے؟ یقیناً یہ نمائندگی مسلمان قوم کی نہیں تھی۔ یو۔ پی کی مجلس

قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی تعداد ۶۶ تھی۔ جن میں سے ۶۴ حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی کو اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ بمبئی اسمبلی میں مسلمان کل ۳۰ تھے جن میں سے ۲۹ کو یسین نوری پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں تھا۔ اس اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد ۲۸ تھی۔ جن میں سے ۲۳ کو سیٹھ یعقوب حسن پر کوئی اعتماد نہیں تھا۔

اسی طرح بہار اور صوبہ بجات متوسط کی مجالس قانون ساز میں علی الترتیب مسلمان ۴۰۔ اور ۱۴ تھے۔ لیکن بہار کے ۳۶۔ اور صوبہ بجات خود کے تین ممبر ستید محمود اور یوسف شریف کو اپنا اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ پھر کانگریس نے ان نام نہاد مسلمان وزیروں کو کس قوم کا نمائندہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا؟

کانگریس نے ہمیشہ انگریزوں کے خلاف یہ الزام لگایا تھا۔ کہ برطانوی حکومت سندھوستان کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کر کے۔ اپنے جی حضور یوں کو اسمبلی اور کونسل میں نامزد کرتی ہے۔ لیکن اب کیا سو رہا تھا؟ خود کانگریس نے انگریزوں کی جانشین بن کر مسلمانوں کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کر کے۔ اپنے چند جی حضور یوں کو وزارت کے منصب پر بٹھا دیا تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے۔ اس کانفرنس کے نمائندوں کا ذکر نہایت حقارت آمیز طریقے سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ

"یہ لوگ جنھیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ ہوانے اپنی

ذات کے اور کسی کی نمائندگی کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے بحیثیت مجموعی  
یہ لوگ ان مفاد کی نمائندگی کرتے تھے۔ جو ہندوستان میں برطانوی  
ملوکیت سے وابستہ ہیں۔ انگریزی حکومت کے نامزد کئے ہوئے  
ان ممبروں پر ہندوستان کے باشندوں کو،

کیا پنڈت نہرو کے یہی الفاظ ان مسلمان وزیروں کے متعلق نہیں کہے جاسکتے  
جنہیں کانگریس نے محض اپنے مفاد کی نمائندگی کرنے کے لئے نامزد کر دیا تھا؟ کیا  
مسلمان وزیر مسلمان قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتے تھے؟ اور کیا ان مسلمان  
وزیروں کو، مسلمان ممبروں کی خواہش کے خلاف کانگریس نے زبردستی ان پر  
مسلط نہیں کیا تھا؟

سوال یہ نہیں۔ کہ راج گوپال اچاری۔ ولجھ بھائی پٹیل اور ماہندر پرشاد  
زیادہ لائق تھے۔ یا گول میز کانفرنس کے ہندو ممبر تیج بہادر سپرو۔ سری نواس شاستری  
اور ایم۔ آر۔ جیکار زیادہ قابل تھے جو اہل ہندو کو سپرو۔ شاستری اور جیکار کیسے  
عظیم المرتبت انسانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ ان کو ہندوستان کے  
باشندوں نے اپنا نمائندہ منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ برطانوی حکومت نے نامزد کیا  
تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی پشت پر قوم کی آواز نہ ہو۔ وہ شخص اس قوم کی  
نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

کیا رفیع قدواہی۔ حافظ اباسیم۔ سید محمود۔ یسین زوری۔ یعقوب سائن اور



شریف کی پشت پر اُن کی قوم کی آواز تھی؟ اگر نہیں تھی۔ تو جواہر لال نے کس منطق، کس فلسفہ، کس دلیل، کس قاعدہ اور کس اصول سے اُن کو مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے کر وزارتوں میں جگہ دی تھی؟

بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ کانگریس تو یو۔ پی میں مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ تھی۔ لیکن جھگڑا صرف اس بات پر ہو گیا تھا۔ کہ لیگ دو وزارتیں مانگتی تھی۔ اور کانگریس لیگ کو صرف ایک وزارت دینے پر تیار تھی۔ یہ بات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس باب میں۔ کانگریس کی طرف سے جو باضابطہ تحریر چودہری خلیق الزمان کو بھیجی تھی۔ وہ الم آباد کے انگریزی روزنامہ پائٹریئر مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۴۷ء میں چھپ گئی تھی۔ اور مولانا کا یہ خط میں نے وہیں سے نقل کر کے اوپر درج کیا ہے۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب کانگریس مسلمانوں کے ساتھ یہ کھلی نا انصافی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دُعا ندلی کر رہی تھی۔ تو صوبوں کے گورنروں نے مداخلت کیوں نہ کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انگریز کی ابن الوقتی نے محسوس کر لیا تھا کہ مداخلت کرنے سے "ڈیڈ لاک" پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور برطانوی حکومت ہر قیمت پر اس "ڈیڈ لاک" سے بچنا چاہتی تھی۔ یو۔ پی، سی۔ پی، بہار، بمبئی، مدھ اس اور اڑیسہ میں کانگریس کو اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ کہ ایوان کی باقی تمام پارٹیاں مل کر بھی اُس کی برابر ہی نہ کر سکتی تھیں۔ اس لئے اگر گورنر مسلمانوں کے دادوں اور خیر خواہ بن کر۔ کانگریس کی اس پالیسی

میں مداخلت کرتے۔ تو کانگریس اس فعل کے خلاف بطور احتجاج مستعفی ہو جاتی  
 اُس صورت میں باقی جماعتیں مل کر بھی متبادل وزارت بنانے کی طاقت  
 نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ چھ صوبوں میں تقریباً "ڈیڈ لاک" پیدا ہوتا۔ اور برطانوی  
 حکومت دنیا بھر میں بدنام ہو جاتی۔ اس منحصرے میں پھنس کر کانگریس کے سامنے  
 ایک طرف تو مسلمانوں کی حق تلفی تھی۔ اور دوسری طرف کانگریس کی خوشنودی  
 انگریزوں نے اپنی الوقتی کی دیرینہ روایات عمل کرتے ہوئے۔ حد درجہ خیرہ چستی سے  
 کام لیا۔ اور مسلمانوں کی حق تلفی کو تو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ لیکن  
 کانگریس کو ناراض کرنا گوارا نہ کیا۔

مسٹر جناح نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ  
 کے موقع پر، اپنے خطبہ صدارت میں، وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ۔ والسرائے اور  
 گورنروں پر کھلے الفاظ میں یہی الزام عائد کیا تھا۔ کہ

”..... ان لوگوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر۔ ان مسلمانوں کو  
 وزارت کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ جن کے متعلق ان کو اچھی طرح  
 معلوم ہے۔ کہ ان افراد کو مسلمان قوم کی قطعاً تائید اور حمایت حاصل  
 نہیں ہے۔ جب اس کام میں گورنروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر  
 کے۔ یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ اقلیت کے ان حقوق کی حفاظت  
 کرنے سے قطعاً معذور ہیں۔ جس کا ذمہ برطانوی حکومت نے اٹھایا  
 تھا۔ تو آئندہ ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر بیسیوں  
 نہیں سیکڑوں ایسے مسائل پیش آئیں گے۔ جب اقلیتوں کو اپنے

حقوق کی پاسداری کے لئے اُن کی ادا و دعا عانت، ورکار ہوگی۔ اس وقت بھی یہ لوگ اسی طرزِ عمل کا ثبوت دیں گے۔“

ہاتما گاندھی ہمیشہ کہا کرتے تھے، کہ جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہو جاتا ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری رہے گی۔ گاندھی جی اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ جنگ کے وقت ملک کی تہم سیاسی پارٹیاں اپنے باہمی اختلافات کے باوجود، غنیم کے خلاف ہمیشہ مشترکہ حکومت اور مشترکہ وزارت بنایا کرتی ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں برطانیہ کی تمام پارٹیوں نے مل کر جرمنی کے خلاف متحدہ وزارت قائم کی تھی۔ پھر جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی، تو ایسرا اور ٹورسی نے اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور دشمن سے نبرد آزما ہونے کی خاطر، قومی حکومت قائم کر لی تھی۔ تاکہ ملک کے تہم عناصر یکجا ہو کر وطن کی مدافعت کر سکیں۔ کیا ایسی حالت ہیں۔ کہ ابھی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری تھی۔ اور غنیم بدستور ہائے سامنے کھڑا دیکھا رہا تھا۔ یہ مصلحت کا تقاضا نہ تھا۔ کہ مسلم لیگ اور کانگریس مل کر قومی حکومت قائم کرتیں؟

انہی دنوں سردار سردار سنگھ کو لیٹرنے ہاتما گاندھی کو خط لکھ کر بڑی دردمندی سے التجا کی تھی کہ خدا کے لئے صوبائی وزارتوں میں مسلم لیگ کو شامل کر کے متحدہ محاذ قائم کیجئے۔ سردار سردار سنگھ کو لیٹرنے کانگریس کی درکنگس کمیٹی کے بڑے پڑانے مکن تھے۔ لیکن چونکہ وہ وزارتیں قبول کرنے کے حامی نہیں تھے۔ اس لئے جب اس مسئلہ پر اُن کا کانگریس سے اختلاف ہوا، تو انہوں نے درکنگس کمیٹی سے استغناء

دے دیا تھا۔ تاہم کانگریس کے بالائی حلقوں میں اُن کا وقار بدستور قائم تھا۔ سردار  
کو لیشرنے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ

۱:- جب کانگریس مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً کوئی کامیابی حاصل  
نہیں کر سکی۔ تو کہاں کا اخلاق اور انصاف ہے کہ آپ اگے دُکے مسلمان  
ممبر کو وزارت کا چمکہ دے کر کانگریس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور پھر اُسکو  
مسلمان قوم کا نمائندہ قرار دیکر بڑے فخر سے اُس کی نمائش کرتے پھرتے ہیں۔  
۲:- جب کانگریس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو منظور کرتے ہوئے یہ ایکشن  
لڑی ہے۔ تو جداگانہ انتخاب کا تقاضا ہے۔ کہ اسی مسلمان کو وزارت میں جگہ  
دی جائے جس پر اُس کی قوم کو اعتماد ہے۔

۳:- جہاں تک تعمیری اور سیاسی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس  
کے مینی فسٹو میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کے ممبروں کو لیگ سے  
مخرف کر کے کانگریس میں شامل کرنے کی جدوجہد بیکار ہی نہیں بلکہ شراذیم  
ہے۔ اس طرح مسلمان ہمارے دستن بن جائیں گے۔

۴:- جب مسلم لیگی ممبر کانگریس کے پروگرام پر عمل کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ تو  
انہیں کیوں درغلا کر۔ کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور  
کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب دیا تھا کہ

”آپ کا خط، آپ ہی کی طرح، مدلل اور دوسروں کو قائل کر دینے والا  
ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے آپ کا خطاب بالائی حلقوں میں بھیج دیا ہے۔“

سروا سرودول سنگھ کو لیٹر نے اپنا خط اور ہاتھ لگا کر دیا تھا۔ اس کا جواب دونوں اسی زمانے میں اخباروں میں شائع کر دیئے تھے۔ کو لیٹر کے علاوہ ایم۔ این رائے بارہا اپنے اخبار انڈیا پنڈنٹ انڈیا میں کانگریس کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور گاندھی جی سے درخواست کرتے تھے کہ ہندوؤں میں مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ وزارتیں بنا لیجئے، خود کانگریسی حلقوں میں ایک اچھا خاصہ طبقہ کانگریس کی اس پالیسی کے خلاف تھا۔ لیکن ضابطے کی پابندی کی وجہ سے زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی آر ریڈی نے اسی زمانے میں بارہا اپنی تقریروں میں اس اہم مسئلہ پر بحث کی تھی۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

”... جہاں جگہ انتخاب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی حکومت پر اعتماد نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ تنہا جہاں جگہ انتخاب مسلمانوں کے جملہ خدشات کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف ان مسلمانوں کو وزارت میں شامل کیا جائے۔ جو جگہ جگہ انتخاب کے تحت اپنی قوم کا اعتماد حاصل کر کے اسمبلی میں آئے ہیں۔ قطع نظر اس سے۔ کہ وہ ایوان کی سب سے بڑی پارٹی کے رکن ہیں یا نہیں... فرض کیجئے کہ مسلمانوں کے لئے بیس نشستیں محفوظ ہیں۔ انتخاب کے وقت کانگریس ان بیس نشستوں سے اپنے امیدوار کھڑے کرتی ہے۔ لیکن صرف پانچ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اگر کانگریس ان پانچ امیدواروں میں

ایک کو وزارت کا منصب بخش کر یہ خیال کرتی ہے۔ کہ اُس کا نامزد کیا ہو مسلمان وزیر۔ مسلمانوں کے حقوق کا محافظ تصور کیا جانا چاہیے۔ تو یہ طرزِ عمل جمہوری اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔

”ایک صوبے میں، جہاں کانگریس ٹکٹ پر کوئی مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا تھا، ایک انڈی پنڈنٹ مسلمان کو ٹیکر ٹھاڑ کر۔ اُس سے کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کرائے۔ اور اُسے فوراً وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں، کیا اسی کا نام جمہوریت ہے؟ کیا جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

”اب یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے۔ کہ آئینوں کے تحفظات، اور جداگانہ انتخاب کو کانگریس کے اس طرزِ عمل نے نہیں نہیں کہہ کے رکھ دیا ہے، مسلمانوں نے آئین اور دستور میں اپنے لئے جو مقام حاصل کیا تھا اُسے بالکل توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔ اندر میں حالات کیا آپ یہ توقع رکھ سکتے ہیں، کہ مسلمان آپ کی اس کارگزاری سے مطمئن ہوں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اُن کے جذبات میں اضطراب اور ہیجان پیدا ہو رہا ہے اور وہ آئندہ کسی بہتر اور زیادہ مؤثر دستور کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“

”میں خود ایک زلزلے میں اس بات کا حامی تھا، کہ نشستوں کے تحفظ کے ساتھ ملک میں مخلوط انتخاب، راج ہونا چاہیے، لیکن کانگریس کا موجودہ رویہ، اور اُس کا رویہ عمل دیکھنے کے بعد۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تاثر نہیں کہ آئندہ ہندوستان میں مخلوط انتخاب جاری ہونے کا

قطعا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔" ۱

سرمہ سپیول گریفٹس جو ایک زمانے میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں یورپین گروپ کے لیڈر تھے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"..... کانگریس ہائی کمان نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں۔ کانگریس

اور لیگ کی مشترکہ وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی وزارتوں کو

صرف کانگریس پارٹی کے نمبروں تک محدود رکھا۔ مثلاً جب یو۔ پی میں

وزارت سازی کا وقت آیا۔ تو مسلمانوں سے کہا گیا۔ کہ اگر وہ مسلم لیگ

کو توڑ کر انفرادی اور مجموعی طور پر کانگریس میں جذب ہو جائیں تو انہیں

وزارت میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ باقی صوبوں میں بھی یہی طریقہ

اختیار کیا گیا تھا۔

"بلاشبہ کانگریس کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ لیگ اور کانگریس

کے معاشرتی اور سیاسی پروگرام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی لئے اگر

کانگریس لیگ سے مل کر مشترکہ وزارتیں بنا لیتی۔ تو ایسی وزارتیں نہایت

آسانی سے کام کر سکتی تھیں۔ بجا سہی یا بے جا۔ مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور

ہو گئے تھے۔ کہ انہیں اقتدار سے صرف اس لئے محروم رکھا گیا ہے کہ کانگریس

سرمہ سپیول گریفٹس کا ایک جماعت ہے" ۲

۱ Congress in Office (1940) By C.R. Reddy, page 82

۲ The British Impact on India

By Sir Percival Griffiths, page 340

سید طفیل احمد منگلوری مرحوم، جو مسلم لیگ کے سخت مخالف اور کانگریس کے بہت بڑے مددگار تھے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

”.... مسلم لیگ کے مبینہ فیٹو میں مسلمانوں کی مخصوص ضروریات میں سے صرف مذہب، زبان اور رسم الخدا کی حفاظت درج تھی۔ اس کے بعد ملکی ترقی کے کاموں، اور عوام الناس کے فوائد کے بارے میں مسلم لیگ کے کانگریس کا پروگرام اختیار کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ہر جگہ کانگریس نے انتخابات اسمبلی میں مدد دی۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا۔ کہ بیس سال بعد قرآن السعدین نافع ہوگا۔ اور مسلم لیگ اور کانگریس ایک جان و دو قالیب ہو کر ملکی کام کریں گی۔ مگر فلک بوز تار کو گب گوارا تھا۔ کہ یہ دونوں جماعتیں پھر دوش بدوش کام کریں چنانچہ انتخابات میں کانگریس کی غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے اس کی بد مزگی ہو گئی۔ بد مزگی کی وجہ یہ ہوئی کہ کانگریس نے اپنی اکثریت دیکھ کر اپنے ذرا میں مسلم لیگ کے لوگوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔“

ایڈووٹا ماسن، جو گاندھی، جواہر لال، راج گوپال اچاری اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ذاتی دوست تھے۔ اور انگلستان میں سالہا سال تک کانگریس کی پیپلز کیپٹ رہے تھے۔ اسی ملے پر انہماں خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”مسلمانوں کا ریشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۴۵۹“



” اگر آپ مجلس قانون ساز میں کسی جماعت کے لئے جداگانہ نشستیں محفوظ کرنے کا قاعدہ اختیار کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس قاعدے کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ جماعت کا بیٹہ ہیں بھی۔ اسی نسبت سے اپنے لئے جداگانہ سائنڈگی کا مطالبہ کرے گی۔ اور اگر آپ یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو وہ جماعت یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ اس قسم کی جداگانہ نیابت۔ جو اسے طاقت اور اقتدار سے محروم رکھتی ہے۔ محض ایک فریب ہے۔“

” کانگریس نے اپنے مختصر سے کا بیٹہ میں، جو صرف چھ آدمیوں پر مشتمل تھا، کسی مسلم بچی کو شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر پھیل گئی۔ موجودہ سندھ مسلم کشینگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ایک واقعہ ہے۔ مسلم لیگ نے جب دیکھا کہ اسے سیاسی طاقت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تو وہ صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ سخت مخالفت پر آم آئی۔“

” بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کانگریس کی غلطی تھی۔ جب تک جداگانہ انتخاب کا طریقہ قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ فرقہ دارانہ اصولوں پر پارٹیاں بنائی جائیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ جب تک جداگانہ انتخاب ختم نہیں ہو جاتا۔ سندھ ستان میں مشترکہ وزارتیں (کولیشن) ہی قائم ہونی چاہئیں۔ کانگریسی لیڈر اب اپنی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں“

(حاشیہ ۴۶۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے صرف چھ وزارتوں کیلئے سندھ وراثت بھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔ یہ اندازِ فکر غلط، گمراہ کن اور سیاسی حقائق سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ سوال چھ وزارتوں کا نہیں تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ کیا سندھ وراثت کے مسلمان ایک جداگانہ قومی ہستی کے مالک ہیں یا نہیں؟ انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں جداگانہ انتخاب کا اصول منظور کر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور کانگریس نے ۱۹۱۶ء میں بیناتق لکھنؤ پر دستخط کر کے اس جداگانہ قومی ہستی کی توثیق کر دی تھی۔ بیناتق لکھنؤ بدستور قائم تھا جس کے بوجھ سے لیگ اور کانگریس کے گندھے بچھکے ہوئے تھے۔ پھر کانگریس کس منہ سے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی سے انکار کر سکتی تھی؟

کانگریس نے جب کھیلے میدان میں شکست کھائی۔ تو چور و رازہ سے داخل ہو کر مسلمانوں کے قومی شیرازہ کو منتشر کرنا شروع کیا۔ گاندھی جی ہمیشہ سداقت، اخلاق اور اصول کا پرچار کرتے تھے۔ لیکن ان کے حواریوں نے ان کی آنکھوں میں

ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)

By Edward Thompson, Page 56

ایڈورڈ ٹامسن یہ حکایت مشہور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ کہ علامہ اقبال اپنی ذات سے قومی نظریہ پاکستان کے مخالف ہو گئے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اگر سندھ وراثت تقسیم ہو تو مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں اس کتاب میں آگے چل کر ایڈورڈ ٹامسن اور ان کی اس حکایت پر تفصیلی بحث کروں گا۔

کے سامنے، مسلمانوں کو وزارت کی رشوت دے دے کر۔ اپنی قوم سے غداری کرنا  
سبق سکھانا شروع کیا۔ کسی مسلمان کو پارلیمنٹری سکرٹری بنانے کا حکم دیا گیا  
کسی سے نوکری کا وعدہ کیا گیا۔ اور کسی کو ممبری کا لالچ دیا گیا۔ لیکن ہر جگہ شرٹا  
یہ رکھی گئی۔ کہ پہلے مسلم لیگ کو چھوڑ کر۔ کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کرو۔ پھر  
سب کچھ مل جائے گا۔

یہ وہی پُرانے ہتھکنڈے تھے۔ جو انگریز برتا کر تا تھا۔ اور اب چونکہ انگریز کے  
"امپیریلزم" کی جگہ کانگریس کا "امپیریلزم" قائم ہو گیا تھا۔ اس لئے پُرانی شراب  
نئے گلاسوں میں تقسیم ہونے لگی تھی۔

کانگریس نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ وہ کسی صوبے میں، کسی غیر کانگریسی کو اپنی  
وزارت میں جگہ نہیں دے گی۔ ہندو اقلیت کے صوبوں میں جہاں غیر کانگریسی  
حکومتیں قائم تھیں، کانگریس نے وزارتوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا  
بنگال میں مولوی فضل الحق نے جب وزارت مرتب کی، تو ان کی خواہش تھی  
کہ کانگریس بھی اُس میں شرکت کرے۔ لیکن کانگریس نے اس بنا پر پاس شکیش  
کو نہ کر دیا۔ کہ وہ کسی غیر کانگریسی وزارت کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنا  
گناہ سمجھتی ہے۔

۳۱ ستمبر ۱۹۳۶ء کو صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم کی وزارت کو حزب مخالف  
کے ہاتھ سے شکست ہوئی۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں، جس کے ممبروں کی مجموعی  
تعداد ۵۰ تھی۔ کانگریسی ممبر صرف ۱۹ تھے۔ اس لئے تنہا کانگریس اپنے بل بوتے  
پر نئی وزارت بنانے کے قابل نہ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو صوبہ سرحد کے

انچارج تھے۔ جھٹ حکم دے دیا کہ غیر کانگریسی عناصر کو ساتھ لے کر وزارت بنالی جائے چنانچہ چار ممبر ڈیموکریٹک پارٹی کے۔ دو انڈی پنڈٹ اور دو ہما سبھائی ممبروں کو شریک کر کے ڈاکٹر خان صاحب نے "کانگریسی وزارت" قائم کر لی۔ سر عبدالقیوم کے کا بیٹے میں تین وزیر تھے۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لئے ڈیموکریٹک پارٹی کا ایک غیر کانگریسی وزیر بھی شامل کر لیا۔ اور وزراء کی تعداد تین کی بجائے چار کر دی گئی۔

یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور اڑیسہ میں کانگریس کا اصل یہ تھا کہ کسی غیر کانگریسی کو وزارت میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ پارلیمنٹری جمہوریت کا تقاضا ہے۔ کہ صرف ایک پارٹی کی حکومت ہو۔ لیکن جب صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں باہمی انتشار پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ تو فوراً یہ ناقابل ترمیم وغیر متبادل اصل بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اور مشترکہ وزارت رکولیشن بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ اس روز اتفاق سے ایوان میں صرف ۴۷ ممبر موجود تھے۔ چنانچہ سات کانگریسی آٹھ ہما سبھائی اور آٹھ یونائیٹڈ پارٹی کے مسلمان ممبروں نے اکٹھے ہو کر حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ تین ممبر عزیز جان تیار رہے۔ اس طرح دو ووٹوں کی کمی سے سر غلام حسین کی وزارت لوٹ گئی۔

سندھ اسمبلی میں کانگریسی ممبروں کی تعداد صرف نو تھی۔ ظاہر ہے اس قابل تعداد سے کانگریس مشترکہ وزارت تو بنا نہیں سکتی تھی۔ اس لئے کانگریس اپنی کمان

نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی باہمی بھڑک سے جس قدر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اٹھایا جائے۔ چنانچہ کانگریس نے سر غلام حسین کے حریف خان بہادر اللہ بخش کو مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ اس طرح اللہ بخش نے یونائیٹڈ پارٹی کے اٹھارہ مسلمان اہل سبھا کے گیارہ ہندو اور کانگریس کے نو نمبروں کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت قائم کر لی۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو آسام میں سر سعد اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ آسام اسمبلی کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۱۰۸ تھی۔ جن میں سے ۳۵ مسلمان تھے اور ۳۳ کانگریسی ہندو تھے۔ سعد اللہ نے غیر کانگریسی ارکان کو اپنے ساتھ ملا کر ایک اجماعی مفیضہ حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن کانگریس اندھی اندر مسلمانوں میں بھڑک ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انجام کار یہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور کانگریس پارٹی کے لیڈر گوپی ناتھ بارو دلائی نے غیر کانگریسی ہندوؤں اور سعد اللہ کے مخالف مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر تبادل حکومت قائم کر لی۔ سعد اللہ کے کابینہ میں پانچ وزیر تھے لیکن بارو دلائی نے وزیروں کی تعداد کو بڑھا کر آٹھ کر دیا۔ جن میں چار کانگریسی اور چار غیر کانگریسی تھے۔ ان میں تین وزراء مسلمان تھے۔ جو تینوں کے تینوں غیر کانگریسی تھے۔

یہ سب کچھ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی آنکھوں ہی کے سامنے نہیں بلکہ ان کی مشبانہ روز کوشش اور محنت سے ہو رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اب مولانا کا صرف یہ کام رہ گیا تھا۔ کہ جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہاں انکی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے۔ اُنھیں ہندو اکثریت میں مدغم کر دیا جائے۔ اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں سازشوں۔ ریشہ دوانیوں اور فتراپردازیوں کے

جال پھیلا کر۔ اُن کی قومی جمعیت کو پارہ پارہ کیا جائے۔ تاکہ اغیار کو حکمرانی کے مواقع  
 دیا جاسکے۔ اتنا بندہ و اتنا ابیرا جھوٹا۔

بد الدین طیب جی سے لے کر تصدق احمد خاں شردانی تک۔ ہندوستان کے  
 بیسیوں مسلمان اکابر وقتاً فوقتاً کانگریس میں شریک رہ چکے تھے جن میں محمد علی  
 ایسے آتش نفس، انصاری ایسے ایشیا پیٹریہ، جناح ایسے آئین پسند، حسن امام ایسے  
 قانون داں اور حسرت موہانی ایسے رئیس ملتغزلیں سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔  
 لیکن مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس بے حسنی بلکہ سنگدلی سے قربان کرنے کا شرف  
 حضرت امام الہندؒ کے حصے میں آیا تھا۔ وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام غلام محی الدین اور اُن کے بڑے بھائی کا نام غلام یسین  
 اور تخلص آہ تھا۔ لیکن مولانا نے اپنا نام بتدریج بدلا۔ پہلے محی الدین احمد رکھا۔ پھر عرب  
 بننے کے شوق میں صرف احمد رکھے۔ زمانے ہیں۔

”یہ غریب الدیار، عہد و نانا آشنائے عصر۔ بریگاہِ خویش و شک پروردہ ریش۔“

معمودہ تمنا و خیرا بہ حسرت۔ کہ موسوم بہ احمد مدعو بابی الکلام ہے۔“

مولانا کا آبائی وطن قصبہ کھیم کرن۔ تحصیل قصور۔ ضلع لاہور تھا۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ

”آبائی وطن وہلی مرحوم ہے۔ مگر وطن ماورِی سرزمینِ مطہرِ طیبہ و دادا ہجرت

سیدالکونین و شہرستانِ نبوتِ وحی ہے۔“

مولانا کے دادا کا نام عمرو بن عرف عمر اجمپکڑی تھا۔ وہ کھیم کرن میں گائے بھنیس کی

کھالیں رنگنے کا کام کرتے تھے۔ اور کھیم کرن ہی میں دفن ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۶۸ پر)

جو کچھ ادب پر بیان کیا گیا ہے۔ اُس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگریس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر ناجائز وسیلہ اختیار کر کے۔ اور ہر شر مناک حرکت کو کام میں لاکر مسلم لیگ کا زور توڑے۔ تاکہ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے ا بے والی و وارث بنایا جاسکے۔ کانگریس پورے برعظیم ہند کی شہنشاہی کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اور

(بقیہ حاشیہ ۴۶۸) لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ

”میرے دادا مولانا محمد ہادی دہلی مرحوم کے ایک مشہور خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں بیک وقت پانچ پانچ علماء و درس و افتاء و اصحابِ سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں۔“

مولانا کے والد خیر دین (جو بعد میں صوفی پیر خیر الدین کے لقب سے مشہور ہوئے) وس گیا رہ سال کی عمر میں کھیم کرن سے بھاگ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ مولانا کے حقیقی چچا یعنی خیر دین کے بھائی۔ امام دین کا ستر سال کی عمر کے لگ بھگ۔ لاہور میں انتقال ہوا تھا اور ان کی قبر بھی لاہور میں ہے۔ امام دین کے بیٹے۔ یعنی مولانا کے چچا زاد بھائی خیر دین گلٹ سار۔ ابھی چند سال ہوئے۔ لاہور میں موری دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ ان خالق کے باوجود مولانا فرماتے ہیں۔

”والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذہ علم و درس اور اصحابِ طریقت و سلوک میں سے تھے۔ اور ان مخصوص اصحابِ کمال میں سے۔ جن کو اللہ تعالیٰ علوم ظاہر و باطن عطا فرمائے۔“

اس خواب کی حسبِ نشار تعبیر جب ہی ممکن تھی کہ مسلمانوں کا کانٹا نکل جائے۔ مسلمانوں کی اقلیت کے صوبوں میں تو کانگریسی راج، بلا شرکتِ غیر سے قائم ہو چکا تھا۔ البتہ پنجاب، بہکال، سندھ اور سرحد کا مغلوب و مفتوح ہونا باقی تھا۔ پرنسپل کو پالیٹکس لکھتے ہیں :

”مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہاں غیر کانگریسی وزارتوں کے مخالفوں کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور حامیانِ وزارت میں سچوٹ ڈالی جائے۔ مسلم لیگ کا زیادہ زور اقلیت کے صوبوں میں تھا۔ کانگریس محسوس کر رہی تھی کہ اگر اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو کچل دیا گیا، تو باقی صوبوں میں اس کا زور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چونکہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں تھی، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک

(فقہ حاشیہ ص ۴۶۸) :-

فرماتا ہے۔ ان کا شمار حضرت شاہ عبدالعزیز کے اجلہ تلامذہ میں تھا۔ اور

سلطنتِ مغلیہ کے آخری رکنِ مدرسین تھے۔“

تقسیمِ ہند کے بعد مقبہ کھیم کرن بھارت میں رہ گیا ہے۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ کھیم کرن کے باشندوں کی درخواست پر، مشرقی پنجاب کی حکومت نے کھیم کرن کے چٹا دروازہ کا نام مولانا آزاد گیٹ رکھ دیا ہے اور مولانا کا آبائی مکان آثارِ قدیمہ کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے



پلیٹ فارم پر جمع کر سکے۔ اس لئے لیگ کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا بے  
 والی ودارت ہو جانا یقینی تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگریسی حکومت قائم ہو  
 ہی چکی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں اگرچہ کانگریس کا برسرِ اقتدار ہونا بظاہر  
 ممکن نظر نہیں آتا تھا، لیکن اگر ان صوبوں کے مسلمانوں کو مجتمع کرنے  
 والی کوئی طاقت باقی نہ رہی، تو پھر کانگریس ان میں ہر صوبے کے  
 لیڈروں سے الگ الگ مفاہمت کر کے، اور انہیں چند تحفظات عطا  
 کر کے، اپنی بالادستی قائم کر لے گی۔" لے

پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد غور فرمائیے، کہ جب ٹھارویں  
 صدی میں مغلیہ حکومت کا مرکزی نظام کمزور ہو گیا تھا، تو کیا انگریزوں نے بتدریج  
 ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے، من و عن یہی طریقے اختیار  
 نہیں کئے تھے؟ جو نہی ہندوستان کے تمام صوبوں کو مجتمع کرنے والی مرکزی طاقت  
 باقی نہ رہی، انگریزوں نے سرانجام الدولہ کے بنگال سے لے کر ولایت سنگھ کے پنجاب  
 تک، ایک ایک صوبے کو آسانی سے ہضم کر لیا تھا، کانگریس بھی انگریزوں کے  
 "امپیریلزم" کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دے کر، اسی راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔  
 چنانچہ اب اس کی انتہائی کوشش تھی، کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانانِ ہند کے  
 مرکزی نظام کو، جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ تھا، پاش پاش کیا جائے۔ ڈاکٹر  
 سی۔ آر۔ ریڈی وائس چانسلر آندھرا یونیورسٹی فرماتے ہیں۔

” کانگریس نے مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے جو طریقے اور حربے اختیار کئے تھے ان میں سب سے پہلا حربہ یہ تھا۔ کہ تمام ذمہ دارانہ جماعتوں کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ کانگریس کا یہ دعوے صحیح ثابت ہو سکے کہ وہی سنڈھتیا کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ جو برطانوی امپیریلزم کے ساتھ گفت و شنید کا استحقاق رکھتی ہے۔

” جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ کانگریس نے اپنی مذکورہ بالا پالیسی کے پیش نظر مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کیا۔

۱:- مسلم رابطہ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اپنا رہنما تسلیم کرنے سے انکار کریں۔

۲:- الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریسی امیدوار کھڑے کئے گئے۔

۳:- کانگریسی وزارتوں میں۔ ان مسلمانوں کو شامل کرنے سے انکار کیا گیا۔ جنہیں جداگانہ انتخاب کی رو سے اپنی قوم کا اعتماد حاصل تھا اور جو اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کے سبب زیادہ اہل تھے۔

۴:- اسمبلی کے ان ممبروں کو جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یا انڈی پنڈت منتخب ہو کر آئے تھے، وزارتوں اور عہدوں کا لالچ دیکر۔ کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اور جب انہیں اس قسم کے ہتھکنڈوں سے خرید لیا گیا۔ تو شرافت کے تمام اصولوں کو

بانائے طاق رکھ کر۔ انہیں دوبارہ الیکشن لڑنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔

۵ :- ہر چند کہ کانگریس کا یہ دعوے تھا۔ کہ وہ کسی غیر کانگریسی ذریعہ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت نہیں بنائے گی۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں۔ کانگریس نے اس اصول کو آسانی سے ترک کر دیا۔ اس نے پہلے تو مسلمانوں کے اندر سچھوٹ ڈالی۔ اور پھر ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر۔ ان کی وزارتوں کو توڑا۔ اور اپنی مخلوط وزارتیں قائم کیں۔

۱۶۔ کانگریس نے اقلیتوں کے آئینی تحفظات کا قلع دقح کر دیا۔ اور صوبوں میں وحدانی وزارتیں قائم کر کے نیز دوسرے قابل اعتراض ذرائع اختیار کر کے۔ ایسی جمہوری حکومتوں کے قیام کے تمام امکانات کو ختم کر دیا۔ جن میں باہمی مشاورت اور یگانگت سے نظام سلطنت چلایا جاتا ہے۔ بقول مسٹر جناح کے کانگریس نے اس طرح اپنی منطابیت کا ثبوت دیا۔

مسٹر جناح ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ۔ اور مخلوط انتخاب کو قبول کر لینے پر بالکل آمادہ تھے۔ لیکن وہ صرف یہ چاہتے تھے۔ کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے

اس نازک موقع پر سخت بے دردی سے جناح کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور میچولی سی ترمیم منظور کرنے پر بھی راضی نہ ہوئے۔

مسلماً آٹھ برس تک حالات نامساعد کا شکار رہنے کے بعد بھی۔ جناح نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اب ستمبر ۱۹۳۷ء میں انہوں نے پھر کانگریس کی طرف انہوت و محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن مولیٰ لال کے جواں بخت و جواں سال صاحبزادے نے حد درجہ تلخ و حقارت سے کام لے کر۔ اس ہاتھ کو پھر جھٹک دیا۔ اور علی الاعلان کہا کہ ہم جناح کے تعاون کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم تو مسلم لیگ کی اینیٹ سے اینیٹ بجا کر دم لیں گے۔

تعجب ہے کہ وہ نامور باپ اور یہ نامور بیٹا۔ دونوں گنگا نہا کر قوم پرست کے قوم پرست۔ اور محبت وطن کے محبت وطن بنے رہے۔ اور جناح غریب پر فرقہ پرستی اور وطن دشمنی کا الزام لگا گیا۔

طعنہ بریفیضی مزین زاہد پریس از گلبرغاں

پاکدامانی رندان گریباں چاک را

۲۴۲

# سکندر جناح سیکرٹری

(۱)

گذشتہ باب میں کانگریس کی جن سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کا اثر پنجاب پر بھی پڑا۔ اس بلے میں مسلم لیگ کی پوزیشن بالکل صاف تھی۔ ہم لوگ کھلے میدان میں کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ کانگریس خواہ کسی پہلو اور کسی زاویے سے حملہ آور ہوتی۔ اور جو حربہ چاہتی استعمال کرتی۔ لیگ مسلمانان پنجاب کی مدافعت کے لئے ہمہ اوقات مستعد تھی۔ فکر یہ نہ تھا کہ کوئی۔ جن کی یونینسٹ پارٹی کے ٹوسے فی صدر کان مسلمان تھے۔ اور جو ان مسلمانوں کو اپنی جماعت میں شامل رکھنے کے لئے۔ ایک ایسی مخلوط پارٹی کے محتاج تھے۔ جو بڑے خود چند سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر کھڑی کی گئی تھی۔ اب کانگریس کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام سے ہونے والا تھا۔ اس مقابلے میں۔ اگر

یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبر کٹ کر کانگریس میں شامل ہو جاتے۔ تو یونینسٹ پارٹی ختم ہو جاتی۔ اور اگر سندھ، سرحد اور آسام کی طرح خود مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ کانگریس کا ہم نوا بن جاتا۔ تو بھی یونینسٹ پارٹی کے مٹ جانے میں کوئی شک باقی نہ تھا۔ سر سکندر گویا ایک محضے میں گرفتار تھے۔ اگر وہ کھلے بندوں۔ کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے۔ میدان میں اتر آتے۔ تو یونینسٹ پارٹی کا بھرا نا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر وہ خاموشی سے تماشادیکھتے۔ اور محض اپنے اقتصادی پرکرام پر اعتماد کر کے۔ بیٹھ رہتے۔ تو کانگریس کی یلغار کے سامنے ان کی وزارت کا بہت دنوں تک قائم رہنا محال تھا۔ صوبے کے تمام ہندو اخبارات کانگریس کی لٹپٹ پر تھے۔ اور ہندوؤں کی بے اندازہ دولت۔ کانگریس کو اپنے پرپاگنڈے کے لئے۔ ہر وقت میسر آ سکتی تھی۔ مسلمان اخباروں میں سے صرف روزنامہ انقلاب یونینسٹ پارٹی کا حامی تھا۔ ذمیدار، احسان اور سیاست اس پارٹی کے ہم نوا نہیں تھے۔ ان حالات و خطرات کو دیکھ کر۔ یونینسٹ پارٹی کے بعض ذمہ دار ارکان نے ذہنی زبان سے مسٹر جناح کی تعریف و توصیف اور مسلم لیگ کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ حکومت پنجاب کے چیف پارلیمنٹری سیکریٹری میاں احمد یار خاں دولت نامہ نے۔ اس تعریفی مہم کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:

”مسلمانان ہند نے اپنے لئے جو سیاسی تحفظات حاصل کئے ہیں انہیں یقیناً اس وقت تک قائم رہنا چاہیے۔ جب تک کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مستقل مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ اس بائے میں تمام مسلمان متحد رہیں۔ اس لئے کیا یونینسٹ۔ اور“





صوبے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

کانگریس کے اس "سندھوستان گیر" نظام کا جواب صرف آل انڈیا مسلم لیگ کا "سندھوستان گیر" نظام ہی ہو سکتا تھا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق اور پنجاب میں سر سکندر جیات آہستہ آہستہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے جا رہے تھے۔

پنجاب کا دورہ کرتے وقت۔ اور عوام تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے ہوئے ہم ہمیشہ یونینسٹ پارٹی پر سخت اعتراض کرتے تھے۔ اور اس کے وجود کو مسلمانوں کی قومی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ لیکن اب کانگریس کی رویش نے۔ ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا تھا۔ کہ مسلمانان پنجاب کو اس خطرے سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ جو کانگریس کی یوریش سے چاروں طرف پیدا ہو رہا تھا۔

دس دس، پندرہ پندرہ ہزار کے مجمع میں۔ ہمیں تقریریں کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لوگ ہماری تقریریں سن کر سوچتے تھے۔ کہ اگر کانگریس نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تو اس کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ اگر کانگریس نے جداگانہ انتخاب کو اپنی شاطرانہ چالوں سے کالعدم کر کے رکھ دیا ہے۔ تو آئندہ جداگانہ انتخاب کا بدل کیا ہوگا؟ اگر کانگریس نے وزارتوں کی رشتہ اور عہدوں کا لالچ دے دے۔ کہ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ جیسی قومی جماعت سے۔ غداری کرنے کا سبق سکھایا ہے۔ تو اس قسم کے ناقابل اعتبار ممبروں کو قومی زندگی سے کیونکر خارج کیا جاسکے گا؟ اگر سندھ، سرحد اور آسام میں کانگریس اپنے اصولوں سے منحرف ہو کر۔ مسلمانوں کی قومی جمعیت کو پارہ پارہ

کر سکتی ہے تو پنجاب کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا کیا طریقہ ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ سادہ، ناخواندہ اور سیاسی مسائل سے بے خبر مسلمان عوام کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ مخلوط یا کولیشن وزارت کسے کہتے ہیں۔ اور ایک پارٹی کی وحدانی حکومت کیا چیز ہوتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت کیا شے ہے اور آیا جداگانہ انتخاب کی موجودگی ہیں۔ اس قسم کی پارلیمنٹری جمہوریت قائم بھی رہ سکتی ہے یا نہیں۔ تاہم جب عوام کو صاف، سیدھی زبان میں یہ بتایا جاتا تھا کہ کانگریس نے ان مسلمانوں کو وزارت کی گدھی پر بٹھا دیا ہے۔ جن کو سو میں سے ننانوے مسلمان اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ تو بات فوراً ان کی سمجھ میں آجاتی تھی۔

۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں احتجاج مہماتھا۔ تو احتجاج کرنے والوں میں۔ تعلیم یافتہ لیڈروں کے پہلو بہ پہلو عوام بھی شامل تھے۔ اُس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے تمام منتخب شدہ ممبروں نے ووٹ دیا تھا۔ کرنل دیوچوڈ اس بات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”میرا خیال ہے۔ کہ ہندوستانی عوام کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو ایک لاکھ میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جسے یہ معلوم ہو۔ کہ رولٹ ایکٹ کیا چیز ہے۔ تاہم وہ لوگ یہ ضرور جانتے ہیں۔ کہ جن ممبروں کو انہوں نے منتخب کر کے اسمبلی میں بھیجا تھا۔ ان میں سے سونی صد نے اپلا استثناء اس ایکٹ کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود حکومت نے اس قانون کو ملک پر ٹھونسنے سے دریغ نہیں کیا۔ عوام کا یہی احساس گذشتہ فسادات کا سبب سے

بڑا سبب تھا۔

کم و بیش یہی حقیقت ہم مسلمان عوام کے ذہن نشین کرتے تھے۔ کہ کانگریس نے مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا ہے۔ اور مسلمان قوم کے نمائندوں کے احتجاج کو نظر انداز کر کے۔ اپنی مرضی، اپنی صوابدیا اور اپنی بہت دوسری سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ صوبائی خود مختاری کے نفاذ کے بعد۔ ہندوستان میں ایک وفاق یعنی فیڈریشن قائم ہونے والا ہے ظاہر ہے۔ کہ اس وفاق میں بھی کانگریس کو ناقابل ترمیم اور مستقل اکثریت حاصل ہونے کا یقین اس صورت میں۔ کانگریس وہاں بھی مسلم لیگ کے ساتھ وہی سلوک کرتی۔ جو اس نے چھ صوبوں میں کیا تھا۔ ان حالات میں صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ مستقبل نہایت تلخ اور یاس انگیز ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا ہم شکست قبول کرتے۔ اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتے۔ اور یا ہم کا چیلنج قبول کرتے۔ اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ جنگ جاری رکھتے۔ ہم نے دوسری صورت کو زیادہ عزیز اور آبرو مندانا سمجھ کر قبول کر لیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ۔ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں :

" THE LAST OF THE RADICALS."

By C.V. WEDGWOOD. Page 130

۱۹۳۷ء میں۔ جب کانگریس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگریسی وزارتیں مرتب کیں۔ اور اُس کے ساتھ مسلم رابطہ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی۔ تو مسلمانوں کو ہفات نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان اسباب نے بل کو مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ لیکن کانگریس کے اس چیلنج کو، جو اُس کے نزدیک بکبر و عزت اور نشہ اقتدار کا نتیجہ تھا، بخوشی قبول کر لیا۔ . . . . مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اُس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوے کیا۔ اور کانگریس کو ایک سراسر ہندوانہ جماعت قرار دیا۔ ۱۷

ہندوستان کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک وسیع لہر جاری تھی جب کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں وہ مشہور زمانہ تشریحی عرض رقم میں آئی۔ جس نے بعد ازاں سکندر جناح پکیٹ کے نام سے خاص قسم کی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ تحریر، جسے اُس وقت قومی اتحاد کی ایک گہراں مایہ دستاویز سمجھا گیا، اہل اوسہلا کہا گیا تھا، آگے

"INDIA'S HINDU-MUSLIM QUESTION"

By BENI PARSHAD, Page 76

چل کر پنجاب کی سیاسیات میں ایک اہم اور فیصلہ کن حصہ لینے والی تھی۔  
 تمام حالات و واقعات کو جرح و تنقید کی عینک سے دیکھنے کے بعد۔ میں آج  
 اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سکندر جناح پکیٹ ایک ایسی تحریر تھی جس کے نتائج  
 بڑے افسوسناک ثابت ہوئے۔ اسی تحریر نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو عملاً ختم  
 کر کے رکھ دیا۔ اسی تحریر نے لیگ کو ایک عوامی جماعت بننے سے روک دیا۔ اسی  
 تحریر نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی  
 تحریر کا سہارا لے کر ۱۹۴۶ء میں ملک خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت  
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پنجاب کے مسلمان عین اُس وقت دو حصوں میں تقسیم  
 ہو گئے۔ جب اُنھیں اتحاد و اتفاق کی سخت ضرورت تھی ۱۹۴۶ء کے انتخابات  
 کے بعد ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ ہیں بالواسطہ اُسے بھی سکندر جناح پکیٹ  
 ہی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ ایک فریق اس پکیٹ کے وجود ہی سے انکار کرتا تھا۔  
 اور دوسرا فریق اس پکیٹ کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔  
 ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ کیا وہ غلط تھا یا صحیح؟ اس پکیٹ کی جو  
 تعبیر وہ کرتے تھے۔ کیا وہ اُس میں حق بجانب تھے یا فریق مخالف راستی پر تھا؟ میں  
 سرورست اس مسئلہ سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ دونوں طرف  
 ضد کار نہ رہا تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ضد میں انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ ۱۹۴۶ء کے  
 انتخابات میں شکست کھانے کے باوجود۔ خضر حیات نے ہندوؤں اور سکھوں کے  
 ساتھ مل کر وزارت بنا ڈالی۔ یہی وزارت آنے والے فسادات کا پیش خمیہ ثابت  
 ہوئی۔ اور یہی فسادات تقسیم پنجاب کا سبب بنے۔ اور یہی تقسیم پنجاب تقسیم

سندھوستان کا موجب بنی۔ اور یہ سب کچھ بالواسطہ سکندر جناح پبلیٹیوٹی کا نتیجہ تھا۔

علامہ اقبال، اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح کو لکھتے ہیں :

” اہل پنجاب کی ایک بہت بڑی جمعیت مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے لکھنؤ پہنچ رہی ہے۔ یونینسٹ مسلمان بھی، سر سکندر حیات کی زیر قیادت، اجلاس میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔۔۔ لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے میں اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے۔ مسٹر غلام رسول کو دے دوں گا۔ وہ یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بڑے عذر سے ان اٹھائیس ممبروں کا انتخاب کریں گے۔ ہمارے آدمی ۱۳ کو لاہور سے روانہ ہونگے۔“

ڈاکٹر صاحب نے اٹھائیس آدمیوں کی جس فہرست کا ذکر کیا ہے۔ میں پہلے اُس کی وضاحت کر دوں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کو۔ جب لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے تھے۔ تو اُس موقع پر۔ یونینسٹ پارٹی نے کھلم کھلا لیگ کے خلاف بنیادوں کی تھی۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح سے کہا تھا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کو۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر بھی ہیں۔ کونسل سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن مسٹر جناح نے بعض مصلحتوں سے اُن باقی ممبروں کو سزا دینا مناسب نہ سمجھا۔

۱۔ اقبال کے خلیفہ اقبال کے نام (پتہ: نئی دہلی، نئی دہلی)

اب کہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ کہ یونٹیٹ پارٹی کے باغی ممبروں کو، جن کی تعداد اٹھائیس تھی، لیگ کونسل میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اس لئے ان کی جگہ اٹھائیس مخلص آدمیوں کو نامزد کیا جائے، ڈاکٹر صاحب نے خود ان اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے، غلام رسول خاں کو دی تھی، لیکن یونٹیٹ پارٹی کے یہ اٹھائیس ممبر دستور لیگ کونسل میں شریک ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ازراہ لطف و کرم، جن لوگوں کے بارے میں "ہمارے آدمی" کا لفظ استعمال کیا ہے، ان میں ملک برکت علی، میاں غلام رسول خاں پیر تاج الدین، میاں عبدالمجید، ملک زمان مہری، خلیفہ شجاع الدین اور یہ خاکسار شامل تھے۔ ہمارے ساتھ راجہ عبدالعزیز اور اللہ بخش سلیم بھی لکھنؤ گئے تھے۔ راجہ عبدالعزیز کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں، کہ وہ ہائی کورٹ کے پار روم میں سٹی کلرک تھے، لیکن فرصت کے اوقات میں، لیگ کے دفتری امور میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور انگریزی مسودے ٹائپ کرنے کا سارا کام ان کے سپرد تھا۔ اللہ بخش سلیم پنجاب مسلم لیگ کے دفتری کلرک تھے، اور زندگی و زندہ دلی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ، اور بہت سی خوبیوں کے مالک انسان تھے۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں پنجاب سے اکثر لوگ شریک ہوئے تھے۔ مثلاً مسٹر حمید نظامی، جو اس وقت اسلامیہ کانج لاہور میں طلبہ کی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں، میاں فیروز الدین احمد

ملک لال دین قیصر۔ میاں بشیر احمد۔ حاجی امین الدین صحرائی وغیرہ۔ یونیورسٹی پارٹی کا چوتھا نمبر چنا تھا۔ اس میں سر سکندر۔ ملک خضر حیات ٹوانہ میاں عبدالحئی۔ نواب نثار علی خاں۔ میاں احمد یار خاں دولت آباد۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں امیر الدین بیگم شاہنواز۔ سید محمد علی۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ میر مقبول محمود۔ سید افضل علی حسنی۔ نواب ممدوٹ۔ میاں غیاث الدین۔ سر شیر محمد خاں۔ نواب منظر خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ روزنامہ رسول اینڈ ملٹری گزٹ لاسہور کے نامہ نگار سید نورا احمد بھی تھے جو یونیورسٹی پارٹی کے حسبِ منتا اور سر سکندر کی پسند کے مطابق خیرین تہب کر کے اپنے اخبار کو بھیجتے تھے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی رات کو۔ محمود آباد سوس میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تھا۔ اور صدارت کی کرسی پر مسٹر جناح کی بجائے نواب اسماعیل خان بیٹھے تھے۔ جلسے کی کارروائی بڑی بے کیفیت ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کر ٹھوڑی دیر کے لئے باہر آ گیا۔ اتنے میں غلام رسول خاں میرے برابر سے گزے۔ میں نے پوچھا کہاں کے دھاڑے ہیں؟ کہنے لگے۔ ”مسٹر جناح کے کمرے میں سرسکندر حیات سے کچھ لکھتے پڑھتے ہوئے لگی ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔“

ہم مسٹر جناح کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو سامنے میز کے گرد مسٹر جناح سرسکندر ملک برکت علی اور میر مقبول محمود بیٹھے تھے۔ دروازے کے قریب دو کرسیاں پڑی تھیں۔ غلام رسول خاں اور میں وہیں بیٹھ گئے۔ ملک برکت علی کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ لکھ چکے تو انہوں نے



کانڈسٹر جنرل کو دے دیا۔ مسٹر جناح نے پڑھ کر وہی کانڈسٹر سکندر کے حوالے کر دیا۔ مسٹر سکندر نے جب مسودہ پڑھا۔ تو عفتے میں آکر کہنے لگے: ہم نہیں ملتے ملک صاحب تو ہماری وزارت توڑنے کے درپے ہیں۔ اس پر ملک برکت علی مسٹر سکندر اور میر مقبول محمود کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ اب مسٹر جناح نے مسٹر سکندر سے لکھنے کو کہا۔ انہوں نے میر مقبول محمود سے کہا۔ جب میر مقبول محمود لکھ چکے۔ تو مسودہ باری باری مسٹر جناح، ملک برکت علی اور مسٹر سکندر نے پڑھا۔ ملک برکت علی نے چند اعتراض کئے۔ اور شاید سوچے میں کہیں ایک آدھ جگہ کچھ تبدیلی بھی کی گئی۔ اس ساری کارروائی میں کافی وقت خرچ ہوا۔ میرا خیال ہے اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ مسٹر جناح فارغ ہو کر۔ سید لیگ کونسل میں چلے گئے۔ اور ان کے جانے کے بعد۔ مسٹر سکندر بڑی گرم جوشی سے ملک برکت علی سے بخلگیر ہو گئے۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس منٹ کے بعد۔ ہم پانچوں آدمی بیک وقت لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ جوہی مسٹر سکندر نے اندر قدم رکھا۔ سارا ہنڈال تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا۔ بہت سے لوگ تو اپنا جوش مسرت ضبط نہ کر سکے۔ اور بے تابانہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کے روتے نے اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ایک خاص قسم کی دہشت اور سرآگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور وہ بڑے ہراساں ہو کر۔ اسلامی اکثریت کے صوبوں کی طرف امداد و اعانت کے لئے دیکھ رہے تھے۔ مسٹر سکندر کی ذات کو یا اس بات کی علامت بن گئی تھی کہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر جن پنجاب اقلیت کے صوبوں کے

مسلمانوں کی پشت و پناہ بننے۔ اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کو تیار ہے  
اسی احساس نے اُس وقت لیگ کونسل کے پنڈال میں۔ ایک ہرے سے  
دوسرے ہرے تک۔ مسرت و شادمانی کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔

مسٹر جناح نے کھڑے ہو کر۔ سرسکندر کو خوش آمدید کہا۔ اور فرمایا۔ کہ سر  
سکندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ ادرآن کی جماعت کے تمام ارکان مسلم لیگ میں شامل  
ہو جائیں گے۔

مسٹر جناح کے اس ارشاد پر پھر پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ اور  
حاضریں کے چروں پر ایک ایسی مسرت و طمانیت کے آثار نظر آنے لگے جیسے  
میدان جنگ میں تازہ دم لٹکنے کے پہرے چرخے جانے سے ہتھکی ہوئی فوج کے اندر  
نئی زندگی کی رُو دوڑ جاتی ہے۔

سرسکندر نے پلیٹ فارم پر جا کر۔ ایک نہایت سچی تلی اور موزوں تقریر کی اور  
مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے۔ اعلان کیا۔ کہ وہ اپنی جماعت سمیت  
مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ پھر ذیل کی تحریر پڑھ کر سنائی گئی۔ جو ابھی نصف  
گھنٹہ قبل مسٹر جناح کے کمرے میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔

سکندر جناح پبلیٹ (۱) سرسکندر حیات خاں نالپس پنجاب  
جا کر۔ اپنی پارٹی کا ایک خاص جلسہ

منعقد کریں گے۔ جس میں پارٹی کے اُن تمام مسلمان ممبروں کو۔ جو ابھی  
تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے۔ ہدایت فرمائیں گے۔ کہ وہ سب مسلم لیگ  
کے حلف نامے پر دستخط کر کے۔ لیگ میں شامل ہو جائیں۔ انہیں حالات

وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

(ب) اس معاہدے کے قبول کے بعد آئندہ مجلس قانون ساز کے عام اور ضمنی انتخابات ہیں۔ وہ متعدد فریق۔ جو موجودہ یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

(ج) یہ کہ مجلس قانون ساز کے وہ مسلم ارکان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ یا اب لیگ کی رکنیت قبول کرتے ہیں۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے۔ اس قسم کا تعاون انتخابات کے ما قبل یا بعد ہر دو صورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی پر تکرار رکھے گی۔

(د) مذکورہ بالا معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سر نو عمل میں لائی جائے گی۔

مذکورہ بالا تحریر جو آگے چل کر سکندر جنج پبلیٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ خالص قانونی یا عدالتی اصطلاح میں معاہدہ نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس پر

مسٹر جناح کے دستخط نہیں تھے۔ یہ ایک بیان تھا۔ جو سر سکندر کی طرف سے لیگ کونسل میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ سر سکندر نے اپنے اور اپنی جماعت کے آئندہ طرز عمل کے بارے میں چند وعدے کئے تھے۔ اور ان وعدوں کا لیگ کونسل میں اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے سکندر جناح پبلیٹ کا جو مسودہ مرتب کیا تھا۔ اُس پر مندرجہ ذیل سطریں تہنید کے طور پر درج تھیں۔

”آج سر سکندر حیات خاں اور مسٹر جناح کے درمیان تباہ کن خیالات سہا۔ جس کے بعد اول الذکر دعوتِ خصوصی پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل اعلان کیا گیا۔“

یہ پبلیٹ بڑا مبہم، غیر واضح اور گومگو تھا۔ جس میں نہ مسلم لیگ کی حیثیت واضح کی گئی تھی۔ اور نہ یونینسٹ پارٹی کا موقف کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ سر سکندر اپنی جگہ خوش تھے کہ انھیں کانگریس کے مقابلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اور اب کانگریس اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو برگشتہ نہیں کر سکے گی۔ اور مسٹر جناح اپنی جگہ مطمئن تھے کہ پنجاب کا ذریعہ اعظم لیگ میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لئے لیگ کی نمائندہ حیثیت مسلم ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ کانگریس مسٹر جناح کو بار بار طعن دیتی تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کو کوئی پوچھنا نہیں۔ یہ صرف اسلامی اقلیت کے صوبوں کا شور و غوغا ہے۔ اس طعن کا بہترین جواب یہی تھا کہ

پنجاب اور بنگال کے وزراء اعظم مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے اسی اجلاس میں مولوی فضل الحق اور مسٹر محمد سعد اللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

پروقیہ کوپ لینڈ لکھتے ہیں :

”ان تینوں مسلمان وزراء نے اعظم کی شرکت نے مسلم لیگ میں زندگی کی جو روح پھونکی۔ وہ کام پُر جوش تقریروں سے زیادہ تھی۔ مسٹر جناح کا شمار اگرچہ ہمیشہ ہندوستان کی صفِ اول کے لیڈروں میں ہوتا رہا ہے۔ لیکن انہیں اب تک اپنی قوم کی مجموعی اور غیر مشروط تائید کبھی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے قائد اعظم ہونے کی بجائے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ انہیں سیاست کے بائیس بازو کا ایک ایسا لیڈر خیال کیا جاتا تھا جو بڑا بڑی اقتدار کا سخت مخالف اور ہندوستانی قومیت کے لیے خود ممبر اور تھا۔ انہی حضرات کی بنا پر قدامت پسند مسلمان انہیں کانگریس کا حامی سمجھنے پر مجبور تھے۔ لیکن اب جناح کی حیثیت یہ نہیں رہی تھی وہ مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں میں سے ایک لیڈر نہیں تھے۔ بلکہ وہ پوری قوم کے تنہا اور واحد نمائندہ لیڈر بن گئے تھے“

سکندر حیات، فضل الحق اور سعد اللہ کی شرکت نے۔ لکھنؤ کے اس اجلاس

کوٹومی اتفاق و اتحاد کا بڑا دل خوش کئے منظر بنا دیا تھا۔ لیگ کی حیثیت یقیناً بڑی بلند ہو گئی تھی۔ اور اور کانگریس کے سوراخ بھون اور اُس پر برطانوی حکومت کے ایوان میں بھی لہجہ چلتی نظر آئے لگی تھی۔ لیکن جوش و خروش اور اتفاق و اتحاد کے ان روح پرور مناظر میں کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ کہ یہ تحریر جو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے موسوم کی جا رہی ہے۔ آگے چل کر کن حوادث کا موجب اور کن پریشانیوں کا سبب بننے والی ہے۔

اس جگہ یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ لکھنؤ میں کسی شخص نے اس تحریر کو پیکٹ یا میثاق قرار نہیں دیا تھا۔ تمام لوگ اُسے سر سکندر حیات خاں کا ایک اعلان سمجھتے تھے۔ ہیل بلٹری گزٹ کے نامہ نگار پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے اخبار کو مراسلہ بھیجے وقت اس دستاویز کو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ بعد میں یہ لفظ اس قدر چل نکلا۔ کہ اپنے اور بیگانے، دوست اور دشمن حتیٰ کہ اقبال اور جناح بھی اُسے سکندر جناح پیکٹ کہنے لگے تھے۔

جب ہم واپس لاہور آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ مسلم لیگ کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے حلقے میں اس پیکٹ پر سخت رنج اور افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے خود ناکٹر صاحب بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ اس پیکٹ کی دوسے یونین پارٹی کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ اور لیگ کو نالوئی حیثیت ملی ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی اس صورت حال سے خوش نہیں تھا۔ لیکن مصلحت وقت کا تقاضا تھا۔ کہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُس سے حتیٰ الوسع بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

سکندر جناح پکیٹ کی روشنائی بھی سنو زخاک نہ ہونے پائی تھی کہ سرسکند  
 چودھری چھوٹو رام۔ راجہ غضنفر علی خاں اور میر مقبول محمود نے اس کی عجیب و  
 غریب تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ لکھنؤ  
 میں جو کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ محض دکھاوے کا ایک کھیل تھا۔ ورنہ وہ یونینسٹ  
 پارٹی کی اجارہ داری میں رتی برابر کمی کرنے کو تیار نہ تھے۔ سب سے پہلے  
 سرسکندر نے سب کٹائی کی۔ اور فرمایا کہ

” جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ یہ معاہدہ مختلف جماعتوں پر  
 اثر انداز نہیں ہوگا۔ اور ان جماعتوں کی موجودہ حیثیتیں کوئی  
 فرق نہیں آئے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلمان ممبروں کو  
 جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ یہ مشورہ دیا جائے گا۔ کہ وہ لیگ کی  
 رکنیت بھی قبول کر لیں۔“

” جہاں تک عام یا ضمنی انتخابات کا تعلق ہے۔ اس معاہدے کا  
 یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ مسلمان جو مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہونگے۔ انہیں  
 الیکشن سے پہلے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ کامیاب ہونے کے بعد۔ وہ  
 فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح الیکشن میں  
 انہیں یونینسٹ پارٹی کی مدد بھی حاصل ہوگی۔“

” ان باتوں سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ پنجاب میں اس وقت  
 جو جماعتیں جس جس طرح کام کر رہی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔“

۱۹۳۴ء مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء

سر سکندر کے اس بیان سے پہلے۔ سول ملٹری گزٹ کے نامہ نگار لکھنؤ سے جو رپورٹ اپنے اخبار کو بھیجی تھی۔ وہ اپنے مطالبہ و معافی کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ

”..... سر سکندر یونیٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ کے بھی ممبر بن جائیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی۔ اور اس بورڈ پر عملاً یونیٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ یہ بورڈ تمام ضمنی انتخابات میں یونیٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار کھڑے کرے گا۔ اور آئندہ عام انتخابات میں مسلمان امیدواروں کو اس شرط پر مسلم لیگ ٹکٹ دیا جائے گا کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد یونیٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونیٹ پارٹی کے غیر مسلم امیدواروں کی بھی مدد کرے گا۔ اسی طرح یونیٹ پارٹی لیگی امیدواروں کی بھی ہر طرح امداد و اعانت کرے گی۔“ لہ

راجہ غضنفر علی خاں نے اس پکیٹ کی جو تعبیر کی۔ اسے بے ربطی بیان اور زولیدگی فکر کا شاہکار کہنا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ

”..... میرے خیال میں اس معاہدے کی عبارت استفادہ صاف ہے۔ کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش ہو نہیں سکتی۔ پنجاب کی مجلس

لہ سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء



قانون ساز میں۔ اس وقت جو جا عتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کی حیثیت  
 من و عن یہی رہے گی۔ اور سکندر جناح پیکیٹ اُس میں قطعاً کوئی رد و بدل  
 نہیں کرے گا۔ اقتصادی پروگرام کے اعتبار سے۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ  
 پارٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ مسلم لیگ  
 کے پروگرام کی ایک بنیادی شق ہے۔ اسی طرح یونینسٹ پارٹی  
 بھی اقلیتوں اور پس ماندہ اقوام کے مفاد کی نگہداشت کو اپنا  
 اولین مقصد سمجھتی ہے۔ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے پارلیمنٹری  
 بورڈ خود مختار و قائم بالذات ہیں۔ اور ان دونوں جماعتوں کو  
 صوبائی اسمبلی میں اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل  
 ہے۔ اندر میں حالات یہ کہنا بالکل عورست ہے۔ کہ سکندر جناح پیکیٹ  
 کی رو سے یونینسٹ پارٹی کے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں  
 ہوگی۔ اور یونینسٹ پارٹی اور موجودہ وزارت کے دوسرے  
 فریقوں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔  
 اصل بات یہ ہے۔ کہ جب دل میں چرچہ ہو۔ نیت میں فتور ہو۔ اور عمل میں  
 کھوٹ ہو۔ تو الفاظ کی بڑی سے بڑی جادوگری بھی حقیقت پر نقاب نہیں ڈال  
 سکتی۔ یہی حال یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کا تھا۔ وہ اپنے قول و فعل کے  
 تضاد کو۔ قسم قسم کے پردوں میں چھپانا چاہتے تھے۔ لیکن بات پھر بھی ذہنی

۱۰ سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

سختی۔ ایک طرف انہیں یہ خطرہ لاحق تھا۔ کہ اگر مسلم لیگ کے دامن میں پناہ نہ لی۔ تو کانگریس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے۔ یونینسٹ پارٹی کے جزو اعظم یعنی مسلمان ممبروں کو مجتمع رکھنا محال ہو جائے گا۔ دوسری طرف وہ چودھری چھوڑ رام سے آنکھیں چاڑھتے ہوئے گھبراتے تھے۔ کہ کہیں مسلم لیگ کی شرکت کی وجہ سے ان پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ کا ڈرامہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو گیا ہے۔ پنجاب میں اس کا چرچا نہیں ہونا چاہیے۔ اب چودھری چھوڑ رام آگے بڑھے۔ اور انہوں نے ایک طویل بیان میں۔ سکندر جناح پکیٹ کی تعبیر فرمائی

## چودھری چھوڑ رام کا بیان :-

سکندر حیات کا جو بیان۔ ۱۵ اکتوبر کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اس سے عاصدوں اور بدخواہوں نے تین نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان تینوں اخذ کردہ نتائج کو دیکھ کر۔ مجھے وہ پیمانہ متزلزل یاد آ گیا ہے۔ کہ خیال دراصل خواہش کی پیداوار ہے۔

وہ تین نتائج جو دشمنوں نے اس بیان سے اخذ کئے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

(ا) سکندر نے مسٹر جنل کے سامنے گلے نیک دیئے ہیں۔

(ب) سکندر جناح پکیٹ کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کو

توڑ دیا جائے گا۔

رج) مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کانگریس صوبوں میں ہے۔

گذشتہ سال، یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان جو بلا نتیجہ گفت و شنید ہوتی رہی تھی، مجھے اُس کا حال معلوم ہے، کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر کس طرح اس بات کے دل سے خواہش مند ہیں، کہ مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں، کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر، آل انڈیا مسائل میں اتفاق و اتحاد، اور یک جہتی قائم کرنے کے کس درجہ خواہاں ہیں۔ اپنی اپنی معلومات کی بنا پر، میں نے مذکورہ بالائے نیاں نتائج کو درخور اعتناء سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ سر سکندر نے لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت، جو بیان اخباروں کو دیا تھا، اُس سے میرے ان خیالات کی کئی تصدیق ہو گئی ہے۔

باہیں ہمہ۔ اگر سر سکندر کے صرف پہلے بیان ہی پر غور کیا جائے، تو اُس سے بھی حاسدوں کی مطلب براری نہیں ہو سکتی، اگرچہ میں جانتا ہوں، کہ سر سکندر نے یہ بیان نہایت رُواری اور جلدی میں دیا تھا، جس سے اُن کا مفہوم بخوبی ظاہر نہیں ہو سکا، لہذا یہ کہنا کہ سر سکندر نے مسٹر جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے ہیں، ایک ازراں قسم کا اور عامیانا مذاق ہے، باقی یہ بات، کہ یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا جائے گا، اُس کے متعلق مجھے اپنے سیاسی حریفوں سے صرف اتنا عرض کرنا ہے، کہ وہ اطمینان رکھیں، اُن کی یہ آرزو کبھی بر نہیں آئے گی، اور اُن کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا، سر سکندر کے بیان میں اس امر کا

اشارہ تک بھی نہیں ہے، اس کے برعکس انہوں نے صاف کہا ہے کہ یونینٹ پارٹی قائم و دائم رہے گی۔ سرکندہ نے اپنے اس بیان میں تین مختلف موقعوں پر ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے۔ اور کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔ مثلاً

(ا) یہ پیکٹ موجودہ کولیشن یعنی یونینٹ پارٹی کی ہستی پر قطعاً اثر انداز

نہیں ہوگا۔

(ب) آئندہ ضمنی اور عام انتخابات میں وہ متعدد فریق جو یونینٹ

پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں متحد ہو کر ان امیدواروں کی مدد

کریں گے۔ جن کو یہ فریق کھڑا کریں گے۔

(ج) موجودہ مشترکہ پارٹی کا نام بدستور یونینٹ پارٹی رہے گا۔

اب آئیے اس قیاس اور امکانات کی طرف دیکھیں کہ مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل

ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کانگریس صوبوں میں ہے۔ اس بارے میں

میں صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے جس شخص کو سیاست

کا فدا ساشعہ ہے۔ وہ ایسی صورت حال کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کانگریس کو

کانگریس صوبوں میں جو اختیار اقتدار حاصل ہے۔ وہ صرف اس حد تک محدود

ہیں کہ ایک سیاسی پارٹی کی مرتبہ کر کے وزراء کے سپرد کر دی جائے۔ بلکہ کانگریس

ان صوبوں کی حکومت۔ اور اس حکومت کے عملہ محکموں کی ایک ایک تفصیل پر

کڑی نظر رکھتی ہے اور خفیہ سے خفیہ جزئیات بھی کانگریس کی مرضی کے بغیر

لے نہیں سہ سکتیں۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ کانگریس وزراء میں کانگریس کی

اس روزمرہ مداخلت سے سخت تالاں ہیں۔ اور اگر کانگریس نے اپنے رویے میں تبدیلی  
 کی، تو بہت ممکن ہے کہ کانگریسی وزارتیں یا تو علم بغاوت بلند کر دیں، اور یا اس  
 ناچار خارجی دباؤ کے تحت اپنی ہستی ہی کو ختم کر ڈالیں گی۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ اگر ہندوستان کے کسی صوبے میں مسلم لیگ کو قطعی اکثریت  
 سبھی حاصل ہو جائے، تو سبھی مسٹر جناح ایسا عقل مند اور تجربہ کار آدمی کہیں اس غلطی  
 کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ جو کانگریس سے سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ کانگریس کو حکمرانی  
 کے طرز طریقوں کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پنجاب میں نہ مسلم لیگ کو نہ یونینٹ  
 مسلمانوں کو اور نہ مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو۔ ایسی اکثریت حاصل ہے۔ کہ وہ تنہا  
 اپنے بل پر حکومت کا نظم و نسق چلا سکیں۔ اس لئے یہاں وزارت چار عناصر پر  
 مشتمل ہے۔ یعنی یونینٹ مسلمان، یونینٹ غیر مسلم، پروگریسیو یونینٹسٹ اور  
 خالصہ یونینٹسٹ۔ تعجب ہے کہ ان حالات میں مسلم لیگ کو پنجاب میں وہ حیثیت  
 کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ جو کانگریسی صوبوں میں کانگریس کو حاصل ہے۔ ہر  
 چند کہ لیگ کانگریس کی غلطی کا اعادہ کرنے ہی پر کیوں نہ آتا رہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو بیان جاری کیا ہے۔ اس کے آخر میں درج ہے  
 کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس خبر  
 کو پڑھنے کے بعد ان لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیے۔ جو یہ مشہور کر رہے ہیں۔ کہ  
 یونینٹ پارٹی توڑ دی جائے گی۔ یا یہ کہتے پھرتے ہیں کہ، یونینٹ پارٹی کے ایڈ  
 نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

سر سکندر کے دوسرے بیان نے تو پوری صورت حال کو الم نشرح کیے رکھ

ویا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس پکیٹ کا پنجاب کی موجودہ پارٹیوں پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اور وہ پارٹیاں جوں کی ٹوں قائم رہیں گی۔" آئندہ عام اور ضمنی انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے سر سکندر نے کہا ہے کہ "ان مسلمان امیدواروں کو جو مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ اس بات کا اثر کرنا پڑے گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح انھیں الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کی حمایت بھی حاصل ہوگی۔" آخر میں سر سکندر فرماتے ہیں کہ "جہاں تک پنجاب کی موجودہ جماعتوں کے باہمی اشتراک یا ان کی ترتیب کا تعلق ہے۔ اس میں سرگز کوئی رد و بدل نہیں کیا جائے گا۔"

کیا ان واضح الفاظ کے بعد کہیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی شبہ رہتا ہے کہ اس پکیٹ کے باوجود یونینسٹ پارٹی زندہ و سلامت اور قائم و دائم رہے گی اور اسی پارٹی کے جھنڈے کے نیچے وہ تمام لوگ جمع ہوں گے۔ جو ناتواںوں۔ غریبوں۔ کمزوروں اور فلاکت زدوں کی امداد و اعانت کو اپنا مسلک قرار دیتے ہیں؟

سر سکندر کے واپس لاہور تشریف لانے پر مجھے اس معاملے کے متعلق ان سے گفتگو کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگرچہ ان کے دوسرے بیان کے بعد اس یقین دہانی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی (کہ حسب سابق یونینسٹ پارٹی پنجاب کی سیاسیات کا ایک مستقل عنصر ہے گی۔ اور اسمبلی کے اندر ادھ باہر۔ دونوں جگہ۔ یہ جماعت ہمیشہ غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر اپنا کام جاری رکھے گی۔ ہاں فرق صرف اتنا پڑا ہے۔ کہ اب یہ جماعت پہلے سے زیادہ جوش و خروش۔ اور مستعدی و گرم جوشی سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی۔ غالباً

ہلکے اس عزمِ صمیم ہی نے بدخواہوں پر اس طاری کردیلیے۔ امدادی ہراس کی وجہ سے وہ قسم قسم کی افواہیں اڑانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اگر محض قوم پرستانہ نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ذاتی طور پر میں اس پکیٹ کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہیں یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہ پکیٹ حالات و اوقات کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اس لئے قابلِ درگزر بھی ہے۔ کانگریس۔ ہندو سبھا اور تمام ہندو اخبارات نے ہندوستان کے اُن دو بڑے صوبوں کی حکومتوں کے خلاف جہاں مسلمانوں کی جڑوسی اکثریت ہے۔ جس شدت سے پراپاگنڈا جاری کر رکھا ہے یہ پکیٹ اُس کا ایک لازمی ردِ عمل ہے۔ مسلم اکثریت کے ان دو بڑے صوبوں کے مسلمانوں میں کچھ باہمی اختلافات بھی ہیں (جو یقیناً نہیں سونے چاہئیں) کانگریس اور ہندو سبھا ان اختلافات سے ہر ممکن فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے۔ ایسا ہونا کچھ بعید از فہم بھی نہیں۔ کیونکہ سیاسیات میں ہر فریق اپنے حریف کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا کرتا ہے۔ ان حالات میں مسٹر جناح اور سر سکندر ایسے تجربہ کار سیاست دانوں کی یہ کوشش بالکل فطری اور طبعی ہے کہ وہ غنیمت کے مقابلہ میں اپنی قوم کے اختلافات رفع کر کے۔ اُس میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔ یہی یہ عرض کہ دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اس پکیٹ سے یونینسٹ پارٹی کو بھی ایک ضمنی فائدہ پہنچے گا۔ وہ یہ کہ اس سے قبل مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان چپقلش جاری تھی۔ وہ اب ختم ہو جائے گی اور ہم اپنی مجموعی کوششوں کو۔ آپس میں سب دشتہم کرنے کی بجائے تعمیری کاموں پر صرف کر سکیں گے۔

"یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ یونینسٹ مسلمان۔ اب کی پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے۔ بلکہ ان میں سے اکثر دہشتگردوں سے قبل نہ بھی مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ اور ان کی رکنیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ گزشتہ الیکشن میں۔ جب لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ تو آپس کے تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ ہمارے وزیراعظم اب یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں۔ کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیے۔ اور جو لوگ لیگ میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں۔ بخوشی شامل ہو جائیں۔"

"مکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں۔ کہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد۔ یونینسٹ مسلمان بیک وقت دو ایسی جماعتوں کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی بجائے سکیں گے۔ جن میں سے ایک خالص فرقہ دارانہ ہے۔ اور دوسری غیر فرقہ دارانہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں چنداں فرق نہیں ہے۔ اس لئے یہاں باہمی تضادم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ باقی ہے خالص فرقہ داری اور مذہبی مسائل۔ اس بارے میں جو وقت مسلمانوں کو پیش آئے گی۔ وہی وقت یونینسٹ پارٹی کے سہروؤں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں ہمارا مسلک بالکل صاف ہے۔ ہم اس نوع کے تمام اختلافات کو باہمی مدداری سے برواشتہ کرنے کے قائل ہیں۔ اور ایک فرقہ کو زبردستی دوسرے پر اپنے عقائد مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"دو مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ بیک وقت اپنی ذمہ داری



نبھانے کا مسئلہ صرف یونینسٹ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ کانگریس، ہندو سبھا اور ہندو اخباروں کی اس بارے میں ہم پر طعنہ زنی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی کل کی بات ہے کہ پنڈت چوہدری لال ہنرد نے صوبہ بھارت متو ستہ کے کانگریسی ہندوؤں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندو سبھا کے سالانہ اجلاس میں شرکت نہ کریں۔ تو ہندو سبھا کے لوگ پنڈت ہنرد پر پٹری طرح برسے تھے۔ گو یا ہندو سبھا کے حامیوں کے نزدیک یہ فعل بالکل جائز اور مستحسن ہے کہ ایک شخص بیک وقت ہندو سبھا اور کانگریس ایسی دو متضارب جماعتوں کا ممبر بنا رہے۔

”اگر کانگریس کے موجودہ صدر کے خیالات و عقائد سے قطع نظر یہی کر لیا جائے۔ تو بھی اس بات کے بہت سے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں کہ لوگ بیک وقت ایک فرقہ دارانہ جماعت کے ممبر ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے ممبر رہتے ہیں۔“

۱۹۲۳ء کے انتخاب میں سیکھ لیگا اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں اکالی پارٹی نے اپنے امیدواروں کو جو ٹکٹ دیئے تھے انہیں کانگریس نے باضابطہ منظور کر لیا تھا۔

یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ خالص فرقہ دارانہ جماعتوں کے ٹکٹ قبول میں کانگریس نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ٹوکانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالوی، لالہ لاجپت رائے، سوامی شرودھانند، ڈاکٹر موہنجے اور مسٹر کیلکر ایسے نامور لوگوں کو ہمیشہ کانگریس میں بلند سے بلند منصب عطا

عطا ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ہندو سبھا کے گرتا دھرتا تھے۔

سر وزیر حسین اور سیٹھ یعقوب حسن راجو دراس کی کانگریسی حکومت میں وزیر ہیں، عرضہ دراز تک بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں شریک رہے ہیں۔

”مذکورہ بالا مثالیں معترضین کو دندان شکن جواب دینے کے لئے کافی ہیں۔ اگر ان مثالوں کے باوجود کانگریس یا ہندو سبھا یا ان جماعتوں کے لگے بندھے بدستور یونینسٹ پارٹی پر یہاں اعتراض کریں، گھراس پارٹی کے بہت سے ممبروں کی وفاداری دو حصوں میں منقسم ہے۔ تو ایسے بہت ڈہرم اور ہندی لوگوں کو صرف یہی جواب دیا جائے گا کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو“۔

میں نے چودھری چھوٹو رام کا یہ مکمل بیان اس لئے درج کیا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے نفسِ ناطقہ چھوٹو رام تھے۔ سکندر جات خاں نہ تھے۔ چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے شاہِ بنیاد تھے۔ اور ان کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتی۔

چودھری چھوٹو رام نے اپنے اس بیان میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ یقیناً سب سے زیادہ کے مشورے اور ایسے کہا ہو گا۔ سر سکندر جات خاں نے اپنی زبان سے کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہی باتیں انہوں نے چھوٹو رام کی زبان سے بے محابا

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء

کہلوا دیں -

جب سرسکندر - راجہ غضنفر علی خاں اور چودہری چھوٹو رام کے بیان یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ تو پنجاب کے مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ کہ سکندر جناح پکیٹ نے مسلم لیگ کو یونینٹ پارٹی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ لیگ کے دفتر میں بے درپے شکایتیں اور استغما آنا شروع ہو گئے۔ ہر شخص پوچھتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ آخند غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے مجبور ہو کر حقیقت کے چہرے پر سے پردہ اٹھایا۔ پہلے غلام رسول خاں نے اپنا مختصر سا بیان شائع کیا۔

## غلام رسول خاں کا بیان :-

در ۱۴ اکتوبر کو لکھنؤ میں جو سکندر جناح پکیٹ مرتب ہوا تھا۔ اس کی مختلف تاویلیں کی جا رہی ہیں۔ جنہوں نے قسم قسم کی غلط فہمیاں پھیلادی ہیں۔ پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں۔ کہ اصل صورت حال بیان کر کے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کروں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ ۱۴ اکتوبر کو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں سرسکندر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنی تقریر کے دوران حسب ذیل اعلان کیا تھا۔

راں وہ سر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔

(ب) واپس پنجاب جا کر۔ وہ پنجاب اسمبلی کے یونینٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ ٹکٹ قبول کر کے۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کریں۔ اس طرح یہ تمام مسلمان ممبر مجموعی طور پر مل کر پنجاب اسمبلی کے ایوان میں مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور یہ پارٹی آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ اور مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط کی پابند ہوگی۔

(ج) اس طرح اسمبلی میں جو مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں آئے گی۔ اسے اس امر کی آزادی ہوگی۔ کہ وہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، ممبر کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں، ایک کونیشن بنائے۔ اس کونیشن کا نام یونینٹ پارٹی ہوگا۔ لیکن یہ کونیشن اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی جداگانہ حیثیت کو قطعاً کوئی گزند نہیں پہنچائے گی۔

مذکورہ بالا اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ایسی کونیشن انتخاب سے پہلے بھی وجود میں آ سکتی ہے اور انتخاب کے بعد بھی۔

(د) اس معاہدہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آئندہ ضمنی اور عام انتخابات کے لئے۔ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے ہر سہ سے تشکیل کی جائے گی۔" ملہ

لہ سول ملٹری گزٹ، مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

## ملک سیرکت علی کا بیان :-

”آزویل سر جھوٹو رام نے سکندر جلع پکیٹ کے عنوان سے جو بیان  
اخبارات میں شائع کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ

”الیدیسی ایڈیٹریس نے جو بیان جاری کیا ہے۔ اس کے

آخر میں درج ہے کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر

یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس خبر کو پڑھنے کے

بعد۔ ان لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیے۔ جو یہ مشہور

کر رہے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی تو ٹوٹی جائے گی۔ یا یہ

کہتے پھرتے ہیں۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈرنے گھٹنے

ٹیک دیئے ہیں“

معلوم ہوتا ہے کہ سر جھوٹو رام نے پکیٹ کا بغور مطالعہ نہیں کیا اس

پکیٹ کا مسودہ میں نے اور سر سکندر نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل

کی زیر ہدایت، اکٹھے بیٹھ کر مرتب کیا تھا۔ میں آزویل سر جھوٹو رام

کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اُن کی اطلاع کے لئے۔ یہ عرض

کہنا بے حد ضروری ہے۔ کہ نہ اصل پکیٹ میں۔ اور نہ الیدیسی ایڈیٹ

پریس کے بیان میں۔ کہیں یہ الفاظ درج ہیں۔ کہ

”پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی

کا قبضہ ہو جائے گا“

یہ الفاظ اصل سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کی ذاتی اختراع ہیں۔ انہوں نے ۴ اکتوبر کو لکھنؤ سے جو پیغام اپنے اخبار کو بھیجا تھا، اس وقت میں بلاوجہ یہ الفاظ درج کر دیئے تھے۔ حالانکہ جس وقت سول کے نامہ نگار نے یہ پیغام بھیجا ہے اس وقت مسکندر جنرل پیکٹ کا مسودہ لکھا بھی نہیں گیا تھا۔ پیکٹ کے اصل الفاظ یہ ہیں :

”اس معاہدے کو قدر نظر رکھتے ہوئے، پارلیمنٹل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل ہوگی۔“

ظاہر ہے کہ جب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے، تو انہیں لامحالہ پارلیمنٹل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں نمائندگی ملنی چاہیے۔ معاہدہ کی یہ شق اسی غرض کے لئے رکھی گئی ہے۔ لیکن پورا معاہدہ پڑھ جائیے، آپ کو کہیں بھی یہ نظر نہیں آئے گا، کہ پارلیمنٹل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔

سرھوٹوراہم کو ایک اور غلط فہمی ہوئی ہے۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی ہے۔ کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے مسلمان ممبر آئندہ اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کہلائیں گے۔ اور یہ مسلم لیگ پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے تابع اور ان کے قواعد و ضوابط کی پابند ہوگی۔

معادے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پنجاب اسمبلی کے وہ یونینسٹ ممبر جو سرسکندر کے مشورے سے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے اسمبلی کے واحد مسلم لیگی ممبر کے ساتھ مل کر، مسلم لیگ پارٹی بنائیں گے۔ تو اس پارٹی کو اس امر کی آزادی ہوگی کہ وہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، جس کے اعراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں۔ ایک کولیشن بنائے۔ اس قسم کی کولیشن انتخاب سے پہلے بھی وجود میں آسکتی ہے۔ اور انتخاب کے بعد بھی۔ یہ کولیشن دستور اپنا نام یونینسٹ پارٹی رکھ سکتی ہے۔

سر جھوٹو رام ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس معاہدہ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کی ہیڈ کوارٹرز کبھی کبھی بدلی جائے گی۔ آئندہ یونینسٹ پارٹی مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوگی۔

۱۔ اسمبلی کی وہ مسلم لیگ پارٹی جو اس معاہدے کی رُو سے وجود میں آئے گی۔ اور جو آل انڈیا مسلم لیگ کے تابع۔ اور اس کے قواعد و ضوابط کی پابند ہوگی۔

(ب) سر جھوٹو رام کا گروپ۔ یا کوئی اور گروپ۔ جو مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن بنانے پر رضامندی کا اظہار کرے گا۔

ظاہر ہے ان حالات میں یونینسٹ پارٹی، پہلے کی طرح، ایک مستقل اور قائم بالذات پارٹی نہیں رہے گی۔ بلکہ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اس کولیشن کے لئے استعمال ہوگا۔ جس میں مسلم لیگ پارٹی

اور سرچھو ٹورم کا گروپ شامل ہوں گے۔ مسلم لیگ پارٹی اپنے اعمال و  
 افعال کے لئے۔ کلیتہً آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔  
 اور اس پارٹی کے ممبروں کی وفاداری صرف لیگ سے وابستہ ہوگی  
 اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آئی کہ مسلم لیگ کے بنیادی  
 اغراض و مقاصد اور کولیشن کے دوسرے گروپ (خواہ وہ گروپ  
 چھوٹا اور ام کا ہو یا کوئی اور) کے اغراض و مقاصد کے درمیان تصادم  
 ہو۔ تو مسلم لیگ پارٹی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے احکام کی  
 پابند ہوگی۔

یہ نہ سمجھیے۔ کہ ہم ابھی سے کسی ایسے تصادم کا تصور کئے بیٹھے ہیں۔  
 یا ایسے تصادم کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ ہم تو یہ توقع  
 رکھتے ہیں کہ اگر معمولی عقل اور وفاداری سے کام لیا جائے، تو درزمرہ  
 کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں اور نظم و نسق  
 کی کاڑھی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ بااثر ہمہ کسی شخص  
 کو۔ اس کولیشن کے متعلق۔ جو مسلم لیگ پارٹی اور سرچھو ٹورم کے  
 گروپ کے اتحاد سے رُو تھا ہوگی۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں  
 رہنا چاہیے۔ ہر چند کہ اس کولیشن کا نام یونٹیسٹ پارٹی ہی کیوں  
 نہ ہو! لے

لے سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء



مذکورہ بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ سکندر جنگ پکیٹ کی تادیل و تعبیر کے بارے میں۔ دونوں فریقوں میں بنیادی اختلاف تھا۔ سرسکند اور اُن کے حواری کہتے تھے۔ کہ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی ادارہ کی حیثیت سے۔ اسمبلی کے اندر اور باہر۔ دونوں جگہ بہستود قائم رہے گی۔ اور مسلم لیگ کو محض اپنی اغراض کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس کے برعکس ملک برکت علی اور غلام رسول خاں کا خیال تھا۔ کہ پُرائی یونینسٹ پارٹی۔ جس کے ٹکٹ پر۔ ابھی چند مہینے قبل انتخابات کی جنگ لڑی گئی تھی۔ ختم ہو گئی ہے۔ اب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے بعد۔ خود بخود ایک مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ جو سرسکند آل انڈیا مسلم لیگ کے تابع فرمان ہوگی۔ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اُس کو لیشن کے لئے استعمال ہوگا۔ جو اس لوزائیدہ مسلم لیگ پارٹی اور چومہری جمہور پرام کے گروپ کے تعاون سے پیدا ہوگی۔

امنوس ہے کہ فریقین کے اس باہمی نزاع میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ہماری کوئی رہنمائی نہ کی۔ اور بجائے اس کے کہ اس قضیے کو کسی قطعنی اور دو ٹوک فیصلے کے ذریعے حل کر دیا جاتا۔ مرکز نے ڈھیل دے کر۔ حالات کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔

**عکلامہ اقبال کے خطوط :**

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جنگ کو ایک خط میں لکھا کہ:

” عام افواہ ہے۔ کہ یونینٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سرسکندر اود اُن کی جماعت نے اب تک اس پر دستخط نہیں کئے مجھے آج صبح معلوم ہوا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک اسی طرح ٹال مٹول کرتے رہیں گے، خود یونینٹ پارٹی کے ایک رکن نے مجھ کو بتایا ہے۔ کہ یونینٹ پارٹی کا اصل مقصد یہ ہے۔ کہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ بہر حال میں چند روز تک آپ کو پوسے کوالفت سے مطلع کر ڈینگا۔ اور پھر آپ کی رائے درکار ہوگی۔ کہ آئندہ ہم کس طرح کام جاری رکھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ لاہور میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد سے قبل آپ کم از کم دو ہفتوں کے لئے ہلکے صوبے کا دورہ کر سکیں گے۔“ لہ

انگلے ہی روز۔ یعنی یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے اسی موضوع پر۔ ایک اود خط مسٹر جناح کو لکھا۔ جو درج ذیل ہے۔

” ڈیئر مسٹر جناح !

سرسکندر حیات خاں کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اُن کے ہمراہ اُن کی جماعت کے بھی چند ارکان تھے۔ ہمارے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ موضوع وہی یونینٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات

لہ اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (شیخ محمد اشرف)

تھے۔ دونوں نر نعین کی طرف سے اخباری بیان شائع ہو چکا ہے۔  
 اور فریق سکندر جناح پیکیٹ کے بائے میں اپنی الگ تادیل کرتا  
 ہے۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جیسا کہ میں نے  
 پہلے آپ کو لکھا تھا۔ میں انشاء اللہ چند روز میں آپ کو ان تمام  
 بیانات کی نقول ارسال کر دوں گا۔ سر دست میں اتنا عرض کرتا  
 ہوں کہ ہرنانی فرما کر۔ مجھے فی الفور اس معاملے کی ایک نقل  
 بھیج دیجئے۔ جس پر سر سکندر کے دستخط ثابت ہیں۔ اور جو غالباً  
 آپ کے پاس موجود ہے۔

”ایک اور امر بھی وضاحت طلب ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے  
 اس پاست پر رضامندی کا اظہار فرمایا تھا کہ لیگ پر اونٹنل  
 پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا؟ سر سکندر  
 مجھ سے کہتے ہیں۔ کہ آپ اس بارے میں اپنی منظوری دے چکے  
 ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ اصرار کر رہے ہیں۔ کہ اس بورڈ کے ارکان  
 میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیے۔ جہاں تک میرا  
 خیال ہے۔ سر سکندر جناح پیکیٹ ہیں۔ اس قسم کی کوئی شق  
 موجود نہیں۔ ہرنانی فرما کر اس خط کا جواب علما زجلد عنایت  
 فرمائیے۔

”ہمارے آدمی بدستور صوبے کے ذمے ہیں مصروف ہیں۔ اور  
 جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ گذشتہ رات

ہم نے لاہور میں ایک بڑا کامیاب جلسہ کیا تھا۔ جلسوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

مذکورہ بالا خط کے ایک ہفتہ بعد یعنی ۸ نومبر کو ڈاکٹر صاحب کی زیر ہدایت - غلام رسول خاں نے ذیل کا خط مشرف جناح کی خدمت میں ارسال کیا۔

”ڈیر مشرف جناح !

آپ نے یکم نومبر ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر مشرف اقبال کو جو خط بھیجا تھا، اس کے پیش نظر انہوں نے مجھے ہدایت فرمائی ہے۔ کہ آپ کو اطلاع دے دوں کہ

۱) لکھنؤ میں آپ کے بعد سر سگندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ صورت

بہتر میں شدید اختلافات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ سر سگندر نے پنجاب

واپس آئے ہی۔ ایک بیان شائع کر دیا تھا کہ جہاں تک پنجاب کا

تعلق ہے۔ سابقہ صورت حال، بنو قائم اور بجال ہے۔ البتہ اس میں

صرف ترمیم کہ دی گئی ہے۔ کہ یونیورسٹی پارٹی کے ان مسلم ارکان کو

جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں۔

تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی

ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر

کھڑے ہوں گے۔ انہیں یہ عہد کرنا ہوگا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد

یونیورسٹی پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے عوض انتخابات کی

لہ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

جنگ میں۔ انہیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہوگی۔

سرسکندر کی جماعت کے بعض دیگر ارکان نے بھی اس قسم کے بیان شائع کئے ہیں کہ سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں چلا جائے گا۔

سرسکندر نے اپنے دستخط سے ایک بیان اخبارات کو دیا ہے جس میں انہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ آئندہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی اور وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائے گی۔

یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی یہ تصریحات سے مسلمانان پنجاب میں زبردست ہیجان ماضی پر اب پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ سخت حیران ہیں کہ ایسا معاہدہ کس طرح کیا گیا ہے۔ جس کے تحت لیگ کی مستقل حیثیت کا عدم ہو گئی ہے۔ اور وہ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنا دی گئی ہے۔ حالانکہ عوام کی نگاہ میں۔ یونینسٹ پارٹی بدترین رحمت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے پنجاب پراڈنشل مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے۔ اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشورے سے۔ ایک بیان شائع کیا جس کا مقصد پنجاب مسلم لیگ کے متعلق جدید غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے محض سکندر جناح پیکٹ کی اہم شقوں کو نقل کر دیا۔ اور

دہرایا کہ اس معاہدے کی رُو سے۔ جو مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں  
 آئے گی۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اور  
 مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط کے تحت ہوگی  
 اسی ضمن میں ملک بھر کی علی ایچ ایم۔ ایل۔ اے نے بھی ایک بیان  
 شائع کیا ہے۔ جس میں انہوں نے معاہدے کی شرائط کو نقل کر کے  
 واضح کر دیا ہے۔ کہ مجلس قانون ساز کے اندر۔ صرف مسلم لیگ پارٹی  
 کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور  
 لائحہ عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ کسی دوسرے گروہ سے مل کر کولیشن  
 بنائے۔ یا کسی کولیشن کو قائم رکھے۔ ان ہر دو بیانات کی نقول  
 ارسال خدمت ہیں۔

مسلمان عوام پر ان بیانات کا خوشگوار اثر ہوا ہے۔ لیکن یونینٹ  
 پارٹی کے مقتدر ارکان۔ ان بیانات کی اشاعت سے پرہم ہو گئے  
 ہیں۔ روزنامہ ٹریبون نے۔ ان بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ بھی  
 ارسال خدمت ہے۔

(۲) ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حکم کی تعمیل کرتے  
 ہوئے۔ میں نے سر سکندر کی خدمت میں۔ رکنیت کے نوٹے فارم  
 بھیجے۔ اور یہ درخواست کی۔ کہ اسمبلی کی یونینٹ پارٹی کے مسلمان  
 ممبروں سے۔ ان پر دستخط کرائے جائیں۔ کیونکہ ان آیام میں  
 دائرہ کی آمد کے سلسلہ میں، تمام ارکان لاہور میں



بھی واضح کر دوں۔ کہ اگر ہم یہ بیانات شائع نہ کرتے۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھوکہ لگتی۔

(۳) آپ کو یہ شکر مسترت ہو گی۔ کہ پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ کا ایک وفد جس میں خان بہادر ملک، زمان مہدی، ملک برکت علی، مسٹر عاشق حسین بٹالوی اور راقم الحروفت کیے علاوہ بعض دیگر اراکین بھی شامل ہیں، پنجاب کا دورہ کر کے، مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر رہا ہے۔ ان مقامات پر۔ مسلمان عوام نے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ سے۔ جس خلاص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ ہماری کوششوں سے اس وقت تک ۳۱۲ شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور مزید شاخیں قائم ہو رہی ہیں۔ مگر چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے۔ اس لئے ہم اپنا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ واضح کروینا بھی مناسب ہے کہ سرسکندر کی پارٹی کے ایک رکن نے بھی ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

(۴) میرتببول محمود نے ملک برکت علی کو سکندر جنگ پیکٹ کی نقل دیا نہیں کی۔ اس لئے اس کے متعلق آپ کو تارو دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی سرسکندر حیات کو پیغام بھیجا تھا کہ معاہدہ مذکورہ کی ایک نقل بھیجیں سرسکندر نے نقل بھیج دی ہے۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ نقل اصل کے مطابق ہے یا



نہیں۔ کیونکہ میر تقی میر نے مجھے بتایا ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی رات کو گیارہ بجے، جبکہ معائنے کی تمام شرائط آپ کے کمرے میں طے ہو چکی تھیں، سرسکندر نے بعض ترہیں پیش کیں۔ اور بالآخر وہ معاہدہ مرتب ہوا۔ جس کی نقل ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ہم پر بھجوائی گئی ہے۔ چونکہ ہمیں ان ترہیموں کا کوئی علم نہیں۔ اس لئے میری درخواست ہے۔ کہ آپ اس معاہدہ کی، جو آپ کے پاس موجود ہے، ایک نقل ہمیں ارسال فرما دیجئے۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے میر تقی میر سے یہ نقل مانگی تھی۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مطلوبہ نقل آپ کو بھیج دی گئی ہے۔

(۵) اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں۔ جن کے متعلق آپ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مشورہ طلب کیا ہے۔

(۱) فروری ۱۹۳۸ء میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق۔ جہاں تک سرسکندر کی دعوت کا تعلق ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جب تک کہ اس قسم کا واقعہ اور غیر مبہم سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ کہ سرسکندر کی پارٹی کے مسلمان ارکان۔ کسی مزید تاخیر کے بغیر مسلم لیگ کے حلف نامے اور قرائن و کتب پر دستخط کریں اور اعلان کریں۔ کہ اسمبلی کے اندر بھی ان کی جماعت مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ جہاں تک صورت حالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مدیوم رہتا ہے۔ کہ سرسکندر حیات شاہ کی طرف یہ کوشش کی جا رہی ہے  
کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے سچے جائیں۔

(ب) جہاں تک آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کا سوال ہے ہم یہ عرض  
کرنا چاہتے ہیں کہ پراونشل مسلم لیگ اس وقت موجود ہے۔ اور ہم ہر  
ضلع اور تحصیل اور اکثر ویراں میں لیگ کی مقامی شاخیں قائم کر رہے  
ہیں۔ اس لئے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔

(ج) جہاں تک مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ (وزیر کننگ کمیٹی) کا تعلق ہے  
ہمارے یہ تجویز ہے کہ پنجاب کو پانچ نشستیں دی جائیں۔ ڈاکٹر سر  
محمد اقبال کی درخواست ہے کہ وہ خرابی صحت کی بنا پر اس قابل نہیں  
ہیں کہ مجلسِ عاملہ کے جلسوں میں شریک ہو سکیں اس لئے ان کی جگہ  
ملک دمان ہدی ڈپٹی پرنسپل پنجاہ پراونشل مسلم لیگ کو لے لیا جائے  
ملک بکت علی وزیر کننگ کمیٹی میں بدستور شامل رہیں اور مسٹر غلام رسول ڈان  
بیرسٹریٹ اور کانام بھی شامل کر لیا جائے۔ جہاں تک سرسکندر اور میان  
احمد یار شاہ دونوں کا تعلق ہے اس مسئلہ کے حل کا اخصار بشیر انکس اس فیصلے  
پر ہے کہ وہ لیگ ٹکٹ پر دستخط کر دیں اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر  
مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں۔ اگر وہ اس معاہدے پر عمل کریں  
تو یہ خیال رکھا جائے کہ ان کی نیابت کسی صورت میں موجودہ مسلم لیگ پارٹی  
کی نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

آپ کا مخلص

(غلام رسول)

(بھائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)



تیرھواں باب :-

# سکندر جناح پیکت

(۲)

علامہ اقبال کا خط :-

۱۱ نومبر ۱۹۳۴ء کو۔ ڈاکٹر صاحب نے۔ مسٹر جناح کو ایک اور خط لکھا۔ جو

درج ذیل ہے۔

” مائی ڈیر مسٹر جناح !

میر سکندر اور ان کے احباب سے متعدد ملاقاتیں کرنے کے بعد۔ میں  
 قطعی طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں۔ کہ میر سکندر مسلم لیگ۔ اور  
 پراڈنشل پارلیمنٹری بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان کے  
 ساتھ جو معاہدہ کیا تھا۔ اس میں درج ہے۔ کہ پارلیمنٹری بورڈ کی  
 ڈیوٹی ہر شے سے تشکیل دینا ہے۔ مگر ہر اور اس میں یونائیٹڈ پارٹی کے  
 اہلکاروں کو اکثریت دینا ہے۔ اور اس میں اپنے اپنے پورے اصول۔ آپ کو خط لکھ کر

دریافت کیا تھا۔ کہ کیا واقعی یہ درست ہے۔ کہ آپ پارلیمنٹری بورڈ  
میں یونیسٹ پارٹی کو اکثریت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں؟ اب تک آپ  
نے اس کا جواب نہیں دیا۔

ذاتی طور پر مجھے سر سکندر کی اس خواہش کو قبول کر لینے میں کوئی  
عذر نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ اس معاہدے کی شرائط سے بھی  
آگے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لیگ کے تمام عہدیداروں میں۔  
ان کے حسبِ نشارت و بدل کیا جائے۔ وہ خصوصیت سے موجودہ سکریٹری  
کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ لیگ کی ترقی اور تنظیم میں  
ہلکے سکریٹری نے انتہائی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ سر سکندر کی  
یہ بھی خواہش ہے کہ لیگ کا فنڈ اور سارا حساب کتاب ان کے  
آدمیوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس تمام کارروائی سے ان کا  
مقصد یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح لیگ پر قابض ہو کر۔ اسے موت  
کے گھاٹ اتار دیں۔ کم از کم میرا اندازہ تو یہی ہے۔

میں اپنے صوبے کی رائے عاتمہ کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس لئے لیگ  
کو سر سکندر۔ اور ان کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری لینے  
پر بالکل تیار نہیں ہوں۔ سکندر جناح پکیٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو  
سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اور اگر یونیسٹ پارٹی کے موجودہ تھکنڈے  
جاری رہے تو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یونیسٹ پارٹی  
کے میروں نے۔ ابھی تک مسلم لیگ کے خلاف نامی و سنیخا نہیں کئے

اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ وہ دستخط کرنا بھی نہیں چاہتے۔ اب ڈی  
یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں فروری کی بجائے  
اپریل میں ہونا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ اس لیت دلیل سے۔ اُن کا مقصد یہ ہے۔ کہ آئندہ  
آئندہ اُن کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ آپ کو شاید معلوم  
نہیں۔ کہ لکھنؤ سے واپس آکر۔ سرسکندر نے پنجاب میں۔ ایک زمیندار  
لیگ قائم کی ہے۔ اور اب اُس زمیندارہ لیگ کی شاخیں۔ صوبے  
کے طول و عرض میں۔ پھیلائی جا رہی ہیں۔ بہاؤ گرم مجھے اطلاع  
دیجئے۔ کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو  
بلا توقف تاروے دیجئے۔ اور اگر تار مکان نہ ہو۔ تو حیدرآز حیدر ایک  
مفصل خط لکھیے۔

آپ کا مخلص  
محمد اقبال

ڈاکٹر صاحب نے۔ اپنے اس گرامی نامے میں۔ پنجاب مسلم لیگ کے سکرٹری کی  
برطانی کے جس مطالبہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ سچی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ سرسکندر۔ اپنے  
دو تین احباب کے ہمراہ۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر  
صاحب نے پوچھا۔ آپ لوگ مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کیوں نہیں کرتے؟

سید اقبال کے خطوط جناب کے نام رشیخ محمد مشرف

سر سکندر نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا کہ ”ہم غلام رسول خاں کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ وہ بہت تیز مزاج آدمی ہیں۔ آپ کسی اور شخص کو لیگ کا سکریٹری مقرر کر دیجئے۔“

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ”بہت اچھا اس ملک بרכת علی سے کہوں گا۔ کہ وہ یہ کام سنبھال لیں۔“

سر سکندر نے عرض کیا۔ ”ہمیں ملک صاحب بھی منظور نہیں ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”خلیفہ شجاع الدین کو سکریٹری بنا دوں؟“

سر سکندر نے خلیفہ صاحب کے نام پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ تو ڈاکٹر صاحب

نے کہا۔ ”آپ خود کوئی آدمی کیوں تجویز نہیں کرتے؟“

جواب میں سر سکندر نے نواب زادہ خورشید علی خاں کا نام پیش کیا۔ اس

پر ڈاکٹر صاحب سخت غمگین ہوئے۔ اور انہوں نے یہ نام منظور کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔

## مَلِکِ بَرکَتِ عَلِی کا خط :-

۳ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ملک بרכת علی نے۔ ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت

میں میرے دوست راجہ حسن اختر صاحب۔ اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ سر سکندر خود تشریف نہیں لائے تھے۔ بلکہ انہوں نے میرے قبیل محمود کو یہ پیغام دے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

میں ارسال کیا۔

ڈویژنل سٹریٹجی !

آپ کا گہری نامہ محترمہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۷ء - مجھے وقت پر مل گیا تھا خدا کا شکر ہے۔ کہ آپ کی طبیعت اب بہتر ہے۔ اور تکلیف رفع ہو گئی ہے آپ کے مزاج کی ناسازی۔ سر اسر اس محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ جو اجلاس لکھنؤ کے بعد۔ آپ کو برداشت کرنا پڑی۔

میں نے آپ کا خط۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور غلام رسول خاں کو دکھا دیا ہے۔ اس بارے میں مجھے آپ سے کئی اتفاق ہے۔ کہ جوں ہی کوئی مسلمان۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرے۔ اس کا معنی ہے۔ وہ اپنے حقوق و فرائض کے لحاظ سے۔ لیگ کے پرانے ممبروں کے ہم تہ ہو جاتا ہے۔

میرے تمام احباب اس حقیقت کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ سر سکندر اور ان کے نفعانے ابھی تک لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے۔ اس کے برعکس وہ مسلسل یہ پراپا گنڈہ کئے جا رہے ہیں۔ کہ لکھنؤ جانے سے قبل جو حالت پنجاب میں تھی۔ وہ یعنی برقرار ہے۔ اور اس میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اس باہمی آویزش میں۔ یونینسٹ پارٹی کو نفع اور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ مسلم لیگ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت شاخ کی حیثیت سے کام کرے گی۔



اگر سرسکندر اور اُن کے رفقاء لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انھیں لیگ کے تمام معاملات میں حصہ لینے کی پوری آزادی ہوگی۔ اور اگر وہ لیگی ممبروں کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ تو انھیں یقیناً یہ اختیار ہوگا کہ وہ لیگ کی پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکیں۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ وہ نہ لیگ میں شامل ہوتے ہیں اور نہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہیں۔ یہ طرز عمل تو معاہدہ لکھنؤ کے صریح خلاف ہے۔

سرسکندر اس بات پر بھی مصرع ہیں۔ کہ لیگ کے موجودہ عہدیداروں کو برطرف کر کے۔ اُن کی جگہ ان کے۔ یعنی سرسکندر کے آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوگا وہ لیگ کی رکنیت قبول نہیں کریں گے۔ سرسکندر کا یہ مطالبہ تمام جمہوری قواعد کے خلاف ہے ہم کسی عہدیدار کو مستعفی ہونے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ البتہ باہمی ذہم و تفہیم سے معاملات طے کرنے پر ہمیشہ آمادہ ہیں۔

مسلم لیگ پر قبضہ کر کے۔ اسے ایک مردہ جماعت بنا دینے کی پالیسی کی ہم کبھی تائید نہیں کریں گے۔ بلکہ مردہ شخص۔ جو لیگ کے آئین کو تمام دوسری باتوں پر مقدم رکھتا ہے۔ کبھی اس پالیسی کی حمایت نہیں کرے گا۔ ہاں اگر آپ لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہمیں حکم دیں۔ کہ لیگ کو کلینٹ یونینٹ پارٹی کے حوالے کر دیا جائے

تو ہمیں آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں قطعاً کوئی عذر نہیں ہوگا۔  
لیکن اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ پنجاب  
میں لیگ کو ختم کرنے اور اُس سے موت کی نیند سلا دینے کی اس  
سے زیادہ موثر تجویز اور کوئی نہ ہوگی۔

ذاتی طور پر میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ تمام معاملات خوش  
اسلوبی اور دوستانہ طریقے سے طے ہو جائیں۔ اور ہمارا متحدہ محاذ  
کوٹنے نہ پائے۔ لیکن اس ضمن میں سر سکندر اور میر مقبول محمود نے  
لکھنؤ سے واپس آنے کے بعد جو اخباری بیان شائع کئے ہیں۔  
وہ حدودہ قابل اعتراض ہیں۔ آپ کی ان بیانیوں کے متعلق کیا  
رائے ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہائے صوبے کے عوام نے  
سکندر جناح پیکیٹ پر جو اعتراضات کئے ہیں۔ وہ آپ کی نظر سے  
گزرے ہیں یا نہیں۔ عوام نے اس پیکیٹ پر سخت نکتہ چینی کی ہے  
اور ان کی رائے ہے کہ اس پیکیٹ کی رو سے لیگ کو یونینٹ پارٹی  
کے حوالے کر دینا۔ گویا لیگ کی موت کے محضر پر خود اپنے ہاتھوں  
سے مہر ثبت کرنے کے برابر ہے۔

میری آپ سے مؤذبانہ درخواست ہے کہ بہت جلد سر سکندر اور ان  
کے احباب کو مشورہ دیجئے کہ وہ مزید تاخیر کے بغیر لیگ کے حلف نامہ  
پر دستخط کر دیں۔ اور اپنے خلوص کا اولین ثبوت یہ پیش کریں کہ  
مجلس قانون ساز کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں

اگر سرگندیاں کھڑی ہیں۔ تو ہم کھلے دل سے ان کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ لیگ کی جمہوری حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ اور وہ بدستور مسلمانان پنجاب کے عزائم اور ان کی آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی کا فرض ادا کرتی رہے۔

جہاں تک مرکزی پالیسی پوری بورڈ کا تعلق ہے۔ میری درخواست ہے کہ مہربانی فرما کر۔ اصحاب ذیل کو اس کے ممبر نامزد کر دیجئے۔  
 مسٹر غلام رسول خاں۔ خلیفہ شجاع الدین۔ میاں عبدالمجید پیر پٹا  
 لار۔ حافظ محمد عبداللہ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی) اور مسٹر  
 عاشق حسین بٹالوی۔

ڈاکٹر سید محمد اقبال علالت کی وجہ سے۔ اس بورڈ کی رکنیت قبول کرنے سے معذور ہیں۔

آپ کے مکتوب گرامی کا جواب دینے میں جو دیر ہوئی ہے۔ اس کے لئے دوبارہ معذرت پیش کرتا ہوں۔ وجہ صرف یہ تھی۔ کہ میں مسجد شہید گنج کے مقدمے میں سخت مصروف تھا۔ وہ مقدمہ کل ختم ہوا ہے۔ آپ کو یہ شکریہ مستر تا ہوگی۔ کہ پنجاب میں لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور اس کی شاخیں جا بجا قائم کی جا رہی ہیں جن میں مقامی مسلمان بڑے جوش و خروش سے حصہ لے رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

برکت علی

مکن ہے بعض لوگ سوال کریں کہ مسٹر جناح نے سر سکندر کے ساتھ ایسا قابل  
اعتراف معاہدہ کیوں کیا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ مسٹر جناح اُس وقت دو مختلف  
محاذوں پر لڑنا ترین مصلحت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس شدت سے مسلمانوں  
کی قومی جمعیت کو تہس نہس کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس کے سوا اور کوئی چارہ  
نہیں تھا۔ کہ ہم اپنے گھر کے اندرونی اختلافات کو کسی نہ کسی طرح تہہ کر کے۔ ایک  
متحدہ محاذ قائم کر لیتے۔ مسٹر جناح نے یہی کچھ کیا۔ اگر سکندر جناح پکیٹ نہ ہوتا  
تو ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان جنگ جاری  
رہتی۔ اس جنگ کی شدت اور طوالت کے متعلق آج کوئی حتمی رائے نہیں  
دی جاسکتی۔ مسلم لیگ اُس وقت کمزور تھی۔ اور یونینسٹ پارٹی طاقت ور  
تھی۔ ممکن ہے۔ یہ دونوں جماعتیں مسلسل دو، تین سال تک۔ ایک دوسری  
کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جنگ خواہ کتنی ہی  
طویل کیوں نہ ہو جاتی فتح انجام کار لیگ کی ہوتی۔ ملک برکت علی نے ۲۹  
مارچ ۱۹۳۵ء کو، پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن میں، تقریر کرتے ہوئے کہا تھا  
..... اس وقت پنجاب میں۔ ایک نہایت غلط قسم کی  
دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ اگرچہ اصطلاحی معنوں میں  
اب دفتری حکومتیں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن پنجاب پر بدستور بہ  
لعنت مسلط ہے۔ اس لعنت سے نجات پانے۔ اور اس ظلم کو  
ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دینے کے لئے۔ ہمارے صوبے کو سرتوڑ  
محنت کرنا پڑے گی یہ حکومت ایک کابوس کی طرح ہم پر

سوار ہے۔ جس نے ہماری اُن تمام کوششوں کو بیکار بنا رکھا ہے۔  
جو ہم اُس مبارک دن کے لئے کر رہے ہیں۔ جب ہمارا صوبہ اُن  
بندھنوں اور زنجیروں سے آزاد ہوگا۔ جنہوں نے ماعنیٰ میں ہم کو  
بڑی طرح جکڑ رکھا تھا۔

وزیر اعظم (سر سکندر حیات خاں) :- "لیجئے بی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے۔"  
ملک برکت علی :-

"ہاں۔ بی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے۔ اور یہ بھی سن لیجئے کہ وہ کیوں  
باہر نکلی ہے۔ اس وقت پنجاب میں ایک بدترین قسم کی رجعت  
سپند حکومت قائم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس حکومت کی کمزوریوں  
کو داسکاف طور پر بیان کر کے۔ اُسے ختم کرنے کی کوشش کریں  
تاکہ آلام و مصائب کی وہ اندھیری رات۔ جو اس وقت ہمارے  
صوبے پر چھائی ہوئی ہے۔ کسی طرح ختم ہو۔ اور تاریخ پنجاب کا  
یہ افسوسناک باب اپنے انجام کو پہنچے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے  
سامنے اکثریت کی ایک سنگین دیوار کھڑی ہے۔ جو اُن لوگوں سے  
تعمیر کی گئی ہے۔ جن میں خطاب یافتہ رئیس بڑے بڑے زمیندار  
آزیری میٹریٹ۔ آزیری سب رجسٹرار۔ ڈیلدار اور ڈپٹی حکومت  
کے پرانے خواہ اور کاسہ لیس شامل ہیں۔ لیکن کچھ پردان نہیں  
خواہ اس دیوار کو پاش پاش کرنے کے لئے ہمیں برسوں کیوں نہ سر  
ٹکرائیں۔ ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔"

مسٹر جناح اگر ہر سکندر سے مفاہمت نہ کرتے۔ تو ہماری جدوجہد یقیناً.....  
 ..... جاری رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ لیگ کی مالی حالت سخت محدود تھی۔ دیہاتی  
 آبادی کو یہ کہہ کر کہ لیگ شہری مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ ہم سے بدگمان کیا  
 گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں زمیندارہ لیگ قائم کر کے۔ کٹاؤں کے لوگوں کو  
 بہکانے کی کوششیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود  
 کانگریس کی بیچارہ سے۔ شہری اور دیہاتی مسلمان۔ دونوں پریشان ہو رہے تھے۔  
 اور ان کی پریشانی کا مدد اور صرف مسلم لیگ کے پاس تھا۔ مسٹر جناح کو انجام  
 کار یونینسٹ پارٹی کے خلاف لڑنا ہی پڑا۔ اگرچہ یہ لڑائی چھ سال بعد ہوئی۔ اور  
 میری رائے میں نامناسب موقع پر۔ نامناسب اسباب اور نامناسب حالات  
 میں ہوئی۔ تاہم یہ سب کچھ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ سکندر  
 جناح پکیٹ ایک عطا شدہ نقصان دہ معاہدہ تھا۔

اجلاس لکھنؤ کے بعد۔ اگرچہ پنجاب میں سکندر جناح پکیٹ کا قضیہ  
 شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا۔ کہ اس قضیہ سے آنکھیں بند  
 کر کے۔ ہمیں اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔ چنانچہ لکھنؤ سے واپس آتے ہی  
 ہم پھر دورے میں مصروف ہو گئے۔

اسمبلی کے الیکشن کے دوران میں ہم نے۔ پراڈنشل مسلم لیگ کے دفتر  
 کے لئے۔ ایڈورٹور ڈیوڈ پر ایک کمرے کا مکان سے لیا تھا۔ لیکن اب مسلم لیگ کا  
 سرمایہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اور آئندہ کہیں سے روپیہ دستیاب ہونے کی بظاہر کوئی  
 توقع نہیں تھی۔ اس لئے ایڈورٹور ڈیوڈ کا مکان چھوڑنا پڑا۔ اور لیگ کا دفتر۔

غلام رسول خاں کے مکان سے ٹمپل روڈ پر آ گیا۔

الیکشن ختم ہونے کے بعد۔ ڈاکٹر صاحب نے غلام رسول خاں کو ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا۔ اور اسی روپے سے اب تک لیگ کا کام چل رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایک ہزار روپیہ ڈاکٹر صاحب کو کس شخص نے دیا تھا۔ غالباً کوئی سرکاری ملازم تھے۔ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غلام رسول خاں کو ان کا نام معلوم تھا۔ لیکن میں نے کبھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

جب حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ تو ہم نے مجبوراً لیگ کے دفتری کلرک افتد بخش سلیم کو بھی جواب دے دیا۔ انھیں غالباً تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن سلیم محض کلرک ہی نہیں۔ بلکہ ہمارے دوست بھی تھے۔ اور ان کی علیحدگی ہم سب پر شاق گذری۔

اب فیصلہ یہ ہوا کہ لیگ کے دفتر کا سارا کام میں خود سنبھال لوں۔ چنانچہ صبح سے شام تک مجھے لیگ کے دفتری امور میں سرکھپانا پڑتا تھا۔ راجہ عبدالعزیز شام کو ہائی کورٹ کی ملازمت سے واپس آتے۔ تو انگریزی کے خطوط اور مسودے ٹائپ کر دیتے تھے۔ دورے کے مصارف بھی کچھ دیر لیگ کے فنڈ میں سے ادا ہوتے رہے۔ لیکن جب لیگ کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ تو یہ خرچ بھی ہم میں سے ہر اک کو انفرادی طور پر خود برداشت کرنا پڑا۔

مختلف اضلاع کے صدر مقامات میں لیگ کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں اور ان کے تحت ابتدائی شاخیں بھی کام کر رہی تھیں۔ ان شاخوں کے عمید یا سردار ہیں اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو ان جھگڑوں کو پنپانے کے لئے، ہم

میں سے کسی نہ کسی کو خود وہاں جاتا پڑتا تھا۔ پھر آئے دن باہر سے۔ پراڈنشل مسلم لیگ کے وفد کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں۔ خصوصاً ملک برکت علی کے پاس تو ہر جگہ سے پراسرار بلاد آتا تھا۔ لیکن وہ اپنی بے شمار مصروفیتوں کی وجہ سے تمام دعوتیں قبول کرنے سے معذور تھے۔ اندر میں حالات۔ اکثر و بیشتر موقعوں پر۔ مجھے اُن کا قائم مقام بن کر جانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کی شاخوں کا بھی یہ اصرار تھا۔ کہ اُن کو لیگ کے تازہ بہ تازہ حالات سے باخبر رکھا جائے۔ تاکہ شکر یک میں کمزوری نہ آنے پائے۔ ان تمام اغراض کے لئے روپیہ درکار تھا۔

اُنہی دنوں میں نے اور غلام رسول خاں نے ایک تجویز مرتب کی۔ کہ پنجاب مسلم لیگ کے زیر اہتمام۔ ہینے میں دو بار ایک رسالہ شائع ہونا چاہیے جس میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی مسلم لیگی ادرکانگہ سی سرگرمیوں کے مفصل حالات درج ہوں۔ تاکہ پنجاب کے مسلمان ہندوستان کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر رہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ یہ رسالہ کم از کم ایک ہزار کی تعداد میں چھپو کر۔ صوبے کی تمام شاخوں میں مفت تقسیم کیا جائے گا۔ غلام رسول خاں نے یہ تجویز ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کی۔ تو انہوں نے اسے پسند فرمایا۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ اس رسالہ کی اشاعت کے بعد۔ لیگ کے وفد کو بار بار دورہ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی۔ اور اُس کی بجائے تمام حالات مطبوعہ صورت میں۔ لیگ کی شاخوں کے پاس پہنچ جایا کریں گے۔ لیکن وقت یہ تھی۔



کہ اس تجویز کی تکمیل کے لئے بھی روپیہ درکار تھا۔

ایک روز۔ ڈاکٹر صاحب نے۔ غلام رسول خاں سے کہا کہ "کوٹ فتح خاں کے رئیس سردار محمد نواز خاں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے اُن سے لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا تھا۔ وہ مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ اُن سے فلیٹی ہوٹل میں جا کر ملیے۔"

دوسرے روز۔ ملک برکت علی اور غلام رسول خاں۔ سردار محمد نواز خاں سے ملے۔ اور لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا۔ سردار محمد نواز خاں کے جتنے مقدمات ہائی کورٹ میں پیش ہوتے تھے۔ اُن کی پیروی ملک برکت علی کرتے تھے۔ اہلئے ملک صاحب سے اتنی کوئی بیگانگی نہ تھی۔ سردار محمد نواز خاں نے پہلا سوال یہ کیا کہ "مسلم لیگ اور سکندر جیات کے تعلقات کیسے ہیں؟"

غلام رسول خاں نے صاف کہا: "اس وقت تو ہمارے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ اگر سرسکندر نے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم نہ کی۔ تو ہم اُن کی مخالفت جاری رکھیں گے۔"

اس پر سردار محمد نواز خاں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا۔ اور فرمایا۔ کہ "دیکھئے! میرے موجودہ حالات اس قسم کے ہیں کہ میں سرسکندر کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے خانگی معاملات میں قدم قدم پر حکومت پنجاب کی مدد درکار ہے۔ اگر میں لیگ کو روپیہ دوں تو ظاہر ہے کہ آپ اس روپیہ کو سرسکندر اور اُن کی جماعت کے خلاف پراپاگنڈے پر صرف کریں گے۔ سرسکندر کو یہ سب کچھ معلوم ہوگا۔ تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس لئے مجھے

افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد سردار محمد نواز خاں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ "اس وقت میری فلاں اپیل راپیل کا نام لیا۔ جو مجھے یاد نہیں، ہائی کورٹ میں دائر ہے آپ اس اپیل کی دو گنی فیس مجھ سے لے لیجئے۔ اور جی چاہے تو اس روپے کو لیگ کے کام پر صرف کر ڈالئے۔ مجھے کچھ اعتراض نہیں ہوگا۔"

ملک صاحب نے ہنس کر کہا: "حضرت! یہ تو ایک بددیانتی ہے جس کا میں بحیثیت ایک قانون دان اور وکیل کے ترکیب نہیں سو سکتا۔"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد غلام رسول خاں اور ملک برکت علی اٹھ کر واپس چلے آئے۔ اور روپیہ حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی ناکام رہی۔

انہی دنوں ایک روز ڈاکٹر صاحب نے میجر ملک ممتاز لوانہ کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ "وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اور میں نے ان سے لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا تھا۔ وہ ضرور سمجھ نہ کچھ دیں گے۔ آپ ایک وفد بنا کر سرگودھا جائیے۔"

غلام رسول خاں نے مجھ سے یہ وعدہ سنا یا۔ تو میں نے مایوسی کا اظہار کیا مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ یہ بڑے بڑے زمیندار مسلم لیگ کو ایک پیسہ بھی دینگے میجر ممتاز لوانہ سے میری بالمشافہ ملاقات و کھچی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں نے ان کی خوبوں کا ذکر سن رکھا تھا کہ بڑے بڑے لکھے اور با اطلاق آدمی ہیں اور ادب کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ زمانہ ہندی خاں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ زمانہ ہندی خاں میجر صاحب سے مل کر کوئی تاریخ متقرر کریں اور اس تاریخ کو لیگ کا وفد لاہور سے چل کر

سرگودھا پہنچ جائے۔

ہم دسمبر میں سرگودھا گئے۔ وفد میں ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان  
 ہدی اور راقم الخیر شامل تھے۔ ہم نے تین روز میجر ممتاز ٹوانہ کے ودلت کدے پر  
 قیام کیا۔ شہر میں ایک سبک جلسہ بھی ہوا۔ جہاں ہم نے خوب تقریریں کیں میجر  
 صاحب نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ دونوں وقت دسترخوان  
 کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھر دیا جاتا تھا مرغِ مسلم۔ مانی بریاں۔ بطور دم  
 نچت۔ حلوائے گڈر۔ اور مرغِ نارنج کی بھری ہوئی تابی آتی تھیں۔ ہم  
 میں سے کوئی شخص بھی بیمار خور نہیں تھا۔ اس لئے جنتِ نگاہ کے اس  
 سامان کا بیشتر حصہ واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن جس غرض کے لئے ہم نے یہ سفر  
 اختیار کیا تھا۔ افسوس کہ اس میں قطعاً کامیابی نہیں ہوئی۔ اور تین روز کے  
 بعد ہم خالی ہاتھ واپس لاہور آ گئے۔

اس زمانے میں ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ میں کام کرنے والوں  
 کی سخت کمی تھی۔ جس ہم کو ہم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اور جس  
 قسم کے حالات و واقعات درپیش تھے۔ ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ پنجاب پر نیشنل  
 مسلم لیگ کے پاس۔ کم از کم نصف درجن کے قریب۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان  
 موجود ہوتے۔ جنہیں تحریر و تقریر کے فن پر پورا عبور ہوتا۔ اور جو صوبے کے  
 طول و عرض میں گھوم کر۔ تحریک میں نئی جان ڈال دیتے۔ ہمارے پاس ایسا  
 ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ ایم، اے۔ اور بی، اے پاس کرنے کے بعد۔ بہت  
 سے مسلمان نوجوان بے کار پھر رہے تھے۔ لیکن انہیں پیٹ کے دھندلے سے

مجبور کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے پاس سوائے ایشیا، اتر بانی، قومی جدوجہد اور حکومت کے عتاب کے۔ اور کہا ہی کیا تھا۔ پھر تعلیم یافتہ نوجوان اس طرف کبیں رخ کرتے۔ بہت سے نوجوانوں کو یونیٹ پارٹی نے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ بعد وہ اس امید پر کہ زود یا پیر۔ انھیں یونیٹ لیڈروں کے طویل سرکاری ملازمت مل جائے گی۔ اس پارٹی کے صدر دفتر میں کام کر رہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو۔ عدم تعاون کی تحریک میں۔ تعلیم کرنے کا جو طبع تجربہ ہوا تھا۔ اس کے بعد۔ اُن کو کسی سیاسی تحریک میں شرکت کی دعوت دینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس دور میں بھی، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ہماری قوم کے بعض نوجوانوں نے۔ ایشیا، اتر بانی کا ایسا بلند معیار پیش کیا تھا۔ جس کی مثال خود ہندوؤں کے ہاں بھی نہیں تھی۔ رنج اس بات کا ہے کہ اُن کی قربانیوں سے سراسر اعتبار نے فائدہ اٹھایا اور ہم محروم رہے۔

ڈاکٹر محمد شرف کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی پروفیسری چھوڑ کر۔ کانگریس میں کام کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد (زمین العابدین احمد) نے علیگڑھ سے اقتصادیات میں ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر لندن سے اقتصادیات میں بی۔ ایس۔ سی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ واپس وطن آنے کے بعد۔ انھیں محکمہ تعلیم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن انھوں نے نوکری چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں چھتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کیا۔ صاحبزادہ محمود لظفر نے انگلستان کے پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ پھر کیمبرج سے ڈگری لی تھی۔ ہندوستان واپس آ کر۔ انھیں بھی معقول ملازمت مل گئی تھی

لیکن انہوں نے بھی یہ ملازمت ترک کر کے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں  
پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ باتیں اس لئے رنچ وہ ہیں کہ

سیاہ سختی ازاں بیشتر تھی باشد

کہ مجلس دگرے روشن از چراغ من است

تمام اس بات کا ثبوت ضرور ہم پہنچاتی ہیں۔ کہ ہماری خاکستریاں بھی چنگاریاں  
دی ہوئی تھیں۔ ہمارے ملک میں دکالت ایک ایسا پیشہ ہے۔ جس کے متعلق عام طور  
پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس پیشے میں۔ انسان اپنی آزادی اور خودداری کو قائم  
رکھ کر۔ سیاست میں بے دریغ حصہ لے سکتا ہے۔ اس امر سے بھی انکار محال ہے  
کہ ہندوستان کی سیاسیات میں ہمیشہ دکلائے بڑھ چڑھ کہ حصہ لیا ہے۔ اور یہی  
لوگ سیاسی تحریکوں میں آگے آگے رہے ہیں۔ لیکن یونیٹ پارٹی کے عروج  
کے زمانے میں۔ خود مسلمان دکلا کا بہت بڑا طبقہ اس پارٹی کا حلقہ بگوش  
بن گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ پرل ونشل مسلم لیگ کا وفد منگھری جانے والا تھا۔ شام کو  
غلام رسول خاں نے۔ ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا۔ کہ ہم لوگ صبح منگھری جا رہے  
ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ کہ منگھری میں کہاں ٹھہریں گے آپ؟ غلام رسول خاں  
نے۔ ایک ڈیکل صاحب کا نام لیا۔ کہ ان کے ہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر  
صاحب وہ نام منگھری خاں موش ہو گئے۔ پھر لوہے۔ کہیں اور کیوں نہیں آپ ٹھہرتے؟  
غلام رسول خاں نے جواب دیا کہ ان ڈیکل صاحب کو اطلاع کر چکے ہیں۔ اور ٹھہرنا مناسب نہیں۔

توان ہدی خاں بھی اُس وقت موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں، ڈکیل صاحب سے بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ اس لئے اب ان کے ہاں کھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تجویز سے خوش نہیں ہیں۔

دوسرے روز جب ہم ننگمیری پہنچے تو ڈکیل صاحب غائب تھے۔ تاہم ڈاکٹر صاحبزادہ ارشاد علی اور ان کے احباب نے وفد کی پذیرائی انتہائی گرمجوشی اور خوش اسلوبی سے فرمائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈکیل صاحب خود ان دنوں خطاب اور جاگیر کے حصول کی کوشش میں سرگرواں تھے۔ اور چونکہ یہ دونوں چیزیں سرسرنچاب کے وزیراعظم کی خوشنودی سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو لیگ کے وفد سے وابستہ کرنے کی عملی نہ کی چنانچہ انہیں خطاب بھی عطا ہوا۔ اور جاگیر بھی ملی۔

البتہ اس دوران میں ملتان کے اُس خانوادہ رشید و ہدایت نے جسے عرف عام میں گیلانی خاندان کہا جاتا ہے۔ جس خلوص و محبت اور جس استقلال و پامردی سے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ اُس کی یاد آج بھی میرے لئے سرمایہ انبساط اور موجب فخر و مباہات ہے۔ تیسرے محمد رفقا شاہ گیلانی مرحوم اور سید ولایت حسین شاہ گیلانی مرحوم۔ دونوں اسمبلی کے رکن تھے۔ وہ اگرچہ ایوان کے اندر یونینٹ پارٹی کے حلقے میں بیٹھتے تھے۔ لیکن انہوں نے بارہا ہم سے کہا تھا کہ میں دن آپ حکم دیں گے۔ ہم وزارت پارٹی کو چھوڑ کر آگ بیٹھ جائیں گے۔ ملتان شہر میں لیگ کے بڑے بڑے شاندار جلسے ہوئے۔ جن کی تمام تر کامیابی انہی اصحاب کی

کوشش کا نتیجہ تھی۔

ایک پبلک جلسے کی صدارت تو خود حضرت مخدوم پیر صدر الدین شاہ صاحب گیلانی نے بہ نفس نفیس فرمائی تھی۔ حضرت کاسن شریف اُس وقت اُسی کے لگ بھگ تھا۔ اذیت سے خانہ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن جب اُنہیں معلوم ہوا کہ آج قوم کو اُن کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ بے دریغ گوشہ عزت سے نکل کر میدان میں آ گئے۔

ہفتہ وار نیوٹائز کو جاری ہونے سے بھی سال بھر سوچا تھا۔ اور اس ایک سال کے عرصے میں اس اخبار نے اسلامیان پنجاب کے انگریزی خواں طبقے کو مسلم لیگ کے کام اور پیغام سے روشناس کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔۔۔ اخبار کی سالانہ گمرہ کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا پیغام ارسال فرمایا۔

”گذشتہ ایک سال میں نیوٹائز نے قوم کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ میں اُن کو بڑے اطمینان اور مسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس اخبار کے خریدار بنیں۔ تاکہ نیوٹائز سندھ و ستان کے مسلمانوں کے ایک ذمہ دار۔ اور باوقار ترجمان کی حیثیت اختیار کرے۔“

۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء کو رنٹر کا بچیت مسلم برورڈ کے زیر اہتمام۔ لاہور میں یوم اقبال کی تقریب منائی جانے والی تھی۔ جس کے لئے مسلم برورڈ نے بڑی گرجوٹی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بیرون لاہور سے بھی بعض لوگ شرکت کیلئے

آ رہے تھے۔ اس موقع پر سر سکندر حیات خاں نے ذیل کا بیان اخبارات میں شائع کیا۔

”یوم اقبال کو ایک مقدس قومی تقریب کے طور سے منائے جانے پر۔ ہر ہندوستانی کو بالعموم اور ہر پنجابی کو بالخصوص۔ سچے دل سے خوش ہونا چاہیے۔ میری ولی تمنا ہے کہ اس یادگار تہوار کی مسرتیں جو ایشیا کے نامور فلسفی اور عظیم المرتبت شاعر کے نام سے منسوب، صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہنی چاہئیں، بلکہ تمام مشرقی ممالک کو اُن میں شریک ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس تقریب کو اُس منانت اسجیہ کی اور وقار سے منائیں، جس سے ایک طرف تو دنیا پر اقبال کی عظمت، اور اُس کی شاعری کی حقیقی قدر و منزلت ظاہر ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے، کہ ایشیا اپنے اس فرزندِ جلیل کے ادبی کارناموں کی قدر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔“

”عرصہ دماز کی گراں خوابی کے بعد۔ اگر آج ہمیں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نظر آتے ہیں، تو یہ سب کچھ اقبال کی پُر جوش آواز کا اثر ہے اور ہندوستان کے باشندوں میں بھی جو تڑپ اور بلند نگہی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ بھی اس بالغہ عظیم کی مساعی کی شرمندہ احسان ہے۔ لہذا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ کہ وہ یوم اقبال کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھ کر۔ اس میں سرگرمی سے حصہ لے۔“



"اسی سلسلہ میں ہیں یہ تجویز پیش کرتا ہوں۔ کہ جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے۔ وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ شاعر اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ۔ اقبال کمیٹی کو چاہیے۔ کہ اپریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبال کے نیاز مندوں اور ان کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہ راست بنک کو ارسال کر دیں۔ جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

"علامہ ازیں۔ میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں۔ کہ تمام مسجدوں اور مندروں میں اقبال کی صحت اور درازی عمر کے لئے دعائیں مانگی جائیں۔ کہ خدائے تعالیٰ انھیں عرصہ دراز تک سلامت رکھے تاکہ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکیں۔" طہ  
سرسکندر کی اس تجویز کے جواب میں۔ ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا بیان اخباروں میں شائع فرمایا۔

"سرسکندر حیات خاں نے۔ انٹر کالجیٹ مسلم بورڈ کے نام جو پیغام دیا ہے۔ اس میں انہوں نے میرے متعلق بہت سے محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

طہ سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۳۷ء

”مہر سکندر نے یہ تجویز پیش کی ہے، کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ سب مل کر مجھ کو ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات ہیں، ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر ہند کہ اس شخص کی شاعری نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی روح کو گیوں نہ جلا بخشتی ہو۔ فرزا اور اس کی اختیارات بہر حال ختم ہو جاتے دالی چیز ہے۔ لیکن قوم اور اس کی اختیارات ہمیشہ باقی رہے گی۔“

”آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت، یہ ہے۔ کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے، لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیرے ڈانم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہوئی جاسکے۔ اسلامی تاریخ، فقہ، دینیات اور تصوف سے غیر قدر جمالت پنجاب میں پڑھنی جا رہی ہے اور اس حالت سے بس قدر نامہ مغرب مند لگے ہیں پنجاب میں انہیں ایسی سائنس ہندسہ اور کیمیا کی پڑھنی اب وقت آ گیا ہے۔ کہ اسلامی فکر، اور اسلامی طرز حیات کا بجز مطالعہ کر کے، ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اس مقصد اور پیغام کو کس طرف تہہ در تہہ پر دوں میں چھپا دیا گیا ہے، نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیڑا کر مٹا دیا گیا ہے۔ ان پر دوں کو اب اٹھانا چاہیے تاکہ نئی نسل کے نوجوان، اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔“

”مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی۔ یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے تو دوسری طرف اس نے نوع انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو پنجاب کے وزیر اعظم پسند فرمائیں گے۔ اور اپنے اثر و رسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک تنویر روپے کی حقیر رقم۔ اس مجوزہ فنڈ کی تدرکرتا ہوں۔“

۱۹۳۷ء کے اختتام تک۔ یونینٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں کوئی مفاد ہمت نہ ہو سکی۔ اور دونوں فریق اپنے اپنے راستے پر گامزن رہے۔ انہی دنوں میں نے ایک روز ملک بھرکت علی سے پوچھا تھا کہ۔ ”۲۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو۔ جب آپ نے سکندر جناح پیکٹ کا پہلا سمودہ مرتب کیا تھا۔ تو اس میں آپ نے کون سی ایسی بات لکھی تھی جسے سکندریات نے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا؟“

ملک صاحب نے جواب دیا۔ ”کہ میں نے اس میں لکھا تھا۔ کہ یہ اعلان کیا جائے۔ کہ وہ یونینٹ پارٹی۔ جس کی تشکیل اپریل ۱۹۳۶ء میں۔ بر فضل حسین نے کی تھی۔ اور جس کے تحت ۱۹۳۷ء کی الیکشن لڑی گئی تھی ختم ہو چکی ہے اور اب اس پارٹی کے مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگ میں آئے ہیں۔“

بے سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ اکتوبر ۱۹۳۷ء

ظاہر ہے اگر ملک برکت علی کی یہ تجویز اُس وقت مان لی جاتی۔ تو سارا قضیہ ختم ہو جاتا۔ اور آئندہ کوئی جھگڑا رونما نہ ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میاں مشتاق احمد گورمانی نے پچھلے دنوں روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر۔ زیڈ۔ اے۔ سلیری کے خلاف۔ ازالہ حیثیت عری کا جو استغاثہ دائر کیا تھا۔ اُس میں انہوں نے عدالت عالیہ کے روپوشہادت دیتے ہوئے۔ کہا تھا کہ یونینٹ پارٹی ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ وہ سیاسی یا قومی مفہوم کے اعتبار سے۔ کوئی جداگانہ پارٹی نہ تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ گورمانی صاحب کی پیدائش غلط ہے۔ یونینٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی تھی۔ جس کا وجود اسمبلی سے باہر موجود تھا۔ گورمانی صاحب خود یونینٹ پارٹی کی وزارت میں پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ اُن سے بہتر اس حقیقت سے کون واقف ہوگا۔ پھر تعجب ہے۔ انہوں نے یہ کیونکر کہا۔ کہ یونینٹ پارٹی محض ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ اور اسمبلی سے باہر اس کا وجود نہیں تھا۔

ممکن ہے بعض لوگ سوال کریں۔ کہ سکندر جناح پیکیٹ کے متعلق پنجاب کے عام ہندوؤں کے تاثرات کیا تھے۔ عام ہندوؤں سے مراد اگر غیر کانگریسی ہندو ہیں تو اُن کا بیشتر حصہ ہندو سبھلے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے ترجمان پر ذنییر گلشن رائے تھے۔ پر ذنییر گلشن رائے۔ ۱۹۲۲ء سے سرفصل حسین کی پالیسی کے سب سے

لے روزنامہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۵۸ء

پڑے نکتہ چینی اور معترض چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ تحریروں و تقریر سے۔  
فضل حسین کی پالیسی کو بدلتے طعن بنائے رکھا تھا۔ ہندوؤں کا یہی طبقہ تھا  
جس نے چودھری چھوڑا رام کو۔ اس شرط پر وزارت کی پیش کش کی تھی کہ  
وہ فضل حسین کا ساتھ چھوڑ کر۔ ہندو سبھا میں شامل ہو جائیں۔

پروفیسر گلشن رائے کے نزدیک یونینسٹ پارٹی سراسر مسلمانوں کے  
مفاد کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ اور اس پارٹی کا غیر فرقہ دارانہ بہرہ دہ۔ صرف ہندوؤں  
کو تریب دینے کی ایک چال تھی۔ لیکن عجیب بات ہے۔ کہ جونہی سکندر جناح  
بیکٹ مرتب ہوا۔ پروفیسر گلشن رائے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ اب یونینسٹ  
پارٹی کی غیر فرقہ دارانہ روح سلب ہو گئی ہے۔ اور آئندہ پنجاب پر مسلم لیگ ایسی  
فرقہ پرست جماعت کی حکومت ہو جائے گی۔ اس موضوع پر۔ اُن کا ایک  
مضمون۔ جو ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سول ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا اس  
کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۷ء میں۔ نیڈت جواہر لال نہرو لاہور تشریف لائے۔ اور جاوید  
منزل میں علامہ اقبال سے بھی ملے۔ نیڈت نہرو کی تشریف آوری کی وجہ بڑی  
دلچسپ تھی۔ ۷ مئی ۱۹۳۷ء کو۔ سول ملٹری گزٹ میں۔ میاں صدیق خان دلتا  
کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ کانگریس ہائی کمان  
نے۔ پنجاب کے مسلمانوں میں کانگریس کا پرہیز کیا گندہ کرنے کے لئے۔ ڈھائی لاکھ  
روپیہ خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور عنقریب مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف  
لائیں گے۔ تاکہ مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹریٹ لاہور کے

مشورے سے۔ اس پر اپا گنڈہ کا خاکہ تیار کیا جائے۔ یہ روپیہ ڈاکٹر محمد عالم کی تحویل میں رہے گا۔ جس سے وہ اردو کا ایک روزنامہ اخبار جاری کریں گے۔ اور بہت سے نخواہ دار آدمیوں کو پر اپا گنڈہ کے لئے ملازم بھی رکھیں گے۔

ڈاکٹر عالم اپنی شہرت اور نیک نامی کے باعث میں بلاوجہ ذکی المحسن واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ مضمون پڑھنے کے بعد سول ملٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر اور میاں احمد یار خان دولت کے خلاف۔ ازالہ حیثیت عری کا استدعا نامہ دائر کر دیا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کو بطور گواہ طلب کیا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اس مقدمہ میں شہادت دینے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اور میاں افتخار الدین کے دولت لکے پر ذر و گش ہوئے۔

علامہ اقبال نے انہیں پیغام بھیجا کہ مجھ سے ملتے جاتے گا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اس پیغام کی تعمیل میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ :

..... اپنے انتقال سے چند مہینے قبل جبکہ وہ بسترِ عدالت پر راز تھے۔ انہوں نے مجھے یاد فرمایا۔ اور میں نہایت خوشی سے۔ اس ارشاد کی تعمیل میں ان کی خدمت میں دماغ فرمایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود۔ ہمارے درمیان کبھی قدریاتی اشتراک موجود تھا۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس شخص کے ساتھ کام کرنا۔ کتنا آسان اور سہل ہے۔ وہ اس وقت پرانی یا دیں تازہ

کر رہے تھے۔ اور گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ جس میں  
میں نے خود بہت کم حصہ لیا۔ بلکہ زیادہ تر۔ انہی کی باتیں سنتا رہا  
میں ان کی شاعری کا مذاح ہوں۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد  
خوشی ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے۔ اور میرے متعلق اچھی  
رائے رکھتے ہیں۔“ لہ

پنڈت نہرو کے ساتھ۔ میاں افتخار الدین بھی تھے، اور باتیں واقعی مختلف  
موضوعات پر ہوتی رہیں۔ پنڈت نہرو۔ اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم  
کا پر اپاگنڈا کرنے میں مصروف تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے وداہلاسوں  
کے وہ صدرہ چکے تھے۔ اور دونوں مرتبہ اپنے خطباتِ صدارت میں انہوں  
نے کہا تھا، کہ ہندوستان کے تمام معصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگریس  
کے بڑے بڑے لیڈرز ہیں۔ کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا  
معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل۔ راج گوپال اچاری اور ستیہ مورتی  
نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔  
دورانِ مذاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا۔ کہ سوشلزم  
کے بارے میں کانگریس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟  
پنڈت جی نے جواب دیا کہ "نصف درجن کے قریب"

↓ 'THE DISCOVERY OF INDIA'

By Jawahar Lal Nehru (Page 298)

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "تجرب ہے۔ خود آپ کی جماعت میں۔ آپ کے ہم خیالوں کی تعداد۔ صرف نصف درجن ہے۔" اور آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں۔ کہ میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کا مشورہ دوں۔ تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں۔"

اس پرنٹڈ جی خاموش ہو گئے۔

پھر جب ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر چھڑا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مغربی ایشیا دراصل اسلامی ایشیا ہے۔ ادا آئندہ سیاسیات عالم میں۔ مغربی ایشیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ اگر ہندوستان میں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اور انھیں ناراض کر لیا۔ تو خود مغربی ایشیا کے ساتھ ان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اس لئے ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ تاکہ مغربی ایشیا کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے رہیں۔

ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے سامنے گفتگو جاری تھی۔ کہ یکایک مریاں افتخار الدین ریح ہیں بول اٹھے کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے بیٹے کہیں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناب سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے، کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں۔ تو نتیجہ بہتر نکلے گا!"

ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور انگریزی میں کہنے لگے "اچھا۔ تو حال یہ ہے۔ کہ آپ مجھے



بہلا چھپلا کر مسٹر جناح کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ نیڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں فتحار الدین کے دخل ورمعقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے۔ انہیں مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

نیڈت نہرو نے اپنی کتاب میں جہاں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ

”اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اقبال کا رُحان سوشلزم کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اشتراکی روس نے جو ہر دست ترقی کی ہے اُس نے اقبال کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری میں بھی اب ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا!“

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے افلاس۔ اور اُنکی اقتصادی زبوں حالی

---

اس ملاقات کے وقت میرے دو دوست بھی وہاں موجود تھے ایک میاں فیروز الدین احمد مرحوم اور دوسرے راجہ سن اختر۔ چند روز بعد دونوں نے مجھے ملاقات کی پوری روئداد سنائی تھی۔ تاہم میں نے بہ نظر احتیاط پچھلے دنوں راجہ سن اختر کو لاہور خط لکھ کر اس واقعہ کی تصدیق کی تو راجہ صاحب نے ایک ایک لفظ کی تائید فرمائی۔

کی وجہ سے۔ ڈاکٹر صاحب کو دولت کی اُس غیر مساویانہ تقسیم کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی۔ جس نے قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کو نانِ شبنہ کا محتاج بنا رکھا تھا خواہ اسے سوشلزم کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجئے۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب روز بروز اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ

”روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرنا جا رہا ہے اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے تدریج نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان کے خیال میں۔ اُس کا افلاس سترہویں صدی کا رُو احمدیہ داروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ پہلو ابھی اُس کی آنکھوں سے اُدھیل ہے۔ کہ اس افلاس کی ایک بہت بڑی وجہ بدلتی حکومت بھی ہے۔ تاہم زودیا بدیر۔ اس حقیقت کا احساس اُسے ہو کر رہے گا۔ جہاں تک جواہر لال کے اُس سوشلزم کا تعلق ہے۔ جس کی بنیاد ہر تہ پر ہے۔ مسلمان اُس طرف چنناں توجہ نہیں کریں گے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر مسلمانوں کا افلاس دور کرنے کی اد تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟

یاد رکھیے! مسلم لیگ کے سائے مستقبل کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ لیگ اس سوال کا کوئی تسلی بخش حل تلاش کرے۔ اگر لیگ الیا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ تو مسلمان عوام حسب سابق۔ لیگ سے بے تعلق اور ناقابل رہیں گے۔“

واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمان زمینداروں نے جس طرح قومی تحریک سے بے اعتنائی اور بے رُخی برتی تھی۔ اور اس کے برعکس۔ جس جرات و سرزندگی سے پنجاب کے غریب مسلمانوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو مجبور کر دیا تھا۔ کہ وہ اس غریب۔ پس ماندہ اور فائدہ کش طبقے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں۔ اُن دنوں ایک اور جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جسے جذبہ سرزندگی کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ یقیناً ایسا بھی گذرا تھا۔ جب اقبال کی عافیت پسندی اور اعتدال مزاجی ضرب المثل بن گئی تھی۔ اور انہوں نے ایک خط کے جواب میں۔ اپنے ایک دوست کو بھی لکھ دیا تھا کہ :

یہ عقدہ ہائے سیلست کچھ مبارک ہوں

کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اول تو وہ عرصہ دراز تک۔ سیاسیات سے کنارہ کش رہے۔ اور جب سیاسیات میں آئے بھی تو حد درجہ اعتدال پسندی۔ میانہ روی۔ اور عافیت کشی کے ساتھ لیکن اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں اقبال وہ پُرانا اقبال نہیں رہا تھا۔ جو اس خازن میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا عادی تھا۔ اب اقبال سہول نافرمانی میں شریک ہونے۔ قید و بند کے شدائد برداشت کرنے۔ اور سینے پر گولی کھانے کو آمادہ تھا۔ یہ انقلاب کیونکر آیا۔ اس کے پیچھے بہت سے نفسیاتی اسباب کار فرما تھے۔

مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب، اکتوبر ۱۹۳۷ء کو

مشرخاچ کو لکھتے ہیں ۔

”مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو سحت پریشان کر رکھا ہے ..... ذاتی طور پر میں ایک ایسے مسئلے کی خاطر ۔ جس کا تعلق اسلام اور ہندوستان کے ساتھ ہے جیل جانے کو تیار ہوں ۔ مشرق کے دروازے پر ۔ مغربی اسٹیپار کے اس اڈے کی تعمیر ۔ اسلام اور ہندوستان ۔ دونوں کے لئے خطرے کا باعث ہے ۔“

جب ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے قیل بیچ نے ۔ مسجد شہید گنج کی اپیل غارج کر دی ۔ تو مسلمانوں میں سنت ہیجان پیدا ہو گیا تھا ۔ اور بڑے بڑے احتجاجی جلسوں نکلنا شروع ہو گئے تھے ۔ اسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ۔ کہ اب کیا کرنا چاہیے ۔ تو ڈاکٹر صاحب روپڑے ۔ اور کہنے لگے : ”مجھ سے کیا پوچھتے ہو ۔ میری چار پائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ ۔ اور اُس طرف سے چلو ۔ جدید مسلمان جا رہے ہیں ۔ اگر گولی چلی ۔ تو میں بھی اُن کے ساتھ مر رہا گا !“

یہ سب باتیں ظاہر کر رہی ہیں ۔ کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں کس حد تک بدل گئے تھے ۔ شعروہ اب بھی کہتے تھے ۔ گریہ بے اختیار اب بھی اُن پر طاری ہوتا تھا ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جنوں جوں بیماری اُن پر غلاب آرہی تھی ۔ اسی نسبت سے وہ سیاسیات میں انتہا پسند بننے جا رہے تھے ۔

۱۰ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

۱۹۳۷ء کی سرگرمیوں میں۔ ڈاکٹر محمد اشرفی، جو کانگریس کی تحریک مسلم رابطہ عوام کے نگران تھے۔ لاہور تشریف لائے تھے۔ اور علامہ اقبال سے بھی ملے تھے۔ میں نے کچھ دنوں۔ انھیں خط لکھ کر۔ اس ملاقات کا حال دریافت کیا۔ تو انہوں نے مجھ کو جو جواب دیا۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

» کیوڑی بل کاغذ

دہلی یونیورسٹی

دہلی

۲۲ فروری ۱۹۵۷ء

میرے مشفق۔ میرے محترم۔ آپ نے خط کیا لکھا۔ جانے کب کب کی یاد تازہ کر دی۔ خدا کرے آپ مستقل طور سے لندن ہی میں رہیں۔ تاکہ علمی کام کر سکیں۔

یہ صحیح ہے۔ کہ مجھے علامہ مرحوم سے لاہور میں پہلی بار تفصیلی ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اور یہ ملاقات مجھے ساری زندگی یاد رہے گی۔ یہ زمانہ میری اور آپ کی جوانی کا تھا جسے لوگ اب "ایام جاہلیت" سے تعبیر کریں گے۔ میں صرف یہی نہیں کہ قوم پرست تھا۔ بلکہ آپ کو یاد آئے گا تقسیم وطن سے پہلے ہم سب میں بٹا کی خود اعتمادی تھی۔ چنانچہ میں موقع بے موقع جبارت اور شوخی سے بھرے کام لیتا تھا۔ علامہ مرحوم کی ملاقات کے موقع پر۔ میں نے لاہور دار دہونے سے پہلے۔ اخبارات میں ایک بیان دے کر۔ ارکان مسلم لیگ سے ایک متحدہ سامراج دشمن

مخاذ بنانے کی اپیل کی تھی۔ چنانچہ ملتے ہی۔ علامہ مرحوم نے پہلے اس بیان کا ذکر کیا۔ اور اس کے بعد میرے خیالات کی تائید کی۔ مگر پھر کچھ افسردگی کے ساتھ فرمایا۔ کہ ہماری جماعت (یعنی مسلم لیگ) میں قوتِ عمل کی بڑی کمی ہے۔ میں نے حال ہی میں مسٹر جناح راس رمانے تک قائدِ اعظم کا لقب رائج نہ ہوا تھا) کو اس سلسلہ میں لکھا بھی ہے۔ کہ مسلمان جیسی فعال جماعت کو۔ آپ محض آئینی اور قانونی طور پر ترقی سکھانا چاہتے ہیں۔ جس سے اس کی قوتِ عمل مفلوج ہو جائے گی!"

نپڈت نہرو نے اپنی کتاب میں۔ جہاں اقبال سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

"اقبال پاکستان کے اولین عامیوں میں تھے۔ حالانکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت۔ اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمحل ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے۔ کہ اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں، اُن سے کہا تھا۔ کہ انہوں نے پاکستان کی تجویز محض اس لئے پیش کی تھی۔ کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر تھے۔ لیکن اب اُن کا خیال ہے کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے۔ سخت نقصان رساں ہوگی۔ اقبال نے غالباً بعد میں اپنا نقطہ نگاہ بدل لیا تھا۔ یا ممکن ہے۔ انہوں نے ابتدا میں۔ اس تجویز کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا

تھا۔ کیونکہ اُس وقت پاکستان کے تصور نے ابھی اتنی اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ حیاتِ انسانی کے متعلق اقبال کا جو نظریہ ہے وہ تقسیم ہند یا قیامِ پاکستان جیسی تجویز کے ساتھ قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔

پیڈت نہرو کی یہ کتاب دنیا کے اشرمالک میں پڑھی گئی ہے۔ اور اُن کے مذکورہ بالا الفاظ نے بہت سے لوگوں کو۔ اس دہم میں مبتلا کر دیا۔ اور ان کا اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں تقسیم ہند یا قیامِ پاکستان کی تجویز کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس لئے میں پیڈت نہرو کے اس دعوے پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جو مغالطہ انہوں نے پھیلا دیا ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔

پیڈت نہرو کے اس دعوے کا دار و مدار۔ کلینٹن ایڈورڈ ٹامسن کی روایت پر ہے۔ ایڈورڈ ٹامسن آکسفورڈ میں۔ تاریخ ہند اور بنگلہ زبان کے پروفیسر تھے۔ انہیں ہندوستان سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اکثر زبان آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ مرتبہ وہ انگلستان کے مشہور اخبار مینچسٹر گارڈین کے نامہ نگار بن کر بھی ہندوستان تشریف لائے گئے تھے۔ وہاں تکا ندھی۔ ڈاکٹر ابندر ناتھ ٹیگور۔ جو اس لال نہرو۔ راج گوپال اچاری۔ سردار لچھ بھائی پٹیل وغیرہ سے اُن کے خاص مراسم تھے۔ اُن کا شمار اُن انگریزوں میں ہوتا تھا۔ جو کانگریس کے بہت بڑے معادن اور سردار اور خیر خواہ تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر و تحریر میں ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت اور

THE DISCOVERY OF INDIA

کانگریس کی حمایت کی۔ ایڈورڈ ٹامسن کم: بیش پچپن کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ جن میں ادب، شعر، تنقید، تاریخ، سیاست، فلسفہ سمجھی کچھ ہے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

جس روایت پر۔ پنڈت نہرو نے۔ اپنے دعوئے کا انحصار کیا ہے۔ اُس کا ذکر ایڈورڈ ٹامسن کی دو کتابوں میں موجود ہے۔ ایک کتاب جو سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی اُس میں وہ کہتے ہیں۔

”اس بارے میں کچھ جھگڑا چلا آ رہا ہے۔ کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے کس کو سوچھا تھا، عام طور پر مشہور شاعر سر محمد اقبال کا نام لیا جاتا ہے، کہ انہوں نے پہلے پہل یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ اقبال میرے دوست تھے، اور انہوں نے اس ضمن میں میرے تمام خط و کتابت کو رفع کر دیا تھا۔ پہلے انہوں نے اس بات پر نشوونما کا اظہار کیا۔ کہ میرے وسیع، غیر منظم اور ناقص کشمکش ملک میں طوائف الملک کی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ ان کا خیال ہے کہ پاکستان ہندوؤں، مسالوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لئے تباہی کا موجب ہو گا۔ اور آخر میں انہوں نے کہا: لیکن میں مسلم لیگ کے صدر ہوں، اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں گا“

ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)

By Edward Thompson Page 58



ٹامسن کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اور اقبال کے درمیان  
زبانی گفتگو ہوئی تھی۔ جس میں اقبال نے اپنا دردِ دل اُن کے سامنے بیان کیا  
تھا۔ لیکن انہوں نے ایک اور جگہ اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے  
کہ اقبال نے انہیں اس موضوع پر خط لکھا تھا۔ زبانی گفتگو نہیں کی تھی۔  
وہ فرماتے ہیں -

” اقبال بیک وقت ایک فلسفی، شاعر، عالم دین اور سیاست دان  
تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے جبکہ انہیں معلوم  
ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مجھ کو ایک خط  
میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ  
”میرے وسیع، غیر منظم اور غمازہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا  
ہوتی نظر آتی ہے۔“

ایڈورڈ ٹامسن کی اس روایت سے تین قابل غور نکتے پیدا ہوتے ہیں -

اول : اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے جبکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا  
کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں  
طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔

دوم : بدیں وجہ - انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ پاکستان ہندوؤں  
مسلمانوں اور برطانوی حکومت مینوں کے لئے تباہی کا موجب ہو گا۔

۱۰ "ETHICAL IDEALS IN INDIA TO-DAY" (1942)

سیدم: آخر میں انہوں نے فرمایا: "لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں، اس لئے

میرا فرض ہے کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں" لہ

ایڈورڈ ٹامسن کی اس روایت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس وقت

اقبال نے اُن کو خط لکھا تھا۔ اُس وقت اقبال مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور

اگرچہ وہ پاکستان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے لئے تباہی

کا موجب خیال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے اس لئے

انہیں مجبوراً تجویز پاکستان کی حمایت کرنا پڑی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اُس وقت

مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان تھا۔ اور خود اقبال اس نصب العین سے

اتفاق نہیں کرتے تھے۔ لیکن از بسکہ انہیں لیگ کی کرسی صدرت پر بٹھا دیا

گیا تھا۔ اس لئے انہیں طوعاً و کرہاً اس نصب العین کی حمایت کرنا پڑی۔

علامہ اقبال اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ مسلم لیگ کے صدر بنے تھے

اور یہ واقعہ دسمبر ۱۹۴۷ء کا ہے۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد

میں ہوا تھا۔ اُس وقت مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان نہیں تھا۔ بلکہ

ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا قیام تھا۔ جس میں مسلمانوں کے سیاسی

معاشرتی اور مذہبی حقوق محفوظ ہوں۔ ظاہر ہے اُس وقت اقبال اپنی مرتبی

لہ ایڈورڈ ٹامسن نے علامہ اقبال کے جو الفاظ اپنی کتاب میں دیئے ہیں وہ یہ ہیں۔

"But I am the president of The Moslem League

and therefore it is my duty to support it"

کے خلاف یا اپنی طبیعت پر جبر کر کے۔ نظریہ پاکستان کی حمایت کرنے پر قطعاً  
مجبور نہ تھے۔

ساری دنیا کو معلوم ہے۔ کہ الہ آباد کے اسی اجلاس میں۔ پہلے پہل اقبال  
نے یہ خیال پیش کیا تھا۔ کہ شمال مغربی سندھوستان کے اُن علاقوں کو جہاں  
مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باہم ملا کر۔ ایک جداگانہ مملکت بنا دیا جائے۔ اُنکے  
الفاظ یہ ہیں۔

”میری خواہش ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان  
کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت  
برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اسکے  
باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے۔ کہ اور نہیں۔ تو شمال مغربی سندھوستان  
کے مسلمانوں کو آخما یک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی“  
یہ تجویز سراسر اقبال کا ذاتی خیال تھا۔ مسلم لیگ کی سرکاری پالیسی نہ تھی۔  
خود اقبال نے اپنے خطبے کے شروع میں۔ صاف کہہ دیا تھا۔ کہ ”میں کسی جماعت  
کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور  
اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا  
ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل و متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی  
کی روح سے، جیسا کہ مختلف زبانوں میں۔ اُس کا اظہار ہوا ہے۔ رہا ہے۔ میں نے

۱۷ خطبہ صدارت -

اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔“

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اُس سے ایڈورڈ ٹامسن کی اس روایت کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ کہ اقبال کو صرف اس لئے پاکستان کی حمایت کرنا پڑی کہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ لیکن اُس کے ساتھ ٹامسن یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال نے ان خیالات کا اظہار اُس وقت کیا تھا۔ جبکہ وہ بسترِ علالت پر دراز۔ اور دنیا سے رخصت ہونے کے قریب تھے۔

اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔ اگر ایڈورڈ ٹامسن کے الفاظ پر اعتبار کر لیا جائے۔ تو اقبال نے اپنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے ٹامسن کو وہ خط لکھا ہو گا۔ جس کا حال انہوں نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ لیکن جب ہم اقبال کی ان تحریروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو انہوں نے اپنی وفات سے صرف سال بھر پہلے سپردِ قلم کی تھیں۔ تو حیرت سے ہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اقبال اُس وقت اس شدت اور اس غیر مثبتہ انداز سے پاکستان کی حمایت اور تبلیغ کر رہے تھے۔ کہ اُس کی نظیر خود ان کی زندگی میں۔ اس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ ۸ مئی ۱۹۳۷ء کو اقبال مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”شریعتِ اسلام کا طویل اور عمیق مطالعہ کرنے کے بعد۔ میں

اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اگر اس قانون کو۔ اچھی طرح سوچ

سمجھ کر نافذ کیا جائے۔ تو کم از کم ہر شخص کو زندہ رہنے کا سامان

مزدبلیسر آسکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعت کا نفاذ اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک کہ یہاں ایک یا ایک سے زائد آزاد و خود مختار اسلامی مملکتیں قائم نہ ہو جائیں۔ میں کہی سالی سے اس عقیدے کا حامی ہو گیا ہوں اور اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے روٹی کا مسئلہ حل کرنے اور ہندوستان میں اس نامان پر قرار رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اگر یہ امر ناممکن ہے۔ تو پھر دوسری صورت سوائے اس کے۔ اور کوئی نہیں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی برپا ہو۔۔۔۔۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی نئے سرے سے تقسیم ہو۔ اور ایک یا ایک سے زیادہ مملکتیں قائم کی جائیں۔ جہاں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل ہو کیا آپ محسوس نہیں کر رہے کہ اس چیز کا مطالبہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔" ۱۷

ڈاکٹر صاحب نے ۲۱ جون ۱۹۳۶ء کو ایک اور خط مسٹر جناح کو لکھا جس میں پہلے انہوں نے ۱۹۳۵ء کے آئین کے نقائص بیان کئے۔ کیونکہ اس آئین کی رو سے، مسلم اکثریت کے عہدوں میں بھی مسلمانوں کو کلیتہً ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈال دیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے کانگریس کے صدر کا شکوہ کیا۔ جس نے مسلمانوں کی سیاسی سستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا

۱۷ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

اس کے بعد انہوں نے ہندوہما سبھا کے اس اعلان کا ذکر فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم نہیں بنائی جاسکتی۔ اور آخر میں نثر مایا :

..... اندر میں حالات یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی، نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ بہت سے برطانوی سیاست دان بھی اس چیز کو محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان میں لارڈ لودین نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ میری یہ تجویز ہی ہندوستان کے مصائب کا مداوا بن سکتی ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں۔ اس تجویز پر عملدرآمد کرنے کے لئے۔ پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔

" پنجاب کے بعض مسلمان ابھی سے یہ سوچ رہے ہیں۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک جداگانہ کانفرنس منعقد ہونی چاہیے۔ اس بار سے میں مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ کہ ہماری قومی تنظیم ہندوؤں کے منزل پر نہیں پہنچی۔ اور غالباً ابھی موزوں وقت ہی نہیں آیا کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ہو سکے۔ تاہم میری رائے ہے کہ آپ اپنے خطبہ صدارت میں اس بارٹ اشارہ ضرور

کردیجئے۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بالآخر اس نوع کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

"ہیں سمجھتا ہوں کہ نیا آئین۔ جس کی رُو سے ہندوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن قائم ہوگا۔ بالکل مایوس کن ہے۔ میں نے سطورِ بالا میں جو خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق۔ جب تک اسلامی اکثریت کے صوبوں کا ایک الگ فیڈریشن نہ قائم کیا جائے گا۔ ہندوستان میں امن برقرار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات ملے گی۔ کیا وجہ ہے۔ کہ شمال مغربی ہندوستان۔ اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک جدا گانہ قوم تصور کر کے۔ انہیں حق خود ارادی نہ عطا کیا جائے۔ جیسا کہ اندرون ہندوستان کی دوسری قوموں کو یہ حق حاصل ہے۔

"ذاتی طور پر۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ بجالات موجودہ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہیے۔ کہ وہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیں۔ اکثریت اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے باہمی مفاد کے لئے۔ یہ طرزِ عمل بہترین ثابت ہوگا۔"

۱۰ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ڈاکٹر صاحب نے یہ خطا - اپنی وفات سے صرف دس مہینے پہلے لکھا تھا  
 ایسی دو ٹوک - واضح اور غیر مشتبہ تحریر کے بعد - اٹیور ڈیٹامین کا یہ بیان  
 قطعاً قابل التفات قرار نہیں دیا جاسکتا - کہ "اقبال نے اپنے انتقال سے  
 کچھ دیر پہلے - جبکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا - کہ وہ اس دنیا سے رخصت  
 ہو رہے ہیں - مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی - اور رنج و افسوس  
 کے ساتھ لکھا تھا - کہ پاکستان سندھوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت  
 تینوں کے لئے تباہی کا موجب ہوگا - لیکن میں مجبور ہوں - کیونکہ میں  
 مسلم لیگ کا صدر ہوں - اور میرا فرض ہے - کہ اس تجویز کی حمایت کروں"



۴

## چودھواں باب

### مسجد شہید گنج کا قضیہ

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری دو برسوں میں مسلم لیگ کی سیاست کے علاوہ مسجد شہید گنج کے قضیے نے بھی خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی اور یہ قضیہ آخر تک ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لاہور کے ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازے کی طرف جا میں تو ٹکنیکل سکول کے عقب میں جہاں گنڈا بازار شروع ہوتا ہے۔ ایک بہت پرانی مسجد کھڑی تھی۔ جسے عام طور پر مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد شاہجہاں کے عہد میں ایک شخص عبداللہ خاں نے تعمیر کی تھی۔ عبداللہ خاں داراشکوہ کا خاندان تھا۔ اور اپنے آقائے نامدار کی مہربانی سے کچھ عرصے کے لئے لاہور کا گورنر بھی بن گیا تھا۔ جب تک لاہور پر سکھوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اس مسجد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔

پنجاب کے مغل صوبیدار نواب معین الدولہ نے جب پنجاب سے

سکھوں کی شورش مٹانے کے لئے - جنگ و جدال کا سلسلہ شروع کیا۔ تو مسجد کے متصل کو توالی تھی۔ جہاں مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ تعزیم و تادیب کے اسی دور میں - ایک شخص بھائی تارو سنگھ بھی اس مقام پر مارا گیا۔ بھائی تارو سنگھ سکھوں کی نگاہ میں ایک بڑی مقدس اور برگزیدہ سٹی تھی چنانچہ سکھوں نے اس جگہ کو مسجد شہید گنج کا نام دے دیا۔ اور وہاں ایک سادھ بھی تعمیر کر دی۔ رنجیت سنگھ کے درود سے پہلے جب سہہ حاکمان لاہور کی حکومت قائم ہوئی۔ تو سکھوں نے بھائی تارو سنگھ کی سادھ کے قریب سے فائدہ اٹھا کر - اس مسجد پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسجد سکھوں کے قبضے میں چلی آ رہی تھی -

مولوی لودا حد چستی نے ۱۸۶۴ء میں - اپنی کتاب - تحقیقاتِ حستی مکمل کی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق ۱۸۶۲ء میں - اس مسجد پر گنڈا سنگھ اور گوردت سنگھ دو بھائی قابض تھے۔ جو مسجد کی دوکانوں کا کاریہ بھی دھول کرتے تھے۔ اور مسجد کے صحن اور دالان کو لنگر خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے

۱۷ گوجر سنگھ، ہناسنگھ اور سورجیا سنگھ بھنگی نٹل کے سکھ تھے انھوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۶۶۵ء سے ۱۶۹۹ء تک پورے چونتیس سال لاہور کو اس بے درزی سے لوٹا کہ اس عظیم الشان شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - یہ تینوں لیسری تاریخ پنجاب میں سہہ حاکمان لاہور کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں -

اس کے علاوہ مسجد کے صحن میں۔ لوہے کی ایک بہت بڑی کڑاہی۔ ہر وقت بھنگ سے لبالب بھری رہتی تھی۔ جہاں سکھ مسافر بیٹھ کر بھنگ پیتے تھے۔

جون ۱۹۳۵ء میں۔ یگانہ پنجاب کے مختلف حصوں سے سکھوں کے جتھے

لاہور آنا شروع ہوئے۔ اور ساتھ ہی شہر میں یہ افواہ اڑنے لگی۔ کہ سکھ مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ افواہ پایہ یقین کو پہنچ گئی تو مسلمان لیڈروں کے ایک وفد نے گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر۔ عرض کیا۔ کہ اس مسجد کو محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اور جب تک کہ اس تجویز پر باضابطہ عمل نہ ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ دفعہ ۱۲۲ کا نفاذ کر دے۔ تاکہ مسجد کا فوری انہدام رک جائے۔ سر سربراہ ایگزیکٹو پنجاب کے گورنر تھے۔ انہوں نے بات کو ٹال دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے وفد نے۔ سکھ لیڈروں سے گفتگو کی۔ تو سکھوں نے کم از کم اس باسے میں مسلمانوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ جب تک تھرڈ منی گورنر دارہ پور بندھاک کمیٹی۔ مسلمانوں کی اس تجویز پر اچھی طرح غور نہیں کر لے گی۔ اس وقت تک مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی۔ کہ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب میں سکھوں نے یگانہ مسجد کو گرا کر مسمار کر دیا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی۔ کہ انہدام سے قبل۔ حکومت نے مسجد کے چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس متعین کر دی تھی۔ تاکہ مسلمان سکھوں کے اس فعل میں مداخلت نہ کر سکیں گویا مسجد کا انہدام فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوا۔ جب مسلمانوں نے

یہ نقشہ دیکھا۔ تو وہ بغیر کسی ضبط و نظم اور ترتیب کے۔ مسجد کی طرف جانے لگے  
نوح نے بار بار گولی چلائی۔ اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے مولانا طغر علی خاں۔ ملک لال دین قیصر۔  
میاں نیر ذال دین احمد۔ ملک لال خاں۔ سید سرور شاہ گیلانی۔ سید حبیب سید  
محمد شاہ و غیرہ کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ اسکے  
بعد۔ یہ تحریک ذمہ دار لیڈروں کے ہاتھ سے نکل کر۔ بعض سن چلے نوجوانوں کے  
ہاتھ میں چلی گئی حکومت نے مسلمان اخبارات پر سنسز شپ بھی عائد کر دی۔ جس  
کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ واقعات کی صحیح اطلاع سندھ و ستان کے دوسرے علاقوں میں  
نہیں پہنچ سکتی تھی۔

جن چند نوجوانوں کے ہاتھ میں۔ یہ تحریک چلی گئی تھی۔ انہوں نے  
شاہی مسجد کو اپنا صدر مقام قرار دے کر۔ سول ٹا فرمائی شروع کر دی دو  
دو۔ چار۔ چار کی ٹولٹیوں میں۔ مسلمان رضا کار شاہی مسجد سے نکل کر۔  
شہید گنج کی طرف پڑھتے تھے۔ تو پولیس انھیں گرفتار کر لیتی تھی۔ ۱۹۳۶ء  
کے اوائل تک یہی صورت حال قائم رہی۔ اور سینکڑوں نہیں ہزاروں رضا کار  
جیلوں میں چلے گئے۔ اس وقت پنجاب کی حکومت پر تین بڑے مسلمان قابض  
تھے۔ ایک ملک فیروز خان لون جو ذریعہ تعلیم تھے۔ دوسرے نواب منظر خاں  
جو سرسکندر کی جگہ ریونیو ممبر بنا دیے گئے تھے۔ اور تیسرے چودہری شہاب الدین  
جو مجلس قانون ساز کے صدر تھے۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کے اندر سچی۔  
قوی حمیت و غیرت کی رمت ہوتی۔ تو وہ اس حادثہ کو بچکاں

سے متاثر ہو کر فوراً اپنے سرکاری منصب پر ملازمت مار دیتا۔ لیکن یہ لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود گورنر کے قابلِ خدمت رویتے ہیں برابر کے شریک رہے۔

اُس زمانے میں پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے منظم ذی اثر اور فعال جماعت مجلس احرار اسلام تھی۔ جب مسجد کے گہرائے جانے پر صوبے کے طول و عرض میں اضطراب کی لہر اٹھی۔ تو خیال تھا کہ احرار حسب معمول مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے لیکن خلاف توقع انہوں نے بالکل چپ سا دھلی۔ اور جنبش تک نہ کی۔ بعد میں احرار لیڈروں نے اپنی اس برسرِ رخاموشی کی مختلف وجوہیں کرنے کی کوشش کی کبھی کہا گیا کہ میاں فضل حسین کے ایوار سے مسجد گرائی گئی ہے۔ تاکہ احرار اس تحریک میں حصہ لیں۔ تو انہیں گرفتار کر کے۔ جیل میں بند کر دیا جائے۔ کبھی کہا گیا کہ مسجد کا انہدام قادیان کے اٹالے سے ہوا ہے۔ تاکہ احرار کے قید و بند کا سامان آسانی سے پتیا ہو سکے۔ غرض کہ تاویل و توجیہ کی مختلف صورتیں پیش کی جاتی رہیں۔ جن پر عوام میں سے۔ مشکل ہی سے کسی کو یقین آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کا انہدام مجلس احرار کے لئے پیامِ مرگ ثابت ہوا۔ اور اس جماعت نے۔ اگرچہ جولائی ۱۹۳۵ء کے بعد سے اب تک۔ بیسیوں دفعہ سنبھلنے اور اپنا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ لیکن ان کوششوں میں ایک مرتبہ بھی تو اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو مسٹر جنرل۔ اس قیفیے کا حل تلاش کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ ان کی تشریف آوری کے پس منظر میں یہ بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے پہلے سے اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا۔

کہ جب تک لاہور کے مسلمان یہ جھگڑا چکھنے کے لئے۔ انہیں خود مدعو نہیں کریں گے۔ اور اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے۔ کہ وہ مسٹر جناح کے بیٹھنے کے پابند رہیں گے۔ وہ لاہور نہیں جائیں گے۔ مشہور نو مسلم پریسٹر خالد لطیف کا با۔ اس زمانے میں مرکزی اسمبلی کے رکن تھے۔ انہی کے توسل سے لاہور کے مسلمان لیڈروں نے مسٹر جناح کو لاہور آنے کی دعوت ارسال کی تھی۔ مسٹر جناح اس واقعہ سے قبل ۱۹۲۹ء میں۔ علم الدین رحیم نے راج پال کو قتل کیا تھا، کی اپیل کے سلسلے میں۔ ہائی کورٹ میں بحث کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ گویا اب وہ آٹھ سال کے بعد لاہور آ رہے تھے۔

لاہور پہنچنے کے بعد۔ مسٹر جناح نے تحریک کے لیڈروں۔ اور صوبے کے گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر نے کہا۔ کہ اگر سول نا فرمانی بند کر دی جائے۔ اور مسلمان مسجد کی بازیابی کے لئے آئینی طریق سے جدوجہد کریں تو وہ تمام قیدی رہا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ تحریک کے کارکن سول نا فرمانی بند کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اور رات بھر میں۔ جلیوں سے تمام قیدی۔ اور دور دراز مقامات سے نظر بند لیڈر رہا ہو کر۔ لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔

ساتھ ہی ساتھ مسٹر جناح نے سکھ لیڈروں سے بھی ملاقاتیں شروع کیں۔ اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جذبہ مصالحت۔ اور ہم وطنی کا خیال کر کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ کریں۔ مسٹر جناح نے انہیں سمجھایا۔ کہ ملکی مفاد کے پیش نظر۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نہ سکھوں کے لئے مفید ہے۔ اور نہ مسلمانوں کے لئے۔ چنانچہ سکھ لیڈروں نے، جو کسی

کی بات سُننا گوارا نہیں کرتے تھے مسٹر جناح کی بڑی آڈیٹنگ کی۔ اور انہیں اپنے ہمراہ شہید گنج دکھانے کے لئے لے گئے۔ حالانکہ وہ کسی مسلمان کا شہید گنج کے پاس سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مسٹر جناح نے کم و بیش دو ہفتے لاہور میں قیام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۴ء کو دیالی سنگھ کالج کی یونین نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ کالج کا مال کچا کھج سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یونین کے صدر پروینسر لاجپت رائے نے، مسٹر جناح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، انہیں ہندوستان کے مشہور لیڈر گوگھلے سے تشبیہ دی۔ اور کہا، کہ ہندوستان کی نجات کے لئے، مسٹر جناح جیسا راست بازار دلیر ڈکٹیٹور کا رہے۔ جواب میں، مسٹر جناح نے جو تقریر کی۔ اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"میں اس کالج کی فضا کو اپنے لئے بالکل سادہ کار پاتا ہوں۔ یہ درس گاہ جیسا کہ فاضل مقرر نے ابھی کہا ہے، فرقہ پرستی کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئی۔ میرا ابتداء سے یہ عقیدہ ہے، کہ ہندوستان کی نجات، فرقہ پرستی کے ذریعے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میں ماضی میں بھی اس عقیدے کا حامل رہا ہوں۔ اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے۔ اور آئندہ بھی اسی عقیدے کا پیروں رہوں گا۔ آپ نے مسولینی اور شلہما جیسے ڈکٹیٹروں کا ذکر کرتے ہوئے، مجھے اس ملک کا ڈکٹیٹر بننے کی دعوت دی ہے۔ بحالات موجودہ، ہم ہندوستان میں ڈکٹیٹر شپ قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ملک کا حقیقی ڈکٹیٹر وہی



شخص بن سکتا ہے۔ جس کے پاس ایسی قوت ہو۔ کہ وہ ہر خطا کار کو سزا دینے پر قادر ہو۔ اور وطن کی خدمت کرنے والوں کو۔ انعام و اکرام سے سرفراز کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوت ہم میں سے کسی شخص کے پاس بھی نہیں۔

”اس ملک میں۔ کسی بے اصول افسانہ اور بے دیانت لیڈر کے لئے عوام کو آٹو بنا لینا۔ اور ان سے حسب فشار کام لینا چنداں مشکل نہیں۔ بشرطیکہ وہ ان کے جذبات کو براہِ نیکی نہ کر لینے کے فن سے واقف ہو۔ اس لئے۔ جب تک ہم عوام کے معتدبہ حلقے کی ذہنی اخلاقی اور سیاسی تربیت نہ کریں۔ اور جب تک عوام کا تربیت یافتہ عنصر۔ صحیح لیڈر کی پہچان سے بہرہ ور نہ ہو۔ اور خود غرض رہنماؤں کو قیادت کی کڑی سے علیحدہ کرنے کا شعور نہ رکھتا ہو۔ اس وقت تک۔ ہم صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے گو کھلے کا ذکر بھی کیا ہے۔ کاش اس ملک میں اس عظیم الشان لیڈر کے پائیے کے دو چار انسان اور سوتے .... ہندوستان میں ہر چیز کی افراط ہے۔ خدا نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ لیکن انسان نے۔ اس خطہ ارضی کی نیک نیتی سے خدمت نہیں کی۔ اب بھی اگر انسان ہندوستان کی بے لوث خدمت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو بہا بہا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے“

۱۔ سول ملٹری گزٹ۔ مورثہ مہاراجہ ۱۹۳۶ء

۲ مارچ کو باشندگانِ لاہور نے مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے اور ان کی مصالحت کو کوششوں پر اظہارِ مسرت کرنے کیلئے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ جس کے مددِ لاہور کے بپتھے۔ اس اجتماع کو دیکھ کر جس میں ہندو اسکھ اور مسیحی بڑھ چڑھ کر مسٹر جناح کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ کہ مسٹر جناح کس غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی حالت میں کہ شہید گنج کے حادثہ فاجعہ کی وجہ سے۔ فرقہ دارانہ کشیدگی زوروں پر تھی۔ اور دلوں پر کدورت کی تہہ جھی ہوئی تھی۔ سکھوں کا مسٹر جناح کی سرگد ہتائش میں رطب اللسان ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔۔۔ مقررین میں سر وارسیمپورن سنگھ۔ سر واراہیل سنگھ۔ پنڈت نانک چند اور مسٹر کے۔ ایل۔ رلیارام شامل تھے۔

پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ "افسوس ہے۔ کہ مسٹر جناح کانگریس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ کانگریس میں رہتے تو ملک کی حالت یقیناً آج سے کہیں بہتر ہوتی"۔ جواب میں مسٹر جناح نے تشریح کی۔

تو پنڈت نانک چند کے ان الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"..... جب میں پہلی مرتبہ کانگریس میں شامل ہوا تھا۔ اس وقت سے کہ اب تک میرے خیال میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے گانگاہے۔ مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں

کہ میں نے جو کچھ کیا، اُس میں فرقہ پرستی کی روح کارفرما نہ تھی۔  
میرے پیش نظر صرف مادرِ وطن کی بہتری اور فلاح و بہبود تھی  
یقین جانیے کہ آئندہ بھی سندھ دستان ہی کی خدمت میرا مقصد و مقصود  
رہے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت - مجھ کو اس معین اور واضح راستے

سے - ایک اپنی اور دوسری نہیں بنا سکتی؛ لہ

مسٹر جناح، راج کو واپس دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی سے پہلے انہوں  
نے مشہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے - ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ جس کے ارکان  
مندجہ ذیل اصحاب تھے۔

علامہ اقبال - مولوی عبدالقادر قصوری - میاں عبدالعزیز بیرسٹر

اسٹ لار - راجہ نربندر ناتھ - پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لار۔

سردار گوباسنگھ ایڈوکیٹ - سردار اعلیٰ سنگھ - سردار سمپورن سنگھ

میاں احمد یار خاں دوکانہ (کنوینر)

رخصت ہوتے وقت - مسٹر جناح نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

۱۹۴۶ء میں ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو دیال سنگھ کالج اور فائن ہال کی تقریروں کے متناس یہاں

درج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۶ء کے اجال میں مسٹر جناح کے سیاسی خیالات و عزائم کیا تھے

اور وہ اپنے ملک کی خدمت کن خطوط پر کرنا چاہتے تھے صرف ڈیڑھ سال کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء کے وسط میں کانگریس

کی غلط اور تباہ کن پالیسی نے اس کو پہلے شخصیت کو جس قدر مایوس کر دیا کہ اُسے بہرہ اپنی قوم کے حقدار و نفا

کے لئے نئی راہ تلاش کرنا پڑی۔

اور فرقہ وارانہ مصالحت پر زور دیتے ہوئے۔ یہ بھی فرمایا کہ

”..... یہ جھگڑا دو افراد میں نہیں۔ بلکہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ہے۔ اس لئے دونوں فرقوں کی آراء کی جانچ تول کر لے کے لئے وقت درکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دوران میں ہمیں اپنی مصالحتانہ کوششوں کو بدستور جاری رکھنا چاہیے۔ تاکہ باہمی تصفیہ حلدراز حلدراز کے ہیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس عرض کے لئے مختلف فورم کے ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ جس کا نام شہید گنج مصالحتی بورڈ ہو۔ اور اس بورڈ کے ذمے یہ کام ہو۔ کہ وہ اہم و تفہیم سے تصفیہ کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرے۔ میری خدمات اس بورڈ کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر آئندہ میرا یہاں آنا ضروری ہو۔ تو میں سو کام چھوڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا۔“

مسٹر جناح کی کوشش سے پنجاب میں صلح و آشتی کی جو دفنا پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر اطمینان کرتے ہوئے۔ لاہور کے اینگلو انڈین اخبار سول بلٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر کو سبھی یہ لکھنا پڑا کہ پنجاب کے مقامی مسلمان لیڈروں کی ناکامی اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انہیں ”سہ کار پرستی“ کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ انہیں ہمیشہ ”بائیں بازو“ (لفٹسٹ) کا لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے ”بائیں بازو“ کے سیاسی حقائق ہی کی وجہ سے بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے ان کی بات کو سننا اور

ماننا منظور کر لیا ہے اسے

سول نا فرمائی ہی کے زمانے میں۔ شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے اہتمام سے۔ لاہور کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر سیل کی عدالت میں۔ دعوائے دائر کر دیا گیا تھا۔ پناے دعوائے یہ تھی۔ کہ چونکہ شرع اسلام کی رُوسے مسجد ہمیشہ مسجد بنتی ہے اور کوئی شخص اُس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کر سکتا۔ لہذا مسلمانوں کو مسجد شہید گنج میں نماز پڑھنے کی اجازت دیکھائے ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم اس دعوائے کی پیروی کر رہے تھے۔

مسٹر جج کے قائم کئے ہوئے مصالحتی بورڈ کے اردو ایک جلسے تو ضرور ہوئے۔ لیکن چونکہ عدالت میں دعوائے چل رہا تھا اور لوگ بڑے شوق سے اُس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لئے بورڈ بھی۔ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی ختم ہو گیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو۔ مسٹر سیل نے مسلمانوں کا دعوائے خارج کر دیا۔ اور مسجد شہید گنج پر سکھوں کا قبضہ مخالفانہ تسلیم کرتے ہوئے۔ فیصلہ کیا۔ کہ عام جائداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی۔ فریقِ ثانی کے مخالفانہ قبضے میں جا کر۔ اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

علامہ اقبال کے منورے سے۔ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ لیکن اپیل کی سماعت سے قبل ہی اکتوبر ۱۹۳۶ء میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ چونکہ شہید گنج کا مسئلہ اب پورے ہندوستان

لہ سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء

کے مسلمانوں کے لئے۔ بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں بھی۔ شہید گنج کے متعلق ایک نہایت جامع قرارداد منظور کی گئی اور مسٹر جناح نے۔ یہاں تک فرمایا۔ کہ اگر مستقبل قریب میں۔ شہید گنج کا کوئی حسب خواہش فیصلہ نہ ہو۔ تو اس قفیئے کا حل تلاش کرنے کے لئے۔ مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا جائے گا۔

۳۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو۔ لاہور کی عدالت عالیہ کے فل پنچ کے سامنے جس میں چیف جسٹس نیگ۔ جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد شامل تھے۔ شہید گنج کی اپیل پیش ہوئی۔ اور کئی روز تک بحث جاری رہی۔ ۸۰ اور ستمبر ۱۹۳۷ء کو چیف جسٹس نے کہا۔ کہ بحث کے دوران میں۔ چند نئے تینقح طلباء مور سامنے آئے ہیں۔ جن پر عدالت عالیہ فریقین کے مزید دلائل سنتا چاہتی ہے۔  
وہ چند امور یہ تھے:

۱:- اگر یہ تسلیم کر لیا جائے۔ کہ اس دعوے پر قانون میعاد کا اطلاق ہوتا ہے تو کیا اس تاریخ سے۔ جب مسجد شہید گنج مسما کی گئی تھی۔ نئی میعاد کا آغاز ہونا چاہیے؟

۲:- اگر محولہ بالاشق تسلیم کی جائے۔ تو کیا مسجد۔ یا مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو یہ حق ہے کہ وہ مدعا علیہم کے نام عدالت سے۔ اس نوزع کے حکم اتناعی کے اجراء کی درخواست کریں۔ کہ مدعا علیہم مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں  
۳:- اگر ایسا حق موجود ہے۔ تو کیا عدالت اس نوزع کا حکم اتناعی جاری کرنے کی مجاز ہے؟

۴: کیا عدالت اس نوع کا حکم اتناعی جاری کرے گی اور کیا اس حکم اتناعی پر عملدرآمد ہو سکتا ہے؟ -

ملک برکت علی نے ۲۰ ستمبر پیشی کے لئے کچھ مہلت طلب کی تاکہ بیرون پنجاب سے کسی اچھے قانون دان کی مدد حاصل کی جاسکے۔ چیف جسٹس نے ملک صاحب سے کہا: ”آپ نے اب تک نہایت فاضلانہ بحث کی ہے۔ تاہم اگر آپ کوئی اور ذکیل بلانا چاہتے ہیں۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

اب سوال یہ تھا۔ کہ باہر سے کس کو بلایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ مسٹر خلیج کو تکلیف دی جائے۔ کہ وہ لاہور تشریف لاکر بحث کریں۔ چنانچہ ان کے ایم ایسے غلام رسول خاں نے ۱۹ دسمبر کو ذیل کا خط مسٹر خلیج کو لکھا۔

”ڈیئر مسٹر خلیج! شہید گنج کی اپیل۔ اب ایک نہایت اہم منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ہائی کورٹ کے سامنے۔ بحث مکمل ہو چکی ہے۔ عدالت عالیہ نے۔ بحث سننے کے بعد۔ چند نئے تنقیح طلب امور مرتب کئے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا مسجد کے اتہام سے۔ از سر نو مبادی شروع ہوتی ہے۔ اور کیا حکم اتناعی کے اجراء کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اور کیا۔ ایسے حکم اتناعی کا اجراء ہو جانا چاہیے۔“

لاہور کے مسلمانوں کی خواہش ہے۔ کہ اب کہ امید کی ایک کرن چھوٹی نظر آئی ہے۔ آپ خود یہاں تشریف لائیں۔ تاکہ اس عمارت کی آخری اینٹ۔ آپ کے مضبوط ہاتھوں سے رکھی جائے۔ ہماری اور مسلمانان لاہور کی طرف سے۔ ملک برکت علی آپ سے

ملنے کے لئے بمبئی حاضروں کو گئے۔ اور تفصیل سے زبانی سب کچھ عرض کریں گے۔

آپ پہلے بھی۔ اُس وقت لاہور تشریف لائے تھے۔ جب تحریک شہید گنج ایک نہایت نازک مرحلے میں سے گذر رہی تھی۔ اور آپ ہی کی کوشش سے وہ مرحلہ۔ بخیر خوبی طے ہو گیا تھا۔ اب شہید گنج کی بازیابی کا دعوے بھی۔ ایک بہت نازک مرحلے پر پہنچ گیا ہے یقین کیجئے کہ آپ کے یہاں تشریف لائے۔ اور نئے امور پر عدالتِ عالیہ کے روبرو بھت کرنے سے۔ صرف پنجاب نہیں۔ بلکہ پورے سندھ و دکن کے مسلمان آپ کے احسان مند ہوں گے۔ جو تاریخ آپ پسند فرمائیں گے۔ عدالتِ کورہ تاریخ مقرر کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے عدالتِ عالیہ سے یہ درخواست کی تھی۔ کہ مزید بحث کے لئے۔ بیرون پنجاب سے کسی قانون دان کو بلانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو آئریل چیف جسٹس نے بخوشی اس امر کی اجازت عطا کر دی تھی۔

میں یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ آپ کی تشریف آوری سے۔ ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک میں نئی جان پڑ جائے گی۔ اس لئے مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ میری اس نیاز مندانه گزارش پر توجہ فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول



میں یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ابتداً میں جب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد کا دعویٰ دائر کیا گیا تھا۔ تو ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم پیروی کہتے تھے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر محمد عالم نے تو مجلس اتحاد اہل بیت کے ٹکٹ اور مسجد شہید گنج کے نام پر اپنی الیکشن بھی جیت لی تھی۔ لیکن جب وہ اسمبلی کے اعلان میں داخل ہوئے۔ تو تمام دعوے و عید فراموش کر کے کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اُن کے اس فعل سے مسلمان سخت برا فروخت ہوئے۔ چنانچہ جب مسجد کی اپیل ہائی کورٹ میں پہنچی تو مدعیوں نے ڈاکٹر عالم سے مختار نامہ دلایا۔ اور اب تنہا ملک برکت علی پیش ہو رہے تھے۔

کہ سمس کی تعطیل شروع ہوئی۔ تو ملک برکت علی بمبئی روانہ ہوئے تاکہ مسٹر جناح سے مل کر زبانی گفتگو کریں۔ اُن کے ارشاد کی تعمیل میں راجم التحریر بھی اُن کے ہمراہ بمبئی گیا۔ مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اس سے قبل زوری ۱۹۳۶ء میں ایک ثالث بائینرین کر لا ہو گئے تھے۔ تاکہ سکھوں اور مسلمانوں میں مصالحت کرا سکیں۔ اُن کی اسی حیثیت کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں نے بھی بڑی گرم جوشی سے اُن کا تیر مقدم کیا تھا اب اسی جھگڑے میں ایک فریق کا ذکیل بن کر لا ہو جانا۔ اُن کے لئے مناسب نہیں۔

اس کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر ایف۔ جے۔ گولڈ مین کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ تو بہتر ہوگا۔ مسٹر

کولٹ میں تعطیل کی وجہ یا تھرآن گئے ہوئے تھے۔ جو بمبئی سے پچاس ساڑھ میل کے فاصلے پر۔ ایک خوش گوار اور صحت افزا مقام ہے۔ اس لئے یہیں ان کے انتظار میں۔ چند روز ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ بمبئی آئے تو ہم نے ان سے معاملہ طے کیا۔ اور واپس لاہور آگئے۔

۱۰۔ ارمبوری ستمبر ۱۹۳۸ء کو شہید گنج کی اپیل پر۔ عدالتِ عالیہ میں فریڈ بجٹا ہوئی۔ اور مسٹر کولٹ بین پیش ہوئے۔ ۲۶ جنوری کو عدالتِ عالیہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اور اپیل خارج کر دی۔ چیف جسٹس بینگ اور جسٹس بھڈرے نے متفقہ فیصلہ کیا۔ کہ جہاں تک قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے۔ مسجد کو عام جائداد غیر منقولہ سے الگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے مسلمانوں کا شہید گنج میں نماز پڑھنے کا حق مدتِ سہولتی ساقط ہو چکا ہے۔ جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اپنا فیصلہ الگ لکھا۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد۔ لاہور کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل گیا اور جلوس پر جلوس نکلنے لگے۔ سرسکندر کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھر سول نا فرمائی شروع نہ ہو جائے۔ ان میں خود اتنی جرات نہیں تھی۔ کہ وہ مسلمانوں کے لیڈر بن کر سامنے آتے۔ اور براہِ راست اپنی قوم سے خطاب کرتے۔ انہوں نے کوشش کی۔ کہ کسی طرح علامہ اقبال سے۔ ایک اختیاری بیان دلایا جائے۔ کہ ابھی پرلومی کونسل کا مرحلہ باقی ہے۔ اسلئے مسلمانوں کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

اس غرض کے لئے۔ انہوں نے نواب ممدوٹ۔ نواب مظفر خاں اور

رغالباً) میاں امیر الدین کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا، کہ تینوں اصحاب کہہ سکر، اس قسم کا اخباری بیان جاری کرائیں۔ نواب ممدوٹ اور میاں امیر الدین ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہلے پہنچ گئے۔ ابھی وہ کھل کر اپنا تداو مقصد و زبان پر نہیں لائے تھے۔ صرف ہمتید باندھ رہے تھے کہ نواب منظر خاں کی موٹر کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں دیکھ کر فوراً اٹھے اور اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔

جہاں تک امیر حافظہ کام کرتا ہے اس وقت سید تذیر نیازی بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اندر جا کر عرض کیا۔ کہ دو تین اصحاب باہر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب منظر خاں کا نام لے کر فرمایا، کہ یہ شخص بس سال کے بعد آج میرے مکان پر آیا ہے۔ مسجد اس نے خود گروائی ہے اور اب بیان دلوانا چاہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ کہ "جب تک یہ شخص بیٹھا ہے میں باہر نہیں جاؤں گا"

سید تذیر نیازی نے باہر آ کر۔ چپکے سے نواب ممدوٹ کے کان میں یہ بات کہی۔ اس کے بعد یہ تینوں اصحاب رخصت ہو گئے۔ اور سر سکندر کی یہ تجویز۔ کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے مسلمانوں کا اضطراب زوع کرنیکی صورت پیدا کی جائے بروئے کار نہ آسکی۔

۳۰ جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ تاکہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے جو تشویشناک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر غور کیا جائے۔ چودہری خلیق الزماں اور راجہ محمود آباد کی رائے تھی۔ کہ سر سکندر

کی وزارت کو بطور احتجاج مستعفی ہو جانا چاہیے۔ لیکن میاں احمد یار خاں دو دن تا نہ امد  
 نواب زادہ لیاقت علی خاں نے، اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ استغنیہ  
 سے "ڈیڈ لاک" پیدا نہیں ہوگا۔ بلکہ پنجاب اسمبلی کے دوسرے عناصر مل کر، متبادل  
 وزارت بتالیں گے۔ تاہم لیگ کونسل نے اس بات کا اعلان کیا۔ کہ مسجد شہید  
 گنج کی بازیابی، سندھ و نٹان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔ اس لئے آل  
 انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس خصوصی عنقریب اس مسئلہ کا تصویب کرنے اور  
 آئندہ کے طرز عمل پر غور کرنے کے لئے، منعقد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی  
 فیصلہ ہوا۔ کہ یکم فروری کو سندھ و نٹان بھر میں "یوم شہید گنج" منایا جائے۔ اور  
 مسلمان جگہ جگہ جلسے کر کے مسلم لیگ کی اس قرار داد کی تائید کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے۔ اس بارے میں، کسی قدر مختلف تھی۔ ان کا خیال  
 تھا، کہ یہ قانون جس کی رو سے، خانہ خدا کی تقدیس منقطع ہوتی ہے اور مسجد بھی  
 قبضہ مخالفانہ میں جا کر، بارہ سال کے بعد اپنی حریت کو سمیٹتی ہے، بالکل غلط  
 ہے۔ اس قانون کو ختم کرنا چاہیے، چنانچہ انہوں نے، ملک بھر کی سلی سے کہا کہ  
 وہ پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کریں، تاکہ مساجد کی حفاظت اور  
 حیانت کا کلی بندوبست ہو سکے۔

ملک صاحب نے، ڈاکٹر صاحب کی ہدایت اور مشورے سے، ذیل کا مسودہ  
 قانون مرتب کر کے، اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔

"ہر گاہ کہ اس قسم کے شکوک و شبہات  
 پیدا ہوتے ہیں کہ جن مساجد کو۔  
**تَحْفِظِ مَسَاجِدِ كَابِلِ :-**

شرعِ محمدیؐ کے تحت باضابطہ وقت قرار دیا جا چکا ہے۔ ان پر شرعِ مذکور کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اس ضمن میں، دعوے کیا گیا ہے۔ کہ بارہ سال کے قبضہ مخالفانہ کے بعد مساجد بھی اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ اور ہر گاہ کہ یہ ضروری ہے۔ کہ اس نوع کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔ اور قانون کی وضاحت کی جائے۔ لہذا اس تحریر کے ذریعے سے۔ مندرجہ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے

(۱) اس ایکٹ کا نام تحفظِ مساجدِ اسلامی پنجاب ایکٹ ۱۹۳۸ء ہوگا۔

(۲) : یہ ایکٹ صوبہ پنجاب میں فوراً نافذ کیا جائے گا۔ اور اس کا اثر راجع بہ ماضی ہوگا۔ جو تمام قسم کے مقدمات پر حادی ہوگا۔ مثلاً عادی اپیلیں یا دوسری جملہ کارروائیاں۔ خواہ ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یا سنوز ذمیر تحقیقات ہیں۔

ب: اگر اس ایکٹ کے وضع ہونے سے پہلے کسی مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور وہ فیصلہ اس ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو اس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ اور وہ فیصلہ اس ایکٹ کی دفعات کو کسی طرح بھی ساقط یا کمزور نہیں کر سکے گا۔

(۳) قطع نظر اس سے۔ کہ پنجاب کے کسی موجودہ راج الوقت قانون یا ایکٹ میں کوئی بات اس امر کے خلاف درج ہے۔ ایک اسلامی مسجد جسے

↓ PUNJAB MUSLIM MOSQUES PROTECTION ACT 1938

↓ RETROSPECTIVE

شرعِ محمدی کے تحت، باقاعدہ وقف قرار دیا جا چکا ہے۔ اپنی حیثیت برقرار رکھے گی۔ خواد اُس کا منتزعی، محافظ یا قابض کوئی شخص کیوں نہ ہو۔ اور اُس شخص مذکور کا قبضہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لئے اس مسجد پر، ہر حالت میں، صرف شرعِ محمدی کا اطلاق ہوگا۔ بلا لحاظ اس سے، کہ ایسی عدالتی کارروائی ہیں۔ جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے۔

تشریح :- ایک اسلامی مسجد جسے شرعِ محمدی کے تحت وقف قرار دیا جائے، عام انسانی ضروریات کے استعمال سے الگ کر دی جاتی ہے۔ اور اُس سے ہرگز اور کلمتہ۔ خدائے ذوالجلال کی عبادت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ اُس پر لفظ جائداد۔ اُن معنیوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ جن معنوں میں یہ لفظ قانونِ میعادِ سندیا پنجاب کے کسی موجودہ راجع الوقت قانون میں مستعمل ہے۔ بجز اس کے کہ۔

۱: حق شفع کی رُو سے قانونِ راجع الوقت کے تحت جائداد حاصل کی جائے۔

اد

ب: قانونِ فوجداری کی غرض کے لئے، جس میں تعزیراتِ سندیا درج ہے، فوجداری۔ دونوں شامل ہیں۔

## اعراض و اسباب

اپریل اول۔ نمبر ۲۲۲ سال ۱۹۳۶ء۔ بعنوان "مسجد شہید گنج و دیگر بنام"

شرعی گوردوارہ پر بندھاگ کیٹی وغیرہ۔ منفصلہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء میں۔  
 لاہور ہائی کورٹ کے فل پنچ کی اکثریت نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ اگرچہ شرع محمدی کے  
 تحت۔ ایک مسجد، جسے خانہ خدا کے طور پر وقف کیا جا چکا ہے، ہمیشہ مسجد ہی رہتی  
 ہے۔ اور اپنی حرمت و تقدس تا قیامت برقرار رکھتی ہے۔ خواہ اس مسجد کا متولی  
 کوئی شخص کیوں نہ ہو۔ اور اس کا قبضہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ لیکن ازلیکہ  
 قانون میعاد سہدہ شمول پنجاب لازماً ایکٹ نے۔ شرع محمدی کے اس حق کے  
 ترمیم و تبدیل کر دیا ہے۔ لہذا برٹش انڈین قانون، بحالت موجودہ کے تحت  
 ایک مسجد بھی۔ یا رہ سال کے قبضہ مخالفانہ کے بعد۔ اپنی مقدس حیثیت کھو  
 بیٹھتی ہے۔ اور عام دنیاوی جائداد کی مانند۔ اس شخص کی ملکیت بن جاتی  
 ہے۔ جو بارہ سال سے اس پر قابض چلا آ رہا ہے۔ اور وہ شخص۔ اس مسجد  
 کو۔ ہر غرض کے لئے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ خواہ وہ غرض انتہائی درجہ  
 ناپاک کیوں نہ ہو۔

اگرچہ آئرلینڈ سٹریٹس وین مجھ نے۔ اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔  
 اور اپنے فیصلے میں لکھا ہے۔ کہ قانون میعاد سہدہ۔ یا پنجاب لازماً ایکٹ نے۔  
 اس ضمن میں۔ شرع محمدی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور بدیں وجہ۔ جب مسجد  
 کو۔ عام دنیاوی اغراض سے الگ کر کے۔ محض ضائع و اہد کی عبادت کے  
 لئے۔ وقف کر دیا جاتا ہے۔ تو قانون رائج الوقت کے تحت بھی۔ اس کی حرمت  
 و تقدس ابدالاً بادتک قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود۔ یہ ضروری  
 خیال کیا گیا ہے۔ کہ قانون کو واضح اور مستحکم بنانے کی غرض سے۔ مجلس قانون

ساز۔ ایک ایسا توضیحی اعلان کرے۔ جس میں اس امر کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالکل صاف کر دیا جائے۔ کہ جب مسجد کو شرع محمدی کے تحت۔ باقاعدہ وقف قرار دیا جاتا ہے۔ تو وہ مسجد۔ شرع مذکور کے مطابق۔ اپنی مقدس حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لئے، اس مسجد پر ہر حالت میں، صرف شرع محمدی کا اطلاق ہونا چاہیے۔ بلا لحاظ اس کے۔ کہ ایسی عدالتی کارروائی میں، جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے، تریقین کی نوعیت کیا ہے۔ مزید برآں۔ اس امر کو بالکل واضح کر دینا چاہیے۔ کہ مسجد میں عام معنوں میں لفظ جائداد استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں۔ لفظ جائداد کہیں مستعمل ہوا ہے۔ تو مسجد پر وہ لفظ مستعمل نہیں ہوگا۔ ماسوا اس کے کہ۔

۱۔ حق شفع کی رو سے۔ قانون رائج الوقت کے تحت۔ جائداد حاصل کی جائے۔ اور

ب۔ قانون فوجداری کی غرض کے لئے۔ جس میں تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری دونوں شامل ہیں۔ تاکہ مسجد کی حرمت و تقدس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔

اس مسودہ قانون کو راجح بہ ماضی قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ اس وسیع اور ذرا ذریعہ اور حق بجانب اضطراب کو رفع کیا جائے۔ جو مسجد شہید گنج کے انہدام سے ہے کہ اب تک۔ بڑی شدت سے جاری ہے۔ اور جسے اگر دانش مندانہ تدبیر۔ اور مجلس قانون ساز کے دلیرانہ اقدام سے۔ اس وقت رفع نہ کیا گیا۔ تو نہ صرف



اس صوبے - بلکہ پورے ہندوستان کے امن و امان کو - شدید صدمہ پہنچنے کا  
احتمال ہے - اور اندیشہ ہے - کہ اس طرح ۱۰ عظیم کار - پوری مملکت ایک خطرناک  
اور غیر مختتم خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جائے گی - جب اس نوع کی صورت  
حال درپیش ہو - تو مجلس قانون ساز پر نرض عائد ہوتا ہے - کہ وہ آگے بڑھے -  
اور ایک ایسا قانون وضع کرے - ملک کے امن و امان کو محفوظ کرے - جس  
کی رو سے - ملک مستحکم کی مسلمان رعایا کو - واضح ترین الفاظ میں بطن کیا جا  
سکے - کہ اس ضمن میں - اس کے مذہبی عقائد و شعائر کی مکمل حفاظت کی گئی  
ہے - اور یہ کہ ۱۸۵۷ء میں - ملکہ و کٹوریہ آں جہانی نے - اسی موضوع پر -  
جن واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں - اپنی مسلمان رعایا کو یقین دلایا تھا - اور  
جن الفاظ کا اعادہ - ملکہ آں جہانی کے جانشین - تخت شاہی سے بار بار کرتے  
سے ہیں - اُن کو عملی جامہ پہنانے میں - کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا -  
فروری کے اٹائل میں یہ بل مرتب کر لیا گیا تھا - جس کا پورا خاکہ علامہ  
اقبال نے تجویز کیا تھا - لیکن عبارت ملک برکت علی کی تھی - یونیٹ پارٹی  
کے صدر دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی - کہ اس نوع کا بل ملک برکت علی تیار  
کر رہے ہیں - انہی دنوں - ایک روز ملک صاحب نے بل کا ٹائپ کیا ہوا -  
انگریزی مترجمہ ٹھہرے دیا - کہ اُس کا اردو میں ترجمہ کروں - ملک صاحب کا  
مکان - اور پنجاب مسلم لیگ کا دفتر - یعنی غلام رسول خاں کارخانہ بالکل

۱۔ اصل مسودہ قانون انگریزی میں تھا -

آٹنے سامنے تھے۔ اس لئے جب میں شام کو دفتر کا کام ختم کر کے اُٹھا تو میں نے انگریزی مسودہ اور اُس کا ترجمہ دونوں ملک صاحب کے دفتر میں جا کر اُن کی میز پر رکھ دیئے۔ خود ملک صاحب اُس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

رات کو آٹھ نو بجے کے قریب ملک صاحب کا ملازم میرے مکان پر آیا کہ ترجمہ دے دیجئے۔ میں نے کہا کہ انگریزی مسودہ اور ترجمہ دونوں ملک صاحب کے دفتر کی میز پر رکھے آیا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ ملک صاحب نے ترجمہ کے لئے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں نے ٹیلیفون پر بات کی۔ تو ملک صاحب نے جواب دیا کہ اُن کی میز پر کوئی کاغذ نہیں ہے۔ اسی وقت اُن کے ہاں پہنچا۔ اور میز کے علاوہ دفتر کا ایک ایک کونہ تلاش کر مارا۔ لیکن انگریزی مسودہ اور ترجمہ دونوں غائب تھے۔ سخت حیرت ہوئی کہ دو ڈھائی گھنٹے کے عرصہ میں یہ چیز کہاں غائب ہو گئی۔ غنیمت ہے کہ ملک صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ موجود تھا۔ اس لئے دوبارہ ٹائپ کرنے اور ترجمہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔

چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ اصل ٹائپ کیا ہوا مسودہ اور میرا ترجمہ دونوں یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں پہنچ چکے ہیں۔ پیراز اب تک نہیں کھل سکا کہ وہ کون پر اسرار شخص تھا۔ جس نے دو گھنٹے کے اندر ملک صاحب کے دفتر کی میز پر سے کاغذ اڑا کر یونینسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں ملک

برکت علی۔ غلام رسول خاں اور علامہ اقبال کے مکالموں کے اردگرد یونینٹ پارٹی کے بعض گمانتے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کا دولت کردہ تو مرجع خاص و عام تھا۔ اور وہاں کی فضا ہی ایسی تھی۔ کہ کوئی بات۔ ڈھکے چھپے انداز میں۔ نہیں ہو سکتی تھی۔ جو سچ کہا جاتا۔ بیچ کھیت اور کھلے بندوں کہا جاتا تھا۔ لیکن ملک برکت علی۔ اور غلام رسول خاں کے ہاں بھی۔ کسی قسم کی احتیاط نہیں برتی جاتی تھی۔ ہر قسم کے لوگ آتے۔ اور ہر نوع کی گفتگو ہوتی تھی۔

ملک صاحب نے۔ پنجاب اسمبلی میں تحفظ مساجد کا بل پیش کرنے کا ٹوٹس دے دیا۔ خانہ خدا کی بے حرمتی ایسی چیز تھی۔ جس پر کوئی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یونینٹ پارٹی کے بہت سے مسلمان ممبر۔ اس بل کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ سر سکندر ایک منحصر بیگم فرما تھے۔ اگر بل ایوان میں پیش ہوا۔ اور انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ تو خود انکی پارٹی کے مسلمان ممبر ان سے کٹ جائیں گے۔ اور اگر انہوں نے بل کی تائید و حمایت کی۔ تو وزارتی پارٹی کے غیر مسلم ممبروں کے علیحدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں۔ کہ سر سکندر کے کامیاب دور حکومت میں صرف یہی ایک ایسا وقت آیا تھا جب ان کی وزارت ڈالواں ڈول ہوتی نظر آتی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل۔ چونکہ فیصلہ کر چکی تھی۔ کہ مسجد شہید گنج کے قضیے کا حل تلاش کرنے کے لئے مسلم لیگ کا ایک اجلاس خصوصی منعقد کیا

جائے گا۔ اس لئے دو مارچ ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے ذیل کا خط علامہ اقبال کو لکھا۔

”ہیٹنگز رنڈ۔“

نئی دہلی۔

ڈیئر مسٹر محمد اقبال !

اطلافا عرض ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ماہِ حال کی ۲۰ تاریخ کو دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اُن اہم امور میں سے جن پر اس اجلاس میں غور کیا جائے گا ایک یہ بھی ہے کہ لیگ کے خاص اجلاس کے لئے مناسب مقام کا فیصلہ کیا جائے۔ اس لئے مجھے یہ معلوم کرنے کی بے حد خواہش ہے کہ آیا آپ یہ پسند کرتے ہیں یا نہیں کہ خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا پراڈنشل مسلم لیگ، خاص اجلاس کے لئے ضروری انتظامات کر سکے گی؟ بصورتِ اثبات۔ آپ مجھے ایک رسمی دعوت نامہ ارسال فرمادیں۔ تاکہ میں اسے کونسل کے سامنے پیش کر سکوں۔ مجھے بنگال سے رسمی دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے۔ اداگر اجلاس دہلی میں منعقد کرنا فیصلہ کیا جائے تو اہل دہلی انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ پنجاب کی صورتحال کے متعلق بھی مفصل اطلاع دیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

”آپ کا مخلص  
ایم۔ اے۔ جناح“

مسٹر جناح کے اس خط کے جواب میں - ڈاکٹر صاحب کے حسب ارشاد تیلی  
کا خط - غلام رسول خاں نے - ۷ مارچ ۱۹۳۵ء کو لکھا -

”ڈیئر مسٹر جناح

مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا خط لکھنے کی ہدایت  
سہنی ہے -

آپ کا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو - ۴ مارچ ۱۹۳۵ء کو ملا۔  
ان کی صحت کی خرابی - ہم سب نیاز مندوں کے لئے - وجہ غمطراب  
بنی ہوئی ہے - اور وہ خود آپ کو خط لکھنے سے معذور ہیں - آپ کے  
خط کے جواب میں - ان کا ارشاد یہ ہے -

کل پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک عام اجلاس - لاہور میں  
منعقد ہوا - جس میں صوبے کے تمام اضلاع کے نمائندے شامل  
ہوئے - اور پراونشل مسلم لیگ کے ارکان کی ایک بڑی تعداد نے  
اس میں حصہ لیا - آپ نے سر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا - وہ اس  
اجلاس میں پڑھا گیا - اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ آل  
انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی - لاہور ہی میں منعقد ہو -  
اور اس کے لئے - ایک رسمی دعوت نامہ بھیج دیا جائے - لہذا  
ہماری درخواست ہے - کہ شہید گنج کے متعلق - لیگ کا اجلاس  
خصوصی ایسٹر کی تعطیلات میں - لاہور میں منعقد کرنے کے لئے  
اس خط ہی کو دعوت نامہ تصور کیا جائے

جہاں تک پنجاب کی صورت حال کا تعلق ہے۔ سر محمد اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

۱:- شہید گنج کے متعلق غالباً پرپوری کونسل میں اپیل کی جائے گی۔ لیکن لوگوں کو۔ اس سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ کسی برطانوی عدالت کی طرف رجوع بے سود ہے۔

۲:- ملک برکت علی نے تحفظ مساجد کے متعلق پنجاب اسمبلی میں جو بل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے۔ مسلمانوں میں اس پر کافی جوش بھپلا ہوا ہے۔ اس وقت تک یونٹس پارٹی کے پچیس ارکان نے۔ سر سکندر کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے۔ کہ وہ اس بل کی تائید کریں گے۔ اور اس بل کو انھوں نے اپنا بل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹرز۔ مناسب قراردادیں منظور کر کے۔ اپنے اپنے نمائندوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس بل کی پوری حمایت کی جائے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ جب یہ بل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہوگا تو قانون کی صورت اختیار کر لے گا۔

۳:- شہید گنج کی سول نافرمانی کی تحریک۔ روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ عوام پر امن ہیں۔ اور بے تابی سے آل

انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے اہم فیصلوں کا انتظار  
 کر رہے ہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً  
 تمام مسلم ادا سے۔ لیگ کی رہنمائی میں سرگرم عمل نظر آئیں گے۔  
 پنجاب پراڈنشل مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے۔ کہ وہ  
 آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے لئے تمام ضروری  
 انتظامات کرنے کی ذمہ دار ہے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول خاں - آنریری سکریٹری

پنجاب پراڈنشل مسلم لیگ

، دہرائے ڈاکٹر محمد اقبال،

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ملک برکت علی کے بل نے۔ پنجاب بھر میں جوش  
 و خروش کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔ اپنے اور بیگانے۔ دونوں بڑے اضطراب  
 سے۔ نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن سرسکندر نے تمام قیاس آرائیوں کا  
 خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے گورنر کو مشورہ دیا۔ کہ بل کو اسمبلی میں پیش کرنے  
 کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ گورنر نے۔ اپنے اختیارات خصوصی کو  
 کام میں لا کر۔ اعلان کر دیا۔ کہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جاسکے گا۔

۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو سرسکندر نے۔ پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں۔ اپنے  
 اس نوٹے کی حمایت میں۔ ایک زبردست تقریر کی۔ یونینسٹ پارٹی کے  
 مسلمان ممبر۔ گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر۔ سرسکندر کے ہم نوا بن چکے

تھے۔ یہاں تک کہ۔ ان تمام ممبروں نے۔ اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ لکھ کر۔ سر سکندر کے حوالے کر دیئے تھے۔ میں نے سر سکندر حیات کو۔ مختلف جلسوں میں بولتے ہوئے سنا تھا۔ وہ اُردو اور انگریزی۔ دونوں زبانوں میں۔ بڑی سلجھی ہوئی تقریر کرتے تھے۔ لیکن جس اعتماد و ثوق اور یقین سے۔ وہ ۱۶ مارچ کو۔ اسمبلی کے ایوان میں تقریر کر رہے تھے۔ یہ رنگ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکیلا اسی مسلمان ممبروں کے استعفیٰ اُن کی جیب میں تھے۔ دونوں مسلمان ذریعہ۔ یعنی میاں عبدالرحمن اور ملک خضر حیات ٹوانہ۔ اُن کے دست و بازو تھے۔ اور قطع نظر سیاسی عقائد کے۔ تمام ہندو اور سکھ ممبران کی پشت پر تھے۔ اس لئے اگر آج بھی اُن کی تقریر میں اعتماد اور وثوق پیدا نہ ہوتا۔ تو کچھ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

سر سکندر نے اپنی تقریر میں۔ ملک برکت علی کے پل پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا۔ کہ اگر آج مسلمان اسمبلی میں خاص قانون بنا کر شہید گنج پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو کل کو ہندو بھی یہ مطالبہ کریں گے۔ کہ جن مندروں پر مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں قبضہ کر لیا تھا وہ اُن سے واپس لے کر۔ ہندوؤں کے حوالے کئے جائیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہندوستان کے گیارہ میں سے۔ سات صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اگر پنجاب کے مسلمانوں نے۔ اپنے صوبے کی اقلیت سے اچھا سلوک نہ کیا۔ تو سات صوبوں میں مسلمانوں کی حالت سخت خراب ہو جائے گی۔ تیسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ صوبے کی سب سے بڑی



عدالت جو فیصلہ کر چکی ہے۔ اس فیصلے کو مجلس قانون ساز کے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔

سر سکندر نے اپنی تقریر کے دوران میں کئی دفع ملک برکت علی کی طرف دیکھ کر کہا: "اگر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی اکثریت کو میرے اس طرز عمل سے اختلاف ہے۔ تو میں اور میرے دونوں مسلمان وزیر ابھی مستعفی ہو جانے کو تیار رہیں..... میں اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے اور میرے دونوں مسلمان وزیروں کے مستعفی ہو جانے سے۔ شہید گنج مسلمانوں کو واپس مل سکتی ہے۔ تو ہم ابھی استعفا دینے کو تیار رہیں۔"

ملک برکت علی سب کچھ سن رہے تھے۔ اور بار بار یونینٹ پارٹی کے ان مسلمان ممبروں کی طرف دیکھتے تھے جنہوں نے ابھی چند روز پہلے اخبارات میں اعلان کیا تھا کہ وہ تحفظ مساجد بل کی حمایت میں جانیں لٹا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک برکت علی چاروں طرف سے نمرغہ اعدا میں گھر گئے تھے۔ ہاتھا گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سر سکندر کو مبارک باد کے تار بھیجے تھے۔ کانگریسی اور ہما سبھانی سندھو۔ کالی اور غیر کالی سیکھ۔ نیشنٹ اور یونینٹ مسلمان۔ سبھی سر سکندر کی حمایت میں دازیا بلند کر رہے تھے۔

اگلے ہی روز۔ ملک برکت علی نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

انہوں نے سرسکندر کے تینوں اعتراضات پر بحث کی۔ پہلے فرمایا۔ کہ اگر مغلوں نے اپنے دورِ حکومت میں۔ بعض مندروں پر قبضہ کر کے۔ ان کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ تو اول تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُس زمانہ میں۔ قانونِ میعاد یا قبضہ مخالفانہ کی قسم کا کوئی قانون رائج نہیں تھا۔

دوم۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا مغل بادشاہوں نے وہ قبضہ اپنے مشہد شاہانہ اختیارات کے ذریعے کیا تھا یا مندروں سے خود بخود اپنی رضائے اُن عبادت گاہوں کو مغل بادشاہوں کے حوالے کر دیا تھا

سوم۔ جب بادشاہتیں اور حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ تو کوئی حکومت اپنے پیش رو حکومت کے اعمال و افعال کا محاسبہ نہیں کیا کرتی۔ ہر حکومت یہ دیکھتی ہے کہ اُن املاک کا حق محفوظ ہونا چاہیے۔ جو اُس حکومت کے آغاز میں موجود تھیں۔ اسی طرح آج ہندوستان کی برطانوی عدالتوں کو اس سے قطعاً کوئی غرض نہیں۔ کہ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں نسلوں فلاں املاک کی کیا حیثیت تھی۔ ان عدالتوں کو صرف اس بات سے غرض ہے کہ وہ دیکھیں۔ کہ برطانوی حکومت کے قیام کے وقت کس صورت حال تھی۔

ظاہر ہے۔ کہ مسجد شہید گنج جولائی ۱۹۴۵ء تک بحیثیت ایک مسجد کے موجود تھی۔ سیکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں بھی بہت سی مسجدوں کو

مسما کر دیا تھا۔ میں نے جو بل پیش کیا ہے۔ اُس کا تعلق ان مسما شدہ مساجد کے ساتھ بالکل نہیں۔ ہاں وہ تمام مسجدیں جن کا انہدام برطانوی حکومت کے زمانے میں ہوا۔ یا جو قانون میعادِ سند کی رو سے مسلمانوں کے ماتحت سے نکل کر۔ اعیانہ کے قبضے میں چلی گئیں۔ یقیناً میرے بل کے تحت آتی ہیں۔

اگر برطانوی حکومت کے زمانے میں۔ مسلمانوں نے کوئی مندر یا گوردوارا مسما کر دیا تھا۔ یا کسی مندر یا گوردوارہ کو مسجد میں تبدیل کر لیا تھا۔ تو وہ مندر اور گوردوارہ، اسی اصول کے تحت یقیناً سندوں اور دستکچوں کو واپس بل جانا چاہیے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں فخر سے اس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے برطانوی حکومت قائم ہوئی ہے۔ ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ جہاں مسلمانوں نے کسی مندر یا گوردوارے کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کی ہو۔ یا اُس مندر اور گوردوارے کو قبضہ مخالفانہ کے تحت اپنی جائداد میں تبدیل کر لیا ہو۔

بانی رہا یہ اعتراض۔ کہ صوبے کی سب سے بڑی عدالت جو فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ اُس فیصلے کو مجلسِ قانون سانکے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔ سرسکندر حیات کو چاہیے۔ کہ وہ قانون کے اسرار و رموز کا مطالعہ کریں۔ انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ قانون سازی کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ کسی ایکٹ کو راجح بہ ماضی بنا کر

صرف لوگوں کے حقوق و واجبات میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ بلکہ عدالتوں کے فیصلوں پر بھی خبط تہ تیغ کھینچا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی جہاں دستور میں یہ شق درج ہے، کہ کوئی ریاست کسی واقعہ کے بعد اس واقعہ کے متعلق قانون منظور نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ نے ایک اپیل الموسوم بہ "کالڈر بنام بُل" میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایکٹ منظور کر کے عدالت کے فیصلے کو منسوخ کر دے۔ خواہ اس طرح اس فریق کو جس کے حق میں عدالت نے فیصلہ صادر کیا تھا اپنے حق سے محروم کیوں نہ ہو جانا پڑے۔

جہاں تک برطانوی قانون کی تاریخ کا تعلق ہے۔ ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ کہ دار الحکومت نے قانون منظور کر کے عدالتوں کے فیصلوں کو منسوخ کر دیا۔ مثال کے طور پر۔ میں صرف ایک واقعہ الموسوم بہ "کوئین بنام ملر" کا حوالہ دیتا ہوں۔ اس اپیل میں۔ انگلستان کی سب سے بڑی عدالت یعنی دارالامرار نے جو فیصلہ صادر کیا تھا۔ اسے پارلیمنٹ نے ایک خاص ایکٹ کے ذریعہ سے منسوخ کر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا اقدام سراسر غیر معمولی حالات میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا۔ کہ راجع بہ ماضی قانون ہمیشہ اور ہر حال میں غیر منصفانہ ہوتا ہے۔ غلط اور قانون سازی کے رموز سے نادانفہیت کا ثبوت ہے۔ شہید گنج نہاسلہ۔

1. CALDER VS BULL

2. THE QUEEN VS MILLS

یقیناً غیر معمولی نوعیت کا حادثہ ہے۔ اُس کا تصفیہ صحیحی ہو سکے گا۔ کہ مجلس قانون ساز۔ ایک جرات مندانہ اقدام کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کا قضیہ۔ اب آل انڈیا مسلم لیگ کے لئے۔ ایک عقدہ لائیجھل بن کر رہ گیا تھا۔ سر سکندر نے ۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو ثابت کر دیا تھا کہ پلا استئنار، یونینٹ پارٹی کے تمام مسلمان ممبر، اُن کی پشت پر تھے۔ اِدھر گوردوارہ پر بندھک کمیٹی نے۔ ۱۱ مارچ کو۔ اپنے اجلاس امرتسر میں۔ ایک قرارداد منظور کر کے۔ اعلان کر دیا تھا۔ کہ شہید گنج کے مسئلہ پر مسلمانوں سے کسی قسم کی مفاہمت یا مصالحت نہیں ہو سکتی۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ۔ پہلے خلاف صادر ہو چکا تھا۔ اندر میں حالات کامیابی مقصد باری کے تینوں راستے بند ہو جانے کے بعد۔ اب مسلم لیگ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ اس الجھن میں سے نکلنے کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

## خاتمہ

ملک برکت علی نے، جب سے مسجد شہید گنج کے مقدمے کی پیردی شروع کی تھی پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو روز بروز مزورغ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پھر جب انہوں نے تحفظ مساجد کا بل پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ تو پورے صوبے کے مسلمان عوام میں ایک بلچل مچ گئی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبے میں۔ لوگ رضا کا لانا طور پر مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے لگ گئے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر دفتر میں روزانہ بسیوں آدمی آتے تھے۔ بعض اپنے شہر کی مقامی مشائخ کے لئے مشورے طلب کرتے تھے۔ بعض لیگ کی پالیسی اور پراپانڈے کے طور طریق سمجھنا چاہتے تھے۔ اور بعض ہمیں اپنے ضلع کا دورہ کرنے کی دعوت دینے آتے تھے۔

میں پینے لکھ چکا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی مالی حالت سخت خراب ہو جانے کی وجہ سے ہم نے بہت سا کام ترک کر رکھا تھا۔ اب کہ تحریک میں خود بخود

ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ ہم نے محسوس کیا۔ کہ اگر حالات کی مساعدت سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ تو یہ ساری بیماری رہائیگاں جائے گی۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کہ اس کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے۔ جس قدر روپیہ درکار تھا۔ وہ ہمارے پاس نہیں تھا۔

ایک روز ملک برکت علی دفتر میں تشریف لائے۔ غلام رسول خاں۔ ملک زمان ممدی۔ خلیفہ شجاع الدین اور راقم التخریر بھی وہاں موجود تھے۔ ملک صاحب نے ایک ایسی عجیب و غریب خبر سنائی۔ کہ ہم سب حیرت سے اُن کا منہ دیکھنے لگے۔ کہنے لگے۔ کہ "مالی مشکلات نے ہمیں سخت پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے ان پریشانیوں کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ نواب ممدوٹ (نواب شانسواز خاں مرحوم) کو پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر بنا دیا جائے۔

یہ تجویز۔ حقیقت سے اس قدر بعید معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہم نے اس کو مذاق تصور کیا۔ لیکن جب ملک صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ کہ علامہ اقبال بھی اُن کی اس تجویز کو منظور فرما چکے ہیں۔ تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا پڑا۔

میں نے اور غلام رسول خاں نے۔ اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ نواب ممدوٹ یونیٹ پارٹی کے زبردست رکن اور سرسکندر کے خاص الخاص آدمی تھے اُن کا مکان یونیٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر رہ چکا تھا۔ اداہر ۱۹۳۶ء کی الینشن میں اُنہوں نے تصور اور فیروز پور میں۔ خود ملک برکت علی کو ناکام بنانے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک۔ اُن کے رویے میں۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے میں انہیں ملک برکت علی کے ہاں دیکھ

رہا تھا۔ اور اُن کی اس آبرورفت کار از خود میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب ملک صاحب نے یہ تجویز پیش کی۔ تو گویا آنکھوں کے آگے سے پردہ اٹھا۔

زمانِ ہمدی خاں اور خلیفہ شجاع الدین، اس بارے میں، غیر جانبدار تھے لیکن میں اور غلام رسول خاں اپنی بات پر اڑے رہے، کہ نواب صاحب کو کسی صورت میں لیگ کا صدر نہیں بنایا جائے گا۔ ملک برکت علی اپنی بیگانہ روزگار قابلیت کے باوجود، بعض باتوں میں بالکل سادہ لوح و واقح ہونے لگے۔ مثلاً مردم شناسی کا اُنہیں بہت کم بلکہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا، کہ ہماری مخالفت کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتی۔ تو کہنے لگے، کہ "علامہ اقبال کی رہنمائی۔ اور اُن کے گراں قدر مشوروں سے، ہم بدستور مستفید ہوتے رہیں گے۔ نواب صاحب کو تو صرف اس لئے صدر بنایا جا رہا ہے، کہ لیگ کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں۔ یوں بھی نواب صاحب کے خیالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اگر وہ لیگ کے صدر بن گئے۔ تو اُن کی کوشش سے اسمبلی کے بہت سے یونینٹ ممبر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔"

جب اُن کا اصرار بڑھا، اور انہوں نے یہ بھی کہا، کہ وہ نواب صاحب کو یقین دلا چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص اُن کی مخالفت نہیں کرے گا۔ تو ہم نے بادلِ تاخواستہ، یہ تجویز قبول نہ کی۔ لیکن ہمیں رہ رہ کر غیر شعوری طور پر یہ احساس ہو رہا تھا، کہ نواب ممدوٹ کی عداوت یقیناً کسی نہ کسی مہیبت کا پیش خمیہ بننے والی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں، اجلاسِ لکھنؤ کے موقع پر، آل انڈیا مسلم لیگ کا



ایک بنیاد ستور اساسی منظور کیا گیا تھا۔ جس کی رو سے ہر پارلیمنٹری لیگ کے تحت۔ لیگ کی ضلع اور تحصیل وار شاخیں قائم کی جانی ضروری تھیں۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اعلان کیا تھا کہ ہر صوبے کی لیگ کو چاہیے کہ ۳ مارچ ۱۹۳۸ء تک۔ اپنے الحاق کی باضابطہ درخواست۔ مرکزی لیگ کے دفتر میں ارسال کر دے۔ چنانچہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے۔ علامہ اقبال کو ذیل کا گشتی مراسلہ ارسال کیا۔

”آل انڈیا مسلم لیگ

کوچہ بلیارن۔ دہلی

۱۲ فروری ۱۹۳۸ء

جناب مکرم۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے گذشتہ سالانہ اجلاس میں۔ اس امر کا فیصلہ ہوا تھا۔ کہ آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اراکین۔ ادر مندوبین کے تمام انتخابات نئے آئین کی دفعات کے مطابق ہوں اور ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء تک اس کی اطلاع دفتر آل انڈیا مسلم لیگ میں پہنچ جائے۔

کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں۔ مذکورہ بالا مبعود کی توسیع ۳۱ مارچ تک کی گئی تھی۔

میرے خیال میں یہ امر بے حد ضروری ہے کہ یہ تمام انتخابات جس قدر جلد ممکن ہو عمل میں آجائے چاہئیں۔ تاکہ صوبائی لیگیں۔ اس اجلاس خصوصی میں شامل ہو سکیں۔ جو آئین جدید کے مطابق

فی الغد سونے والا ہے۔ اور جس میں مسئلہ شہید گنج کے متعلق آخری طریق عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

لہذا میری تجویز ہے کہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء سے قبل ہی تمام صوبائی لیگیں۔ اپنے الحاق کی درخواستیں ارسال کر دیں۔ جن میں صدر۔ سکریٹری اور تمام عہدیداروں کے نام بھی درج ہوں، نیز کونسل کے منتخب شدہ اراکین کے ناموں کی فہرست ۵ مارچ ۱۹۳۸ء۔ اور مندوبین کی فہرست ۱۳ مارچ تک پہنچ جانی چاہیے۔

میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ کی پراونشل مسلم لیگ اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے۔ الحاق کی درخواست۔ اور تائیدگان کے ناموں کی فہرست مقررہ وقت پر لیگ کے مرکزی دفتر کو چہ بلیماراں دہلی کو بھیج دے گی۔ تاکہ لیگ کے آئندہ اجلاس خصوصی میں جس میں نہایت اہم معاملات پر بحث و تجویز ہوگی آپ کے صوبے کی پوری نمائندگی ہو سکے۔

براہ ہریانہ۔ اپنے صوبے کی منظم شدہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگوں کی فہرستیں مع اسمائے عہدیداران ارسال فرمائیے۔ نیز ان اضلاع کے نام بھی تحریر فرمائیں۔ جن میں ابھی تک لیگ کی شاخیں قائم نہیں ہو سکیں۔ اور اس امر کی اطلاع بھی ہم پہنچائیں۔ کہ ایسے اضلاع میں کب تک شاخیں قائم ہو جانے کا امکان ہے۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جتت  
صدر آل انڈیا مسلم لیگ

ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق . غلام رسول خاں نے . اس خط کا حسب  
ذیل جواب . ۴ فروری ۱۹۳۸ء کو ارسال کیا .

”ڈیئر مسٹر جناب“

آپ کی گشتی چھٹی نمبر ۵۶۶ . مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کے جواب میں  
ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے یہ تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے .

- (۱) مذکورہ بالا گشتی چھٹی میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں . انہیں  
عملی جامہ پہنانے کے لئے . مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں .
- (۲) جہاں تک لیگ کے اجلاس خصوصی کا سوال ہے . معلوم ہوتا  
ہے کہ آپ یہ اجلاس لیگ کے نئے آئین کے مطابق کر رہے ہیں  
مگر آپ کو . اس امر کا پورا احساس ہوگا . کہ اس خاص جلسے  
میں . جو مسئلہ زیر بحث آئے گا . وہ بے حد اہم ہے . اور تمام  
مسلمانان ہند پر بالعموم . اور مسلمانان پنجاب پر بالخصوص  
اثر انداز ہوگا .

یہ امر اس بات کا تقاضی ہے . کہ کھلے اجلاس میں . اہل بصیرت  
مسلمانوں کی بڑی سے بڑی اکثریت اس پر بحث کرے . آل انڈیا  
مسلم لیگ کے آئین کی رُو سے . پنجاب سے ۳۶۰ سے زیادہ  
مسلمان . اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے . اور وہ بھی اس  
صورت میں . کہ یہ تمام ممبر وہاں پہنچ جائیں . یہیں اس  
بات کا علم نہیں . کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے احساسات

بھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کے احساسات کی طرح شدت سے مجروح ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر لیگ سول تاقربانی کا فیصلہ کرے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس فیصلہ کا انحصار اُن ہی لوگوں پر رکھا جائے جن پر اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا بوجھ ڈالا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ آئین جدید کی رُو سے یہ امر ممکن نہیں۔ اسلئے ہماری تجویز یہ ہے کہ خاص اجلاس پُرانے آئین ہی کے ماتحت۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء سے پہلے منعقد کر لیا جائے۔ کیونکہ پُرانے آئین کی رُو سے ہر مسلمان ایک روپیہ ادا کرے۔ بجٹ میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ۳۱ مارچ بہت قریب ہے تو پھر ہماری یہ تجویز ہے۔ کہ آپ نئے آئین کے نفاذ کو۔ خاص اجلاس تک ملتوی کر دیں۔ اور یہ اجلاس ۱۳ مارچ کے بعد۔ مناسب تاریخوں میں منعقد کر لیا جائے۔ اگر یہ دونوں تجویزیں آپ کو منظور نہ ہوں۔ تو پھر ہماری درخواست ہے کہ آپ خاص اجلاس کی بجائے، ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس منعقد کریں جس میں ہر بالغ مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس بھی لیگ کے زیر اہتمام اور آپ ہی کے زیر صدارت منعقد ہوگی۔ آپ کا منقص : غلام رسول

آنریری سکریٹری، پنجاب پراونشل مسلم لیگ  
(برائے ڈاکٹر محمد اقبال)

مسٹر جناح کی طرف سے اس خطا کا کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر صاحب کے نام۔ وہ خط ۲۰ سال کیا۔ جو گذشتہ باب میں درج کیا جا چکا ہے۔ اور میں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا تھا۔ کہ آیا وہ۔ لیگ کے اجلاس خصوصی کا۔ لاہور میں منعقد ہونا پسند کریں گے یا نہیں۔ اور جس کے جواب میں۔ غلام رسول خاں نے۔ ڈاکٹر صاحب کے حسب ہدایت لکھا تھا کہ اجلاس خصوصی یقیناً لاہور میں منعقد ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال مدت سے۔ اس بات کے خواہش مند تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ مسکا اجلاس لاہور میں ہو۔ ان کو یقین تھا کہ پنجاب میں لیگ کی تحریک۔ جمعی عوام کے دلوں میں گھر کر سکے گی۔ کہ مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان اجلاس۔ لاہور میں منعقد کیا جائے۔ جہاں ہندوستان کے ہر صوبے سے بڑے بڑے مسلمان لیڈر آکر شرکت کریں۔ عام لوگوں میں کسی سیاسی تحریک کو مقبول بنانے کے لئے۔ اس قسم کے جلسوں جلوسوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

ابھی اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ کی تیاریاں بھی شروع نہیں ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو۔ مسٹر جناح کو لکھا تھا کہ

”... میری رائے میں۔ یہ بہتر ہوگا۔ کہ لیگ کا سالانہ اجلاس۔ کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں کرنے کی بجائے۔ پنجاب میں منعقد کیا جائے۔ لاہور میں اگست کے مہینے کا موسم اچھا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں۔ وسط اکتوبر بہتر ہوگا۔ جبکہ یہاں موسم کافی خوشگوار

سہ جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس تجویز کی اہمیت پر اچھی طرح غور فرمائیں گے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا اثرو روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ اور اگر آپ نے لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں کیا۔ تو مسلمانان پنجاب میں سیاسی بیداری پھیلنے کی پختہ توقع ہے۔ لہ

پونے دو مہینے کے بعد۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو۔ انہوں نے۔ اسی موضوع پر پھر مسٹر جناح کو تحریر فرمایا۔ کہ۔

..... لیگ کے مرکزی دفتر دہلی نے۔ مسٹر غلام رسول خاں کو اطلاع دی ہے۔ کہ مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ اجلاس کی تاریخوں کا۔ سنوز تعیین نہیں ہوا۔ اندس حالات۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ یہ اجلاس غالباً اگست یا ستمبر میں منعقد نہیں ہو سکے۔ میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ اکتوبر کے وسط یا آخر میں۔ لیگ کے اس اجلاس کا انعقاد لاہور میں کیجئے۔ اس وقت حالت یہ ہے۔ کہ پنجاب میں لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور مجھے اس امر میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کہ اگر مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں ہوا۔ تو یہ واقعہ۔ لیگ کی تاریخ میں۔ ایک انقلاب آڑی موڑ کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ اور اس طرح ہم عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔“ لہ

لہ۔ لہ اقبال کے خطوط جناح کے نام دیشی محمد اشرف

بالآخر جب ۱۱ اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس نکھنڈو میں ہوا تو وہاں بھی یہ تحریک اٹھی کہ آئندہ اجلاس لاہور میں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب - ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بڑے اصرار سے مسٹر جناح کو لکھتے ہیں -

”..... مجھے امید ہے کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس منعقد

ہونے سے قبل آپ کم از کم دو ہفتے پنجاب کا دورہ ضرور

کریں گے! لہ

۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو یونیسٹ پارٹی کے لیڈروں کی شکایت کرتے

ہوئے۔ بڑے افسوس سے مسٹر جناح کو تحریر فرماتے ہیں کہ

”..... یہ لوگ اب چاہتے ہیں کہ لیگ کا آئندہ اجلاس فردی

کے بجائے اپریل میں ہونا چاہیے۔ وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں

یہ ہے کہ وہ پنجاب میں اپنی زیندارہ لیگ کے پاؤں مضبوط

کرنے کے درپے ہیں۔ لہ

یہ تمام باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب شدت سے اس امر کے

خواہش مند تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس - جلد از جلد لاہور میں ہو

تاکہ لیگ کے زیر اہتمام رابطہ عوام کی تحریک پوری سرگرمی سے شروع کی جاسکے۔

اب کہ ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب سے یہ استفسار کیا

کہ آیا وہ لیگ کے سالانہ اجلاس کا انعقاد لاہور میں پسند کریں گے۔ تو ڈاکٹر

لہ۔ لہ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

صاحب نے۔ اس تجویز کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور فوراً غلام رسول خاں سے جواب لکھوایا۔ کہ یہ اجلاس یقیناً ایسٹر کی تعطیلات کے موقع پر۔ لاہور میں منعقد ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس جواب کی روشنائی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نواب محمد طے، جن کو ہم بد قسمتی سے پنجاب پیاد نائل مسلم لیگ کا صدر بنا چکے تھے، خفیہ خفیہ اور چپکے چپکے مسٹر جناح کو ذیل کا خط لکھا۔

”ڈیر مسٹر جناح۔“

غالباً آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ مجھے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اور سر محمد اقبال کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ہیں۔ نے یہ عہدہ قبول کر لیا ہے۔ ایک جلسے میں جس میں موجود تھا یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے انعقاد کے لئے۔ لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے۔ میرا یہ فرض ہے۔ کہ میں آپ پر واضح کر دوں۔ کہ مسلم لیگ اور شہید گنج کی تحریک کے بہترین مفاد۔ اس امر کے متقاضی ہیں کہ لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں نہ ہو۔

مسلم لیگ پنجاب میں۔ ابھی تک ابتدائی منازل میں ہے۔ اور بعض مخالفت قوتیں، اس کی روز افزوں ترقی، اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہیں۔ اگر لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ تو پنجاب کے مشتعل مسلمانوں



کی طرف سے۔ آپ پر بے حد دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور آپ کو ایسا طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ جو غالباً آپ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوگا۔ اور مجھے ڈر ہے۔ کہ یہ چیز کامیابی کے ساتھ لیگ کے خلاف استعمال کی جائے گی۔

علاوہ ازیں، سکھوں نے بھی۔ لاہور میں۔ انہی آیام میں۔ جب لیگ کا خاص اجلاس منعقد کرنے کا خیال ہے۔ ایک بہت بڑا دیوان منعقد کرنے کی تیاریاں۔ ابھی سے شروع کر دی ہیں۔ اور بجا طور پر۔ ایک فرقہ وارانہ ناساد کا خطرہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اُمید۔ بلکہ یقین ہے۔ کہ آپ اس نازک مرحلہ پر۔ اپنی زبردست قابلیت۔ اور بے مثال جرأت سے کام لے کر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔ تاکہ شہید گنج کے اہم مسئلہ پر۔ ایک پرسکون فضا میں بحث و تمحیص ہو سکے۔ میں اس خط کی ایک نقل آپ کے بھئی کے پتہ پر بھی بھیج رہا ہوں۔

آپ کا مخلص

شام نواز خاں

نواب ممدوٹ نے یہ خط سرسکندر حیات کے ایما و اور تحریک پر لکھا تھا۔ سرسکندر ہرگز اس بات کے حامی نہ تھے۔ کہ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو۔ اس قدر نے خود بخود ایسے سامان ہتیا کر دیئے تھے۔ کہ پروانٹل مسلم لیگ کا صدر۔ سرسکندر کا ایک ماحتمہ و پروا حتمہ آدمی تھا۔ چنانچہ اب انہیں اس بات کی قطعاً

کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے جاوید منزل کا طواف کریں۔ یا مطلب براری کے لئے۔ غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کے مکانوں پر جا کر دستک دیں۔ اب تو پنجاب مسلم لیگ کا صدر۔ اُن کے چشم دابرو کے اشارے پر۔ سب کچھ نثار کر دینے کو آمادہ تھا۔

نواب ممدوٹ نے اپنے اس منطکے مشروع میں لکھا ہے۔ کہ "ایک جلسے میں۔ جس میں میں موجود نہ تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے لئے "لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے"۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ اُس زمانے میں لیگ کے تمام جلسوں کے ایجنڈے میں خود تیار کرتا تھا۔ اور پھر سرائی پور اپنا نیشنل لیگ کے جنرل سیکریٹری غلام رسول خاں کے دستخط سے جاری کیا جاتا تھا۔

جب ڈاکٹر صاحب نے۔ غلام رسول خاں کو جلسہ کرنے کا حکم دیا۔ تو میں نے ایجنڈا مرتب کیا تھا۔ اور اُس کی ایک نقل باقاعدہ نواب ممدوٹ کو بھی بھیجی گئی تھی۔ نواب صاحب نے یقیناً سرسکندر سے مشورہ کیا ہوگا۔ اور پھر باہمی طور پر پیٹ ہو گیا۔ کہ وہ اس جلسہ میں شریک نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر نواب ممدوٹ اُس جلسہ میں تشریف لاتے۔ اور لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کی تجویز کے خلاف رائے دیتے۔ تو ایک شخص بھی اُن کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اُنہیں پہلے سے اس کیفیت اور صورتِ حال کا علم تھا۔ اسی لئے اُنہوں نے عمداً اور جان بوجھ کر جلسہ میں شرکت سے گریز کیا۔

ہیں نواب ممدوٹ کے اس خط کا ہرگز کوئی علم نہیں تھا۔ بلکہ ہم تو اس خیال سے مطمئن تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں ہمارے دعوت کو یقیناً قبول کرے گی۔ اور پھر ہمیں لیگ کے اجلاس کی تیاریوں میں شب و روز منہمک ہو جانا پڑے گا۔ صرف یہی نہیں۔ ہم نے تو ۱۹ مارچ کے جلسے کے بعد چند سبکیٹیاں بنا کر کام کی ابتداء بھی کر دی تھی۔

یہ کیفیت تھی۔ جب، نواب ممدوٹ کے حقیقہ خط سے قطعاً بے خبر، ہم لوگ ۲۰ مارچ کے اجلاس میں شرکت کے لئے دہلی پہنچے۔ ۱۹ مارچ کی شام کو ملک بركت علی، غلام رسول خاں، ملک زمان ہمدی اور رقم السطور مسٹر جناح سے ملے۔ تاکہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں تفصیلات پر بحث ہو سکے۔ مسٹر جناح نے ہنس کر فرمایا۔ کہ "پنجاب پماد نشل مسلم لیگ کا صدر تو۔ لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کے خلائقے آپ کس منہ سے بچے کو دعوت دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے۔ نواب ممدوٹ کا خط ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اُس وقت ہماری جو کیفیت ہوئی۔ اُس کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سب سے زیادہ صدمہ ملک بركت علی کو ہوا۔ جن کے غلط انتخاب کی وجہ سے۔ ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ بہر حال ۲۰ مارچ کو۔ لیگ کونسل نے فیصلہ کر دیا۔ کہ مسجد شہید گنج کے باڑے میں مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی کھلتے میں ہوگا۔ اس تجربے علامہ اقبال کو سخت رنج ہوا

کیونکہ وہ مدت سے یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ کہ اجلاس لاہور میں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ اب اُس اُمید کے بُر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

دہلی جانے سے قبل ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کا ایک ضروری اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا تھا تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے نوٹس ممبر منتخب کئے جائیں۔ صوبے کی کم و بیش ہر شاخ کے نمائندے جلسے میں موجود تھے۔ چنانچہ نہایت خوش اسلوبی سے نوٹس آدمیوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونینسٹ پارٹی کے کسی آدمی نے اب تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اور نہ اس پارٹی کا کوئی رکن۔ اب تک کسی ضلع کی مسلم لیگ کا ممبر بنا تھا۔ اس لئے ان نوٹس آدمیوں میں ایک بھی یونینسٹ شامل نہیں تھا۔

اسی دوران میں۔ صوبے کی تمام شاخوں کو لکھ دیا گیا تھا۔ کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس خصوصاً کے لئے مندوبین منتخب کر کے۔ ان کی فہرستیں پر ادنشل لیگ کے دفتر میں طلباء بند بھیج دیں۔ چنانچہ اس ہدایت پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اور تمام اضلاعی شاخیں۔ اپنے اپنے ہاں مندوبین کے انتخاب میں مصروف ہو چکی تھیں۔

مجھے یہاں ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوسناک بات کا ذکر کرنا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب تک اُس کا ذکر نہ کر لیا جائے۔ ماعنیٰ کی اس داستان کو آگے بڑھانا۔ میرے لئے بالکل ناممکن ہے۔ جب سے پنجاب میں۔ سرسکندر خیانت خاں کی وزارت قائم ہوئی تھی۔ تو اب زادہ

لیاقت علی خاں کا ذاتی رویہ ہمارے متعلق بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ان کی ادا اور اعانت اور تائید و حمایت۔ ٹکلیٹہ سر سکندر کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا۔ وہ ہر موقع پر سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اس دوران میں مکتی بار ایسے مواقع پیش آئے۔ کہ ہم راستی پر تھے۔ اور سر سکندر کا رویہ غلط تھا۔ لیکن نواب زادہ صاحب مرحوم نے۔ ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا۔ ہم اس چیز کو بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اور بار بار ہم نے بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا تھا۔ کہ یہ تمام باتیں مسٹر جناح کے گوش گزار کر دینی چاہئیں۔ لیکن پھر اس خیال سے خاموش رہے۔ کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ ہر دست مسٹر جناح کے تفکرات میں اٹھا نہ کیا جائے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خاندان کے تمام لوگ۔ اور جملہ اعزہ و اقارب کربال میں رہتے تھے۔ جنہیں آئے دن حکومت پنجاب کی ادا و اعانت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سر سکندر بڑے ذریعہ اور ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے نواب زادہ مرحوم کے اس مکرور بہپو کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ خود لیاقت علی خاں کے بڑے بھائی۔ نواب زادہ سجاد علی خاں پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونیٹ پارٹی کے رکن تھے۔ سر سکندر اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے درمیان ہر قسم کا نامہ و پیام انہی کے توسط سے ہوتا تھا۔ یہیں ایک ایک بات کا علم تھا۔ لیکن مصلحت کی مجبور ہو کر انہوں نے۔ ہماری زبان و قلم پر پیرے بٹھا رکھے تھے۔

اسی سلسلہ میں میں یہاں ایک ضروری واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں

جب علامہ اقبال کی مسلسل کوششوں کے باوجود سر سکندر اودھان کی جماعت نے مسلم لیگ کے قریب رکنیت پر دستخط نہ کئے تو ڈاکٹر صاحب بالکل بالیوس ہو گئے تھے۔ اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب یونینٹ پارٹی سے کسی قسم کے اشتراک و تعاون کی توقع رکھنا خیالِ خام ہے۔ اور پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بالکل ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے پیموس کہہ کے کہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ فردوس ۱۹۳۸ء میں ذیل کا بیان غلام رسول خاں کو لکھوایا۔ اور حکم دیا۔ کہ اسے فوراً اخبارات کو بغرض اشاعت بھیج دیا جائے۔

## غلام اقبال کا بیان :-

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آئریبل سر سکندر حیات خاں نے یونینٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں۔ یہ اعلان کیا تھا۔ کہ واپس پنجاب جانے کے بعد وہ اپنی جماعت کا ایک اجلاس منعقد کریں گے۔ اور اس میں اپنی جماعت کے اُن مسالوں ممبروں کو، جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں۔ لیگ کے دستور پر دستخط کر سنے۔ اور اس کا رکن بننے کی تلقین کریں گے۔ یہ ارکان لیگ کے مرکزی ادھو بائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے ماتحت رہیں گے۔ اور اسمبلی کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے اسمبلی کے اندر

مسلم لیگ پارٹی متصوّر ہوں گے۔ اور اس مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔

”نام نہاد سکندر جناح پیکیٹ کا اہم حصہ صرف یہی ہے۔ اور اس پیکیٹ کی باقی شقوں سے یہیں فی الحال کوئی واسطہ نہیں۔“

”جب مذکورہ بالا اعلان اخباروں میں شائع ہوا۔ تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے تمام بے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اب دور ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہذا میں نے۔ مسٹر غلام رسول خاں سکریٹری پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ کو بدایت کی۔ کہ وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی نوئے درخواست ہانے رکینٹ بھیج دیں۔ تاکہ وہ اُن پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے دستخط کرا لیں چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں سر سکندر حیات خاں کے پاس بھیج دی گئی تھیں۔ لیکن یہیں ان کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس لئے یا دد بانی کمرانی گئی۔ مگر پھر بھی ہر سکوت نہ ٹوٹی۔ اور تا حال سر سکندر نے۔ ایک درخواست بھی دستخط کرا کر۔ واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملکہ

برکت علی نے اطلاع دی ہے۔ کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اردو ماں یونینسٹ پارٹی کے ایک ڈیڑمہ دار رکن نے یہ بیان کیا۔ کہ رکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کرنے گئے ہیں۔ اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے۔ کہ وہ سر سکندر جناح پیٹ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔ ”اس مقام پر۔ یہ امر استدھوری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصل صورتِ حالت کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ جس کا اہم ترین حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے ان کے اور سر جناح کے درمیان زبانی انہماق و تفہیم بھی ہوئی تھی۔ ” مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس پیٹ کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔ اور اس وجہ سے عوام میں یونینسٹ پارٹی کے رویے کے خلاف سخت بیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار مہینے گزر چکے ہیں۔ مگر یہ بیجان واضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے۔ کہ مسلمان عوام کو صحیح صورتِ حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔

”میں اعلان کرتا ہوں۔ کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں۔ تاکہ



مسلمانان پنجاب کو معلوم ہو جائے۔ کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ  
 ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ توقع رکھنا۔ کہ  
 سکندر جناح پیکٹ کے بعد۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان۔  
 اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ ایک اُمیدِ موموم  
 ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ مسلم لیگ کا  
 دروازہ ہر اُس مسلمان کے لئے کھلا ہے۔ جو لیگ کے دستور پر دستخط  
 کرنے کو تیار ہے۔ اور میں نہایت خوشی سے اعلان کرتا ہوں۔ کہ  
 اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلمان ارکان نے لیگ کے  
 دستور پر دستخط کر دیئے ہیں۔“

یہ بیان بڑا زبردست اور معرکہ آرا رہا تھا۔ جس کی زد پر اہل راستِ مسلم لیگ  
 اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی چپقلش پر پڑتی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے  
 دو مختلف کشتیوں میں سوار ہونے کے بعد جو منافقت آمیز طرزِ عمل اختیار  
 رکھا تھا۔ اس بیان نے اس کی تلعی کھیں کر رکھی تھی۔ اگر یہ بیان اُس وقت  
 شائع ہو جاتا۔ تو نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اُس کے نتائج کیا ہوتے۔ لیکن یہ بات  
 تو پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے۔ کہ مسٹر جناح نے اچھ سال انتظار  
 کرنے کے بعد، جو قدم ۱۹۲۲ء میں اٹھایا تھا۔ وہی قدم اقبال نے پوری  
 جرات و ہمت سے ۱۹۳۸ء ہی میں اٹھالیا تھا۔

۱۔ اصل بیان انگریزی میں تھا۔

غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کی رائے تھی۔ کہ اشاعت سے پہلے اس بیان کی ایک نقل مسٹر جناح کو بھی بھیج دینی چاہیے۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے۔ کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک نقل مسٹر جناح کو دہلی بھیج دی گئی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی وہیں تھے۔ انہوں نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا۔ کہ سر سکندر حیات سے یوں بگاڑ پیدا کر لینا اچھا نہیں۔ چنانچہ مسٹر جناح کا جواب آ گیا۔ کہ ہر دستہ یہ بیان شائع نہ کیا جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اپنے ۲۲ مارچ ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں پانچ ممبروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس کے صدر نواب سمیع اللہ خاں اور سکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ اس سب کمیٹی کا کام یہ تھا۔ کہ الحاق کی ان درخواستوں کا فیصلہ کرے۔ جو سندھ و تان کے مختلف صوبوں کی مسلم لیگوں کی طرف سے۔ مرکزی دفتر میں موصول ہو رہی تھیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو۔ باہنا بلہ اپنے الحاق کی درخواست مرکزی دفتر میں ارسال کر دی تھی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ پنجاب کی طرف سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے۔ جو نوٹے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ ان میں سر سکندر کی پارٹی کا ایک آدمی بھی شامل نہیں تھا۔ سر سکندر کو اس واقعہ سے سخت تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اگر یہ صورت حال قائم رہتی۔ تو گویا آل انڈیا مسلم لیگ سے۔ سر سکندر حیات اور ان کے رفقاء۔ ایک قلم خارج کر دیئے جاتے۔ یہ جو کچھ

ہوا تھا۔ بالکل لازمی اور طبعی تھا۔ اس میں بغض و عناد کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ جب تک سرسکندر اور ان کی جماعت کے لوگ۔ مسلم لیگ کے ممبر بن جاتے۔ اُنہیں قاعدے اور قانون کی رُو سے لیگ کونسل کے لئے منتخب نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ادھر آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا۔ کہ وہ پنجاب پرائیوٹ مسلم لیگ کے نوٹے آدمیوں کی فہرست کو مسترد کر کے۔ خود اپنی مرضی سے اور لوگوں کو نامزد کر دے۔ ہاں ایک طریقہ باقی تھا۔ اور وہ یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر پنجاب پرائیوٹ مسلم لیگ کا الحاق منظور کرنے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں جبکہ پنجاب اپنی صوبائی لیگ کے وجود ہی سے محروم ہو جاتا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کو اختیار تھا۔ کہ وہ اپنی مرضی سے پنجاب کے نوٹے آدمی کونسل کے لئے نامزد کر دے۔

اب سرسکندر اور ان کے ساتھیوں نے بڑی شدت سے دھڑ دھڑاپا شروع کی۔ کہ پنجاب پرائیوٹ مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست مسترد کر دی جائے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں ان کی اپنی نامزدگی کا دروازہ کھل سکے۔

نواب مدوٹ، میر مقبول محمود، میاں احمد یار خاں دولتانا اور سید افضل علی حسنی نے۔ دہلی پہنچ کر ڈیرہ لگا دیا۔ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں سے صبح و شام ملاقاتیں سونے لگیں۔ آخر کار یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور جس مہم پر وہ نکلے تھے۔ اُسے فتح کر کے واپس آئے

لاہور میں کئی روز سے - یہ افواہ پھیل رہی تھی کہ پنجاب پراڈنشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں ہوئی - یہ افواہ میں نے بھی سنی - غلام رسول خاں - ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین دین نے بھی سنی - حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب تک بھی یہ افواہ پہنچ گئی - ہم حیران تھے کہ اس افواہ کی بنیاد کیا ہے - جب ادرہ ادرہ سے پوچھنے لگے - تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے یہ بات مشہور کی ہے - سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لیگ کے الحاق یا عدم الحاق کی اطلاع - ہم سے بالا بالا - یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں کیونکر پہنچ سکتی ہے -

انہی دنوں - ایک روز میں اور غلام رسول خاں ریلوے روڈ پر ایک دوست کے ہاں شادی کی دعوت میں شریک ہوئے - کھانے سے فارغ ہو کر ابھی تمام مہمان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے - اور پوچھنے لگے کہ "آپ پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری ہیں؟"

میں نے جواب دیا "نہیں - میں جوائنٹ سکریٹری ہوں - سکریٹری وہ سائنے بیٹھے ہیں - غلام رسول خاں - فرمائیے - کیا کام ہے آپ کو؟" وہ بولے - "میں نے سنا ہے کہ آپ کی لیگ کے الحاق کی درخواست نامنظور ہو گئی ہے -"

میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی افواہ بہت دنوں سے پھیل رہی ہے - لیکن ہمارے پاس تو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی -"

وہ کہنے لگے: "آپ میری بات کو بالکل درست سمجھئے۔ میں نے خود میرے مقبول  
مجموعہ سے سنا ہے۔"

میں اُن کو لے کر غلام رسول خاں کے پاس چلا گیا۔ وہ کئی روز سے  
بھروسے بیٹھے تھے۔ فوراً بول اٹھے: "یونٹیسٹ پارٹی کے لوگ جھوٹ بکتے ہیں۔  
ہماری درخواست کا ابھی کوئی جواب نہیں آیا!"

میں نے غلام رسول خاں کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ "زبانِ خلیق کو  
تقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔ یہ جو کئی روز سے مشہور ہو رہا ہے۔ اس میں ضرور  
کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔"

کہنے لگے: "پھر میں کیا کروں۔ جو ہونا سوہنا ہو جائے گا!"

اسی شام۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری کی طرف سے ہمیں  
باضابطہ اطلاع موصول ہو گئی کہ پنجاب پبلسٹیشنز مسلم لیگ کے الحاق کی  
درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔

اُس اطلاع کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"جناب عالی!

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ  
کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی۔ اُس نے پنجاب پبلسٹیشنز  
مسلم لیگ کی درخواست پر غور کیا ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ سے  
آپ کی درخواست سے متعلقہ اقتباسات آپ کی حد

میں بھیج رہا ہوں۔ یہ رپورٹ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۳۱ اپریل ۱۹۳۵ء میں بمقام دہلی پیش ہو کر منظور ہو چکی ہے۔

آپ کا مخلص

لیاقت علی خاں۔

آزادی سکرٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ

## موجودہ اقتباس

در مختلف صوبوں کی الحاق کی درخواستوں پر غور و خوض۔ اور فیصلہ کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے۔

پنجاب کے معاملہ میں کمیٹی کو افسوس ہے کہ ذرا الحاق منظور کرنے سے موزور ہے۔ دیگر امور کے علاوہ کمیٹی کی رائے ہے۔

کہ وہ قواعد و ضوابط جن کے ماتحت اس لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے خلاف ہیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے وضع کردہ آئین کی دفعہ ۳۳ میں یہ لکھا گیا ہے کہ لیگ پنجاب کی کسی دوسری مسلم ایوسی ایشن کا الحاق اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہماری ہر رائے میں یہ دفعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کی روح کے منافی ہے۔ پرانے آئین میں اس قسم کی دفعہ ضروری تھی۔ لیکن نئے آئین میں۔

اس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ بذاتِ خود ایک مکمل جماعت ہے۔ جو مسلمانوں کی تمام ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ لہذا آل انڈیا مسلم لیگ کسی دوسرے مسلم ادارے کو اپنی شاخ کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتی درحقیقت بلکہ بین مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ اور وہ جماعت مسلم لیگ ہے۔

دوسرے اہم اعتراضات و نقات ۵-۶-۷ سے متعلق ہیں۔ ان نقبات کی رُو سے۔ ہر وہ مسلمان ریپریٹیک مقررہ فیس ادا کر کے اندر پرائشل کونسل یا پنجاب مسلم لیگ۔ اس کی درخواست منظور کرے) پرائشل مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ دوسرے نقطوں میں۔ ان قواعد کی رُو سے۔ پرائشل مسلم لیگ کی رکنیت براہِ راست درخواست کرنے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ امر ہمارے نئے آئین کے بنیادی اصول کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کے ماتحت سرگرن کے لئے کسی ابتدائی لیگ کی رکنیت ضروری ہے۔ اور وہ پرائشل مسلم لیگ میں۔ صرف کسی ابتدائی یا ضلع لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہو سکتا ہے۔ فی الواقع پرائشل مسلم لیگ کی بلا واسطہ رکنیت کی اب اجازت نہیں ہے۔ اور ہماری رائے یہ ہے۔ کہ اس قسم کے آئین و ضوابط کے ماتحت

معرضِ وجود میں آنے والی لیگ کا الحاق نہیں کیا جاسکتا۔  
کیونکہ یہ بات آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین و ضوابط کے بالکل  
منافی ہے! لے

دستخط

لیاقت علی خاں

آنریری سکریٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔

یہ خط ۵ اپریل کو ہمارے دفتر میں پہنچا۔ اور غلام رسول خاں نے  
اسی وقت علامہ اقبال۔ ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین وغیرہ کو اطلاع  
کر دی۔ ہمارا فوری ردِ عمل یہ تھا۔ کہ ہمیں بطور احتجاج مسلم لیگ سے مستعفی  
ہو جانا چاہیے۔ تاکہ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اپنی پسند کے آدمیوں کی  
مدد سے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخ چاہیں قائم کر لیں۔ لیکن  
پھر غور کرنے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ یہ روایتی قومی مصلحت کے خلاف ہے۔  
اس لئے جملہ نقائص کو رفع کر کے۔ الحاق کی نئی درخواست فی الفور وہی  
بھیج دینی چاہیے۔

جن نقائص کی بنا پر۔ ہماری درخواست مسترد کی گئی تھی۔ وہ محض  
اصطلاحی تھے۔ اگر نیت بخیر ہوتی۔ تو ہمیں ہدایت کی جاسکتی تھی۔ کہ ان  
نقائص کو رفع کر کے۔ نئی درخواست بھیج دو۔ لیکن وہاں تو ارادہ یہی تھا

لے اصل خط انگریزی میں تھا۔



کہ الحاق نہ ہونے پائے۔ تاکہ سرسکندھیتا کے آدمیوں کو لیگ کونسل میں داخل کرنے کا راستہ صاف کیا جاسکے۔

ملک برکت علی نے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۷ اپریل کو ایک طویل خط مسٹر جناح کو لکھا۔ یہ خط ملک صاحب کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

”ڈیر مسٹر جناح۔

مسٹر غلام رسول خاں۔ بیرسٹرا ایٹ لارنس۔ ابھی ابھی مجھے وہ خط دکھایا ہے۔ جو انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے موصول ہوا ہے۔ اس خط میں اُس سب کمیٹی کی رپورٹ کے اقتباس بھی درج ہیں۔ جناح الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے سے لے کر مقرر کی گئی تھی۔ ان اقتباسات میں وہ وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ جن کی بنا پر مذکورہ سب کمیٹی نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

سب کمیٹی نے ہمارے دستور کی دو شقوں پر اعتراض کیا ہے اول یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کسی دوسری مسلم ایسی ایش کا الحاق بھی اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ دوم یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی رکنیت براہ راست بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں شقیں۔ چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کے منافی قرار دی گئی ہیں۔ اس لئے میری گزارش ہے کہ ان میں

نہایت آسانی سے ترمیم و ترمیم کی جا سکتی ہے تاکہ ہمارا آئین  
جزو اول کٹا۔ ان اصولوں پر مرتب ہو جائے۔ جن پر آل انڈیا  
مسلم لیگ کا دستور وضع کیا گیا ہے۔ مسٹر غلام رسول خاں نے  
بہت جلد پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرنے کا  
اعلان کیا ہے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں اعتراضات کو  
رفع کر کے نئی درخواست بھیج دی جائے۔

آپ کی خدمت میں یہ عرض لکھتے سے میرا مقصد صرف یہ ہے۔  
کہ میں نہایت ادب سے عرض کہوں۔ کہ ان دو معمولی فریگزیشنوں  
کی آڑ لے کر۔ ہمارے الحاق کی درخواست کو مسترد کر دینا کسی طرح  
بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہماری صوبائی لیگ۔ آل  
انڈیا مسلم لیگ کی ایک باقاعدہ اور ملحقہ شاخ ہے اور اس کا  
یہ الحاق کوئی نیا نہیں۔ بلکہ لاء سے چلا آ رہا ہے۔ ایسی  
پہا نی شاخ کے لئے صرف یہی کافی تھا۔ کہ اسے مذکورہ بالا دو  
قابل اعتراض شقوں کو رفع کر دینے کی ہدایت کر دی جاتی  
نہ کہ محض ایک اصطلاحی عذر کی بنا پر۔ الحاق ہی سے انکار  
کر دیا جاتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ کہ الحاق اس شرط پر منظور  
کر لیا جاتا۔ کہ ہم دونوں شقیں رفع کر کے۔ اپنے آئین کو درست  
کر دیں۔

ہمیں اور لیگ کے تمام کارکنوں کو سب سے زیادہ تکلیف

جس بات سے ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یونینٹ پارٹی کے لوگ  
 کئی روز سے شور مچا رہے تھے۔ کہ ہماری لیگ کا الحاق نہیں ہوگا۔ آخر کار  
 اُن کی بات درست نکلی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ نے وہی کیا۔  
 جو یونینٹ پارٹی چاہتی تھی۔ ہم نہایت اخلاص اور وفاداری کے  
 ساتھ۔ گذشتہ بائیس سال سے آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمت  
 کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انتہائی رنج ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ  
 یہ ناز و اسلوک۔ صرف اس لئے کیا جا رہا ہے۔ کہ اُن لوگوں کو  
 مطمئن کیا جائے۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بدترین دشمن ہیں  
 اور جو آج بھی۔ اس صوبے میں مسلم لیگ کی جڑیں کاٹتے ہیں  
 صبح و شام مصروف رہتے ہیں۔

ہم نے مخالفت کے بدترین طوفان کے باوجود۔ لیگ کی خدمت  
 سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ اور یہ سب کچھ۔ کسی شخص کو خوش یا  
 ناامین کرنے کے لئے نہیں کیا۔ بلکہ ہمارے پیش نظر صرف  
 قومی خدمت کا نصب العین تھا۔ الحمد للہ۔ آج ہم فخر  
 و انبساط سے۔ اپنی شبانہ روز محنت کے نتائج دیکھ رہے ہیں  
 کہ سارا پنجاب یونینٹ پارٹی سے متنفر۔ اور مسلم لیگ کا  
 حامی و مددگار ہے۔ اگر گذشتہ انتخاب میں۔ اسمبلی میں منتخب  
 نہیں ہو سکے۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شہری اور دیہاتی  
 حلقوں کو انتہایت ہوشیاری، بلکہ متکاری سے۔ ایک دوسرے

سے علیحدہ رکھا گیا ہے۔ تاہم ان گڑ کا دلوں کے باوجود۔ میں یہ کہہ  
سکتا ہوں کہ آج رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور اٹارڈ  
آئندہ عام انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے رکھ دیا  
جائے گا۔

ہم محسوس کر رہے ہیں، کہ آپ کو ابھی تک یہ امید ہے۔ کہ یونینسٹ  
پارٹی کا لیڈر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ ہم سر ممکن طریقے  
سے آپ پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں، کہ سر سکندر حیات کبھی  
پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائیں گے۔ ان کی چال  
صرف یہ ہے، کہ ایک طرف تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں  
کسی نہ کسی طرح اپنا اثر و رسوخ قائم رکھیں۔ اور دوسری طرف  
پنجاب میں ایک کاسر کھیلنے رہیں۔ ستم ہے کہ ہمارے پیہم انتہاء  
کے باوجود وہ آپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور  
اب تو یوں معلوم ہوتا ہے، کہ اس کھیل میں گویا ہم لوگوں کو  
قربانی کا بھرا بننا پڑے گا۔ ہم سر گز سر گز اپنے آپ کو قربانی کے  
بھروسے کی جمشیت دینا گوارا نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اس بات  
پر آمادہ ہیں کہ پنجاب مسلم لیگ کو توڑ کر یہ اعلان کر دیں کہ  
ہماری جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ شاخ نہیں ہے  
اگر آپ پسند فرمائیں۔ تو ہم ابھی اس قسم کا اعلان کرنے کو  
تیار ہیں۔ سر سکندر اور ان کے احباب۔ بڑی خوشی سے

لیگ کو سنبھال لیں۔ ہمیں حاشا دکلا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔  
الحاق کرنے والی سب کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ موصول ہونے  
کے بعد۔ ہمارا پہلا رد عمل یہی تھا۔ کہ ہم فوراً اپنی علیحدگی کا  
اعلان کر کے۔ لیگ کو سرسکندر اور ان کے احباب کے حوالے  
کر دیں۔ لیکن پھر سوچ کر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ پہلے آپ کو اپنے خیالات  
و عزائم سے آگاہ کر دینا ضروری ہے۔

اگر آپ کو اب ہماری چنداں ضرورت نہیں رہی۔ تو ہمیں آپ  
سے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ لیکن ہم یہ تو مرگیز بدداشت نہیں  
کر سکتے۔ کہ ہماری اس لیگ کا الحاق نامنظور کر دیا جائے۔  
جو گذشتہ ربع صدی سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی۔ ایک ملحقہ  
شمار چلی آ رہی ہے۔ اور جس کے ممبروں کی فہرست میں۔ ڈاکٹر  
سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور سندھوستان گیر شہرت کے آدمی  
کا نام نامی بھی موجود ہے۔

سب کمیٹی کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ "علاوہ دیگر امور کے۔ پنجاب  
مسلم لیگ کا آئین۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف ہے۔"  
یہ الفاظ یعنی "علاوہ دیگر امور کے" ہمارے لئے بالکل ناقابل  
فہم ہیں۔

میں اس موقع پر خاموش رہنا بندولی سمجھتا ہوں۔ کونسل کے  
ممبروں کی جو فہرست۔ ہم نے بھی تھی۔ اسے نہایت حقارت

سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ اور اُن لوگوں کو لیگ کونسل میں نامزد کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے لیگ کے بدترین دشمن ہیں۔ اور جو آج بھی لیگ کے پروگرام اور اصولوں کی مخالفت پر اُڑھا رکھائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ خوش ہیں کہ معاہدہ کی بنیادی شرط پوری کئے بغیر یعنی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی قائم کئے بغیر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی سونپ گئی ہے۔ یقین کیجئے کہ آپ اُن لوگوں پر اعتماد کر رہے ہیں۔ جو اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ یہی آپ کی اسے پرکونی اختیار نہیں ہے۔ آپ بڑی خوشی سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا را ہمیں قربانی کا بھمانہ بنائیے۔ ازراہ کرم مجھے مطلع فرمائیے گا۔ کہ ہماری موجودہ پوزیشن کیا ہے۔ ہماری لیگ کے الحاق کی درخواست کا استرداد کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ کہ ہم خاموشی سے۔ اس ذلت کو برداشت کر لیں۔ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنا سینہ چیر کر آپ کو دکھائیں۔ تاکہ آپ ہمارے حقیقی جذبات سے آگاہ ہو سکیں۔ براہ کرم میرے تلخ و ناملائم الفاظ کو معاف کر دیجئے گا۔ ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر تکلیف دہ ہے کہ معمولی صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جاسکتا۔

آپ کا منہ

برکت علی

غلام رسول خاں نے - ۲۲ اپریل کو۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا جلسہ کر کے سب کمیٹی کے دونوں اعتراض رفع کر دیئے۔ اور اصلاح شدہ آئین کے مسودے کے ساتھ۔ الحاق کی نئی درخواست دہلی بھیج دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سارے ہنگامے کے دوران میں۔ نواب محمد ٹٹے اپنی شکل بھی نہیں نہ دکھائی۔ وہ پنجاب پروڈنشل مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ وہ اس جدوجہد میں۔ ہمارے ساتھ نشانہ نشانہ کھڑے ہوتے۔ لیکن ازلکہ ہماری درخواست کے مسترد کرائے جانے میں سب سے بڑا دخل انہی کا تھا۔ وہ اس موقع پر ہمارے قریب تک نہ آئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی ۱۸ اپریل کو کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ ہمارا ارادہ وہاں جانے کا نہیں تھا۔ جب پنجاب پروڈنشل لیگ کا وجود ہی باقی نہیں رہا تھا۔ تو پھر آل انڈیا لیگ کے جلسے میں شرکت۔ بے معنی سی بات تھی۔ لیکن چونکہ اس اجلاس میں۔ شہید گنج کے مسئلہ کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس لئے پنجاب بھر میں جوش و خروش پھیل گیا ہوا تھا۔ اور بہت سے لوگ کلکتہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہر ضلع سے مندوبین کی فہرستیں ہمارے دفتر میں پہنچ رہی تھیں۔ اور لوگ بڑے اصرار سے ڈیلی گیٹ کے ٹکٹ طلب کر رہے تھے۔ مجبوراً ان تمام لوگوں کو اطلاع دینی پڑی۔ کہ لیگ کا الحاق چونکہ الحاق منظم نہیں ہوا۔ اس لئے کوئی شخص ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کلکتہ نہیں جا سکتا۔ اس خبر سے چاروں طرف مایوسی پھیل گئی۔

۴ مارچ اپریل کو۔ گیارہ بجے کے قریب۔ غلام رسول خاں۔ اور ملک ننان دہری  
میرے مکان پر آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ تیار ہو جاؤ۔ آج شام کی گاڑی سے کلکتہ  
جانا ہے۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ کہ یہ فیصلہ کب ہوا۔ کیونکہ گذشتہ شام تک  
تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔

غلام رسول خاں نے بتایا۔ کہ "آج صبح ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا ہے  
کہ کلکتہ جا کر۔ اپنی جنگ خود لڑو۔ یہاں گھر میں بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔  
ہم اب ڈاکٹر صاحب ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو!"

پہلے ہم ایک فردری کام سے۔ روزنامہ احسان کے دفتر میں گئے۔ اور وہاں  
سے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ ملک برکت علی بھی اُس  
وقت وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب۔ آنکھیں بند کئے ہوئے۔ پلنگ پر  
لیٹے تھے۔ غلام رسول خاں نے عرض کیا۔ کہ "ہم لوگ شام کو کلکتہ جا رہے  
ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "ضرور جاؤ۔ اور اپنے حق کے لئے آخر تک لڑو۔  
ہمارے ساتھ سخت نائنصافی ہوئی ہے۔"

ملک برکت علی نے کہا۔ "اگر ہماری نئی درخواست بھی منظور نہ ہوئی  
تو پھر کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت غراب تھی۔ لیکن انہوں نے کسی قدر جوش سے  
فرمایا۔ "کچھ فکر نہیں۔ درخواست منظور ہو یا نا منظور۔ جس اصول پر ہم نے



اب تک کام کیا ہے۔ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

جب ہم رخصت ہونے لگے۔ تو فرمایا: "کسی کی پروا نہ کرنا۔"

ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین  
ملک زمان ہمدی اور راقم السطور۔ ۱۲ اپریل کی شام کو کلکتہ روانہ ہوئے۔  
راجہ عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری بیگ کا الحاق نامنظور ہو جانے  
کے باوجود۔ پنجاب سے بہت سے لوگ کلکتہ جا رہے تھے۔ سہارنپور کے سٹیشن پر۔  
نواب اسماعیل خاں بھی۔ ہماری گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ بھی کلکتہ جا رہے  
تھے۔ نواب صاحب الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے والی سب کمیٹی  
کے صدر تھے۔ جب ان سے پنجاب کے بارے میں ہماری تفصیل گفتگو  
ہوئی۔ تو انہیں تمام حالات سن کر سخت افسوس ہوا۔ غلام رسول خاں  
کے پاس الحاق کی نئی درخواست موجود تھی۔ نواب صاحب نے۔ اسی  
وقت اس پر بڑے پرنور الفاظ میں لکھا یا۔ کہ الحاق فوراً منظور ہو جانا چاہیے۔  
۶ اپریل کی صبح کو۔ ہم کلکتہ پہنچے۔ اور مسلم انسٹیٹیوٹ کی بالائی  
منزل میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی روز دوپہر کو ایک نئے۔ الحاق کی نئی درخواست  
جس پر نواب اسماعیل خاں کی سفارش درج تھی۔ ہم نے آل انڈیا مسلم لیگ  
کے دفتر میں پہنچا دی۔

۱۱ اپریل کو۔ ساڑھے گیارہ بجے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا  
اجلاس ہونے والا تھا۔ اس لئے ۶ ار کی شام کو ہم نے اکٹھے بیٹھ کر مشورہ  
کیا۔ کہ اس اجلاس میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں یقین تھا

کہ ہماری درخواست پھر مسترد کر دی جائے گی، غلام رسول خاں تخت یا تختہ کے قائل تھے۔ آخر کسی قدر سوچ بچار کے بعد، فیصلہ ہوا کہ اگر درخواست منظور نہ ہو۔ تو اتھم التھریریہ میں اجلاس میں کھڑے ہو کر۔ بحث کا آغاز کرے۔ اور اگر بحث طویل کھینچ لے۔ تو ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین مدد کریں۔

۱۷ مارچ کو وقت مقررہ پر کونسل کا جلسہ شروع ہوا۔ پیر تاج الدین اور اتھم التھریریہ کے عین سامنے پہلی بیج پر بیٹھ گئے۔ باقی چاروں اصحاب پچھلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ سرسکندر حیات تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن ان کی پارٹی کے کم از کم ایک درجن ممبر ہال میں موجود تھے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پہلے گذشتہ اجلاس کی رپورٹ سنائی پھر صوبائی لیگوں کے الحاق کی درخواستوں کا معاملہ زیر بحث آیا تو کئی ایسی لیگوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ جن کا وجود محض کاغذی تھا۔ اور جن کا کوئی آئین بھی نہیں تھا۔ صوبہ سرحد کی بھی۔ ایک نام نہاد لیگ کا الحاق منظور کیا گیا۔ حالانکہ خود آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری نے۔ اس وقت تسلیم کیا۔ کہ اس لیگ کا وجود صرف کاغذی ہے۔ اور اس کا کوئی دستو بھی تا حال وضع نہیں کیا گیا۔ لیکن جب پنجاب کی طرف سے الحاق کی نئی درخواست پیش ہوئی۔ تو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ درخواست منظور نہیں کی جاسکتی۔

میں اس موقع کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت کھڑے ہو کر۔

سوال کیا کہ "ہماری درخواست کے نامنظور کئے جانے کی وجہ کیا ہے؟"  
 لڑا بڑا زادہ صاحب نے، کسی قدر تحکمانہ انداز میں فرمایا "بیٹھ جاؤ۔"  
 میں نے عرض کیا "میں سکول کا طالب علم نہیں ہوں۔ اور نہ آپ سکول  
 ماسٹر ہیں۔ کہ مجھے پوں بیٹھ جانے کا حکم دیں۔"

اس پر وہ بگڑ کر بولے: "کیا لاہور سے ہماری بے عزتی کرنے یہاں  
 آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا: "میں آپ کی بے عزتی کرنے تو نہیں آیا۔ لیکن  
 اپنی بے عزتی کرنے بھی نہیں آیا۔"

میرے پاس الہ آباد کے بیرسٹر سید ظہور احمد بیٹھے تھے۔ وہ میرا ٹوٹ کھینچ کر  
 کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ لیکن خلیفہ شجاع الدین پیچھے بیٹھے کہہ رہے تھے۔  
 نہیں بولتے دو۔ انہیں۔

مسٹر جناح یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرائے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر پوچھا  
 "چاہتے کیا ہو؟"

میں نے عرض کیا۔ "پنجاب مسلم لیگ کا اناحق۔"

فرمایا "تم میں سے ایک آدمی یہاں آ کر اپنا معاملہ پیش کرے۔"

چنانچہ ملک برکت علی نے۔ پلیٹ فایم پر جا کر تقریر شروع کی۔ اُن کی

تقریر ختم ہوئی۔ تو پورا ایوان ہمارا ہم خیال اور معادن بن گیا تھا۔ لیکن

مسٹر جناح نے چونک کر کھٹے کی مہلت طلب کی۔ اور فرمایا کہ سر سکندر آج شام

کی گاڑی سے کلکتہ آرہے ہیں۔ کل صبح اس بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

شام کو ہمیں پیغام ملا۔ کہ دوسرے روز۔ صبح آٹھ بجے مسٹر اصفہانی کے مکان پر۔ جہاں مسٹر جناح مقیم تھے۔ ہم حاضر ہوئے۔ تاکہ ہر سکندر کی موجودگی میں معاملات طے کئے جائیں۔ مسکندر کے ساتھ۔ اُن کے دونوں مسلمان بوزیر اور تمام پارلیمینٹری سکریٹری اور پرائیویٹ سکریٹری آئے تھے۔ اس کے علاوہ نواب ممدوٹ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔

مسٹر جناح نے فرمایا۔ کہ پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے گی۔ جسے مرتب و منظم کرنے کے لئے۔ ایک ۳۵ آدمیوں کی آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کی جاتی ہے۔ اور اس آرگنائزنگ کمیٹی میں۔ دونوں فریقوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔

غلام رسول خاں نے۔ یہ پوچھنے کی کوشش کی۔ کہ ہمارے الحاق کی درخواست کا کیا حشر ہوا۔ لیکن مسٹر جناح نے جواب دیا۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے کا بچہ فائدہ نہیں۔ پھر انہوں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ آرگنائزنگ کمیٹی کے لئے اپنے آدمیوں کی ایک فہرست تیار کریں۔ ملک صاحب نے ایک کاغذ پر اٹھارہ آدمیوں کے نام لکھ دیئے۔

یہ مجلس مشاورت اکم و بیش، دو گھنٹے چالیس رہی۔ اور بعض معاملات پر مسکندر سے ہماری تیز و تند گفتگو بھی ہوئی۔

اسی شام انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری آرگنائزنگ کمیٹی کی مکمل اور باضابطہ فہرست ہمارے پاس بھیجی۔ تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ کہ اس میں ہماری پارٹی کے صرف دس آدمیوں کے نام درج تھے۔ پچیس آدمی مسکندر

سکندر حیات کے تھے۔ غلام رسول خاں غصے سے بے تاب ہو گئے۔ لیکن میں نے  
 انہیں سمجھایا۔ کہ اب چاہے ہمارا ایک بھی آدمی شامل نہ کیا جائے۔ کم از کم مجھے  
 تعجب ہوگا نہ انوس۔

آرگنائزنگ کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی۔

- ۱۔ سر سکندر حیات خاں - صدر
- ۲۔ نواب حمدوٹا (نواب سر شام نواز خاں)
- ۳۔ خان بہادر نواب سعادت علی خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۴۔ ملک خضر حیات ٹوانہ۔ وزیر بلدیات
- ۵۔ میاں عبدالحئی۔ وزیر تعلیم
- ۶۔ خان بہادر میاں احمد یار خاں دوٹانہ۔ چیف پارلیمنٹری سکرٹری۔
- ۷۔ سید افضل علی حسنی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۸۔ خان بہادر میاں شتاق احمد گورمانی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سکرٹری۔
- ۹۔ میر مقبول محمود۔ پارلیمنٹری سکرٹری۔
- ۱۰۔ سید مجدد علی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سکرٹری۔
- ۱۱۔ میاں غیاث الدین ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)
- ۱۲۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔
- ۱۳۔ نواب سر محمد حیات خاں ٹون یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۱۴۔ راہ فتح خاں یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۱۵۔ خان بہادر نواب منظر خاں یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

- ۱۶۔ خان بہادر نواب فضل علی۔ یونیٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۱۷۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ پارلیمنٹری سکرٹری
- ۱۸۔ کیپٹن سر شیر محمد خاں۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)
- ۱۹۔ خاں بہادر شیخ کھامت علی یونیٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۲۰۔ چودھری محمد یحییٰ یونیٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۲۱۔ شیخ صادق حسن۔ امرتسر
- ۲۲۔ مولانا غلام رسول قہر۔ ایڈیٹر روزنامہ انقلاب
- ۲۳۔ شیخ فیض محمد۔ پارلیمنٹری سکرٹری۔
- ۲۴۔ خان بہادر مولوی غلام محی الدین نقوی۔ یونیٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۲۵۔ خان بہادر چودھری ریاست علی۔ یونیٹ ایم۔ ایل۔ اے
- ۲۶۔ علامہ اقبال
- ۲۷۔ ملک زمان ہمدی خاں
- ۲۸۔ خلیفہ شجاع الدین
- ۲۹۔ غلام رسول خاں
- ۳۰۔ ملک برکت علی
- ۳۱۔ پیر تاج الدین
- ۳۲۔ مولانا رفیع اللہ خاں مکیش۔ ایڈیٹر روزنامہ احسان۔
- ۳۳۔ مولانا ظفر علی خاں
- ۳۴۔ میاں عبد العزیز بیرسٹریٹ لا۔

۳۵۔ عاشق حسین بٹالوی۔

اب کلکتہ میں مزید قیام بے سود تھا۔ چنانچہ ۹ اپریل کی شام کو ہم واپس روانہ ہوئے۔ کلکتہ سے لاہور تک کا طویل اور صبر آزما سفر۔ اچھی خاصی کوفت میں کٹا۔ فلام زبول تھاں کے مزاج میں غصہ زیادہ تھا۔ وہ راستے میں بار بار کہتے تھے کہ اب پنجاب میں مسلم لیگ کو ختم سمجھو۔ کبھی کہتے۔ افسوس ہماری ڈوسال کی محنت رائیگاں گئی۔ کبھی کہتے۔ کہ ہم لاہور جا کر ڈاکٹر صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے۔

ملک زمان ہمدی کو بظاہر مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ کہتے تھے۔ کہ میں تو لاہور پہنچ کر سیدھا اپنے گاؤں چلا جاؤں گا میری زمینداری کے بہت سے کام رُکے پڑے ہیں۔

خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی غالباً یہ سوچ رہے تھے۔ کہ ہائی کورٹ کھلنے پر انھیں کون کون سی اپیلوں میں پیش ہونا پڑے گا۔ میں اس خیال سے خوش تھا۔ کہ چلو ہر روز کی ڈانٹا کلک ختم ہوئی۔ اب اطمینان سے بیٹھ کر کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کروں گا۔

۲۱ اپریل کو صبح ۹ بجے ہم لاہور پہنچے۔ ابھی گاڑی پلیٹ فارم پر اچھی طرح رکنے بھی نہ پائی۔ کہ ہم نے اخبار نردکش لڑکے کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال فوت ہو گئے۔

اس خبر سے ہم پر ایک بجلی سی لگ گئی۔ اور تمام ساتھی۔ دم بخود پریشان ہو کر۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سٹیٹن سے باہر آکر۔ اپنے گھروں کو واپس جانے کی بجائے ہم سیدھے  
 جاوید منزل گئے۔ اور اُس شخص کے جسدِ خاکی کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو  
 آخری مرتبہ روشن کیا۔ جس کے ساتھ اُس کے نیاز مندوں نے علم و ادب  
 کی نہضتِ ثانیہ۔ اور ملک و ملت کی حیاتِ تازہ کی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝





# آل انڈیا مسلم لیگ کا مینی فسٹو

جو

سنہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت شائع کیا گیا تھا

راصل مینی فسٹو انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے،  
 جب نیشنل اسمبلی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ تو مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا۔  
 کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن کا وجود ضروری ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے۔  
 سنہ ۱۹۰۶ء میں۔ بمقام ڈھاکہ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔  
 لیگ نے حتمی طور پر سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنا نصب العین اور دستور العمل وضع  
 کیا۔ اور اپنے دستور اساسی میں تبدیلی کر کے۔ مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد  
 کو اس میں شامل کیا۔

۱۔ ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت کا قیام۔ جس میں مسلمانوں کے  
 لئے ضروری اور مؤثر تحفظات موجود ہوں۔  
 ۲۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دیگر حقوق و مفاد کی  
 نگہداشت کرنا۔ اور انہیں فروغ دینا۔

ج۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان اتفاق و اتحاد اور  
دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا۔

د۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان  
برادرانہ تعلقات کو قائم رکھنا۔ اور استوار کرنا۔

## میشاق لکھنؤ

ابتداء سے لے کر اب تک۔ لیگ نے نہایت خلوص  
صداقت سے۔ ان بنیادی اصولوں کی پیروی کی  
ہے۔ جب تک منٹو مار لے اصلاحات نافذ نہیں۔ لیگ نے وقت کے ساتھ  
ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا۔ اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی صحیح  
ترجمانی کا فرض ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے تعاون و اعانت۔ بالخصوص  
اس عظیم المرتبت انسان، ہمارا چہ محمود آباد مرحوم، کی بے لوث خدمات۔  
پرجوش حب وطن اور عزم با بجزم نے۔ لیگ کو ایسی قوت و توانائی اور  
اقتدار بخشا۔ جس سے وہ اپنے نفع پر ہی نہیں گئی۔ اور اس نے ۱۹۱۶ء  
میں "کانگریس۔ لیگ پیکیٹ" جسے عرب عام میں میشاق لکھنؤ کہا جاتا ہے  
مرتب کیا۔ یہ میشاق ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ میں ایک بہت  
بڑی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

## سنگ میل

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں۔ اس میشاق کو  
ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ میشاق  
ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے باہمی اشتراک و تعاون کے جذبے۔

اُن کے فکر و عمل کی وحدت اور جدوجہد کی بیگانگت کا ایسا بڑا ثبوت ہے۔ جس سے یہ دونوں قومیں۔ اس ملک میں ایک ذمہ دارانہ حکومت کے حصول کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن اس میثاق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے تصفیے کا حرفِ آخر سمجھ لینا صحیح نہیں۔ اور نہ اس میثاق کے بانیوں نے۔ اس کو حرفِ آخر سمجھ کر وضع کیا تھا۔ لکھنؤ پیکٹ کے بعد ملک کو جن نئے حالات و کوائف سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے۔ اس میثاق کو حرفِ آخر تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۱۹۴۷ء میں۔ مائٹنگو چیمفورڈ اصلاحات کا **قومی مطالبہ** نفاذ ہوا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک۔ یہ قومی

مطالبہ روز بروز تقویت اختیار کرتا رہا ہے۔ کہ ملک میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیے۔ اس مطالبے میں مسلمان بھی پوری طرح برادرانِ وطن کے ہم نوا رہے ہیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ محبِ وطن ہندوستانیوں کی حیثیت سے۔ ہندوؤں کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن اقلیت ہونے کی وجہ سے۔ وہ اس اصول کے حامی ہیں۔ کہ آئندہ جو سیاسی اور دستوری نظام یہاں رائج کیا جائے گا۔ اُس میں اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے۔ ضروری تحفظات موجود ہونا چاہئیں۔

مکمل ہے۔ ایک نو آموز۔ اور مخالف **تحفظات کی ضرورت** سے بے خبر نیا ست دان۔ مسلمانوں

کے اس مطالبے کو فرقہ داری سے تعبیر کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ

جو لوگ دنیا کی آئینی اور دستوری تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ اس نکتہ سے یقیناً واقف ہوں گے۔ کہ سر ملک میں۔ قومی حکومت کی پائیداری اور استحکام کی اولین شرط یہ ہے۔ کہ اقلیتوں کی خیرسگالی اور ان کا دلی تعاون حاصل کیا جائے۔ جب تک حکومت کو یہ خیرسگالی اور دلی تعاون حاصل نہیں ہوگا۔ اقلیتیں بخوشی اور برضا و رغبت اکثریت پر اعتماد نہیں کر سکتیں۔

ملک میں وقتاً فوقتاً جو سیاسی مذاکرے،

## نصب العین

مشورے اور مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ ان میں

لیگ نے ہمیشہ اس نصب العین کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ کہ ہندوستان میں جلد از جلد ایک ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیے۔ لیگ آج بھی پورے استقلال کے ساتھ اس نصب العین کی حامی اور موید ہے۔

لیگ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے نتیجے کے طور پر۔ برطانوی حکومت

## نیا دستور

نے۔ ہندوستان کے باشندوں پر۔ وہ دستور ٹھونس دیا ہے۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ لیگ نے اس دستور کے متعلق۔ جو طرز عمل اختیار کیا ہے۔ اس کی وضاحت۔ اس قرارداد میں کر دی گئی ہے۔ جو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء۔

میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس کے الفاظ یہ ہیں :

” در حالیکہ مسلم لیگ۔ فرقہ دارانہ فیصلے (کمینونل ادارڈ) کو اس وقت تک کے لئے قبول کرتی ہے۔ جب تک کہ متعلقہ فرقوں کے

درمیان۔ اس فیصلے کا کوئی بدل منظور نہیں کیا جاتا۔ لیگ  
 پوری شدت سے۔ اس آئین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے  
 جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں۔ باشندگان  
 سندھ کی مرضی کے خلاف۔ اور اس امر کے علی الرغم کہ ملک کی متفرق  
 جماعتیں اور انجمنیں۔ اس ایکٹ کے خلاف ناراضی کا اظہار کر چکی  
 ہیں۔ سندھوستان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

"لیگ کا خیال ہے کہ اس صورت حال کو بد نظر رکھتے ہوئے۔ جو  
 اس وقت سندھوستان میں قائم ہے۔ آئین کے اس جزو پر اجنبی  
 تعلق صوبائی نظم و نسق کے ساتھ ہے، عملدرآمد کرنا مفید ہوگا۔  
 ہر چند کہ اس جزو میں۔ بعض ایسے حد درجہ قابل اعتراض پہلو  
 موجود ہیں۔ جنہوں نے وزارت اور مجلس قانون ساز کی حکومت  
 اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں کے حقیقی اختیارات سے محروم کر دیا ہے۔  
 "لیگ کی یہ حتمی رائے ہے۔ کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء  
 نے مرکز میں جس قسم کی رجعت پسندانہ حکومت قائم کرنے کے لئے۔  
 ایک آل انڈیا فیڈریشن کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر  
 ناقص ہے۔ یہ مجوزہ فیڈریشن۔ برطانوی سندھ کے مفاد کے لئے حد  
 درجہ ہلکا۔ نقصان دہ اور رجعت پسندانہ ہے۔ اور اس فیڈریشن  
 کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ سندھوستان جس دیرینہ اور عزیز لفظ العین  
 یعنی مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے لئے کوشاں ہے، اس کے راستے

میں روڑے اٹکا کر۔ اُس کے حصول کو غیر معین عرصے کے لئے معرض التوار میں ٹھال دیا جائے۔ لہذا لیگ اس فیڈریشن کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔

” لیگ کی رائے میں برطانوی حکومت کا فرض ہے۔ کہ فیڈریشن کی سکیم کو نافذ کرنے سے پہلے۔ اپنی اولین فرصت میں۔ اس سکیم کے تمام پہلوؤں پر نظر ثانی کرے۔ ورنہ لیگ کو یقین ہے۔ کہ یہ سکیم ملک کے باشندوں کو امن و اطمینان سے بہرہ ور نہ کر سکے گی۔ اور اگر اس کے برعکس حکومت نے اس سکیم کو زبردستی لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ثابت ہوں گے کیونکہ یہ سکیم ہر اعتبار سے۔ سہمہ دستان اور اُس کے باشندوں کے مفاد کے لئے ناقابل عمل ہے۔“

لیکن ازبکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا وہ جزو، جس کا تعلق صوبائی خود مختاری سے

## صوبائی خود مختاری

ہے، آئندہ سال کے دوران میں نافذ کیا جانے والا ہے۔ لیکن فیصلہ کیا ہے کہ بحالات موجودہ۔ اس جزو سے، جیسا کچھ بھی وہ ہے، فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اپنے اس فیصلے کے پیش نظر۔ لیگ نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کر کے۔ ایک مرکزی ایکشن بورڈ

## ایکشن بورڈ

قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جسے اس بات کا اختیار ہوگا۔ کہ مختلف صوبوں میں۔ پیاد نشل بورڈ قائم کرے۔ اور اُن کا الحاق اپنے ساتھ کرے۔

”ہرگاہ کہ آئین جدید کے نفاذ کے ساتھ۔ اس ملک میں جو پارلیمنٹری نظام حکومت رائج ہوگا۔ اُس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کر لیا گیا ہے۔ جو اس قسم کی واضح حکمتِ عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کار بند ہوں۔ کہ رائے دہندوں کی سیاسی تربیت کر سکیں اور اسی نوع کے عزائم و مقاصد کہتے والی دیگر جماعتوں سے لغادن میں۔ سہولت بہم پہنچا سکیں۔ اور آئین نوے امریکی حد تک زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کر سکیں۔“

”ہرگاہ کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو تقویت پہنچانے۔ اور صوبائی حکومتوں میں۔ اُن کے لئے مناسب اور موثر حصہ حاصل کرنے کے لئے۔ یہ امر ضروری ہے۔ کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔“

”لہذا قرار دیا جاتا ہے۔ کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کے لئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز مسٹر جتوہ کو اختیار دیا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی صدارت میں۔ ایک مرکزی ایکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اس بورڈ کے ارکان کی کم از کم تعداد ۳۵ ہو۔ اور اُسے اختیار حاصل ہو۔ کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیش نظر۔ مختلف صوبوں میں۔ صوبائی ایکشن بورڈ قائم کر کے۔ مرکزی بورڈ سے اُن کا الحاق کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے۔ مناسب تدابیر ذرائع اختیار کرے۔“



اس قرارداد کی رُو سے۔ مجوزہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں آچکا ہے

اور اب اس مرکزی بورڈ کی پالیسی اور پروگرام کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

جب سے رائٹنگو چیف بورڈ اصلاحات کا اجراء اور  
ان پر عملدرآمد شروع ہوا ہے۔ متعدد طاقتوں نے

## خود غرض جتنے

زور پکڑ کر۔ ابھرتا شروع کر دیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان اصلاحات کے

تحت۔ جس قدر اقتدار اختیار کیے جاسکتے تھے۔ اُس پر، سندھوستان کے مختلف

صوبوں میں، دو قسم کے لوگوں نے۔ باہمی اشتراک و تعاون سے۔ قابو پا لیا

ہے۔ ان میں سے ایک تو رجعت پسند اور قدامت پرست لوگوں کا عنصر

ہے۔ اور دوسرا عنصر ایسے خود غرض افراد پر مشتمل ہے۔ جن کا تنہا مقصد یہ ہے

کہ جس طرح بن پڑے۔ اور جہاں بن پڑے۔ ہر جیلے بہانے سے۔ اپنے لئے اعزاز

مناسب حاصل کئے جائیں۔

چونکہ یہ طرز عمل۔ خود حکومت کے لئے مفید تھا۔ اس لئے حکومت نے

ہمیشہ ان افراد کی سرپرستی کی۔ اور انھیں امداد و اعانت سے تقویت پہنچائی

نتیجہ یہ ہوا کہ ان خود غرض جتنوں نے۔ نہ صرف تعلیم یافتہ۔ ترقی پسند اور

آزاد خیال لوگوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلکہ عوام کو بھی بے دردی

سے کوٹا۔ اس طرح۔ رجعت پسند عناصر اور شہنشاہیت پسند طاقتوں کے

امتناع سے۔ عوام دوسرے غلبے کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس

غلبہ کو پاش پاش کیا جائے۔

صدر کا انتباہ | آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر نے

نہایت مناسب طریقے سے - مندرجہ ذیل الفاظ میں - موجودہ سیاسی صورت حال پر تبصرہ کیا ہے -

آج ہمیں نئے مسائل درپیش ہیں - اس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کو مغربی تعلیم سے آراستہ کر کے - اُسے سرکاری ملازمتوں کے حصول کے قابل بنایا جائے اور نہ یہ سوال درپیش ہے کہ تعلیم یافتہ افراد میں - عہد و کثور یہ کی روشن خیالی کیونکر پیدا کی جائے - اس کے برعکس - دورِ حاضر کے واقعات - ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ کر ڈر مسلمانوں کے معاشرتی حالات میں - بنیادی انقلاب پیدا کرنے کی بہترین تدابیر کیا ہیں - تاکہ ان لوگوں کو اُس خوف ناک تنگدستی - افلاس اور پس ماندگی کے گڑھے سے نکالا جاسکے - جس میں یہ گر چکے ہیں - اور اس طرح انہیں تہذیب معاشرے کے ابتدائی رموز سے آشنا کر کے - آزاد ملک کے آزاد شہری بننے میں مدد دی جاسکے -

"ہمارا فرض ہے کہ حالات میں تبدیلی پیدا کریں - دنیا کے دیگر ممالک اپنے ہاں - اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے احساس سے ، مدت ہوئی ، آگاہ ہو چکے ہیں - اور اگر یہ تبدیلی حلیہ از حلیہ روزِ نما نہ ہوئی - تو یقین کیجئے کہ ہمارا معاشرتی نظام - ایک کرم خوردہ سنتوں کی طرح دھم سے نیچے آگئے گا - اور اس کے گرتے ہی اکیا لسی

تباہی آئے گی۔ جس سے صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں۔ بلکہ وہ تمام طبقے بھی مٹ جائیں گے۔ جنہیں آج دولت اذات پات اور جاگیر داری نے۔ سماج میں نمایاں حیثیت عطا کر رکھی ہے۔

”جس معاشرتی نظام کے تحت۔ ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُس کی بنیادیں۔ آج سے صدیوں پیشتر رکھی گئی تھیں۔ اور آئینِ فطرت کے مطابق۔ یہ بنیادیں آج بالکل کمزور سوچکی ہیں۔ ہماری ذاتی غرض مندی۔ اس امر کی مقتضی ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہمارا فرض ضرور ہے۔ کہ اب ایک نئی عمارت کو نئی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے۔ اس فرض کی بجا آوری۔ تمام طبقوں پر یکساں عائد ہوتی ہے جن میں تعلیم یافتہ افراد۔ سرمایہ دار اور زمیندار۔ برابر کے شریک ہیں ہماری یہ کوشش صحیحی بار آور ہو سکتی ہے۔ کہ ہم میں سے ہر شخص اختیار اور قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ ایسے معاشرتی نظام کی عمارت۔ کسی سلطنت کی تعمیر سے زیادہ خاندان، زیادہ بادقار اور زیادہ منصفانہ ہوگی۔“

بہ این ہمہ۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ اس امر کو بالکل واضح کر دیا جائے۔ کہ مسلم لیگ ایسی ہر تحریک کی مخالف ہے۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ ذاتی اور شخصی جاننا کو ضبط کر لیا جائے ہم توقع کرتے ہیں۔ کہ جو لوگ مختلف مجالس قانون ساز میں ہمارے نمائندے بن کر جائیں گے

**نمائندوں کا فرض**

وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے۔

اڈل یہ کہ موجودہ صوبائی نظام حکومت اور مجوزہ مرکزی آئین کو جلد از جلد ختم کر کے۔ اُس کی بجائے، ایک جمہوری اور مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

دوم یہ کہ اس درمیانی وقفے میں، مسلم لیگ کے نمائندے، اپنی اپنی مجلس قانون ساز میں اس امر کی انتہائی کوشش کریں، کہ قومی زندگی کے جملہ شعبوں میں، عوام کی فلاح ذہب و دے کے لئے، موجودہ آئین سے، جس قدر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اُس سے حتی الامکان ورنہ نہ کیا جائے۔

جب تک ملک میں، جبراً گانا انتخاب کا اصول رائج ہے۔ **پارٹی کا جواز** مجلس قانون ساز میں، مسلم لیگ پارٹی بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، لیکن اس پارٹی کو اس امر کا اختیار ہوگا، کہ وہ کسی ایسے فریق، یا متعدد فریقیوں کے ساتھ تعاون کرے، جن کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

مسلمانوں سے درخواست | لیگ مسلمانوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنی قومی یگانگت کو برقرار رکھیں۔ اداس قومی یگانگت کو کسی اقتصادی پروگرام کے نعرے یا کسی اڈم کے نعرے سے متاثر ہو کر کمزور نہ کریں۔

پروگرام کا خاکہ | آئندہ انتخابات کے لئے مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے، جو پروگرام وضع کیا ہے، اُس

کی چند بڑی بڑی شہتیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ جہاں تک ان امور کا سوال ہے۔ جن کا تعلق مذہب سے ہے۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اور اس ضمن میں جمعیت العلماء ہند اور مجتہدوں کے مشورے کو اہمیت دی جائے گی۔

۲۔ جاہلانہ اور تشدد آمیز قوانین کو منسوخ کرانے کی سرکون کوشش کی جائے گی۔

۳۔ ایسے تمام احکامات و اقدامات کی مخالفت کی جائے گی۔ جو ہندوستان

کے مفاد کے خلاف ہیں۔ اور جو اس ملک کے باشندوں کی بنیادی آزادی

کو سلب کرنے کا موجب ہیں۔ اور جن سے۔ اس ملک کی اقتصادی ٹوٹ

کھسٹ کا دروازہ کھلنے کا احتمال ہے۔

۴۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے گراں بار اخراجات میں کمی کی جائے گی۔

اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لئے معتد بہ قوم ہتیا کی جائیں گی۔

۵۔ ہندوستان کی فوج کو قومی فوج بنایا جائے گا۔ اور موجودہ فوجی عمارت

میں تخفیف کی جائے گی۔

۶۔ ملکی صنعت و حرفت کو جس میں گھریلو صنعتیں بھی شامل ہیں فروغ

دیا جائے گا۔

۷۔ ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لئے شرح سکے، شرح مبادلہ،

اور قیمتوں میں ضروری ترمیم کی جائے گی۔

۸۔ دیہاتی آبادی کی معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح کی جائے گی۔

۹۔ دیہاتی آبادی کے زرعی قرضے کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

- ۱۰:- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا جائے گا۔
- ۱۱:- اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔
- ۱۲:- مسلمانوں کی مجموعی حالت کو بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔
- ۱۳:- ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔



## ضیاع

مسٹر جناح کی وہ تقریر۔ جو انہوں نے پنجاب اسمبلی کے انتخابات کی مہم کا آغاز کرتے وقت۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں۔ زیر صدارت ملک زمان مہدی خاں مرحوم کی تھی۔

جناب صدر اور حضرات! گذشتہ چند مہینوں میں۔ مجھے کئی مرتبہ لاہور آنے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمان۔ سیاسی اقلیتی اور اقتصادی لحاظ سے۔ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں۔ بہت پس ماندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ۔ آپ کا صوبہ افسری صوبہ ہے۔ جس سے میری یہ مراد ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام شعبوں پر۔ دفتری حکومت کا سنگہ رواں ہے۔ آپ کے صوبے کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں۔ کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اور ان کے پیش نظر۔ خود پرستی کے علاوہ اور کوئی سطح نظر نہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے رہنماؤں کا لائحہ عمل

لے اصل تقریر انگریزی میں تھی۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہ وہ عوام الناس کی جہالت اور بے خبری کا پورا پورا  
فائدہ اٹھائیں۔ اور جہاں دوسرے تعلیم یافتہ اور اہل الہائے مسلمانوں سے تعاون کا  
مسئلہ پیش ہو۔ وہاں خاموشی سے کٹی کاٹ کر الگ ہو جائیں۔

حضرات! آپ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ کہ آپ کو چند  
رجت پسند رہنماؤں کی ایک ایسی ٹولی کو زیر و زبر کرنا ہے، جس کی پشت پر ضمیر فروش  
پریس کا پناہ بیگنڈہ حکومت کی چٹم اتفات اور لاعلم رائے دہندوں کے  
دوٹ ہیں۔

پریس کا ایک حصہ۔ ہمارے لائحہ عمل اور مطمح نظر کو۔ پبلک کے سامنے ہمیشہ  
غلط نقطہ نگاہ سے پیش کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ وہ دبی زبان سے یہ امر  
بھی تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ انہیں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے کوئی اختلاف  
نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہم پر دہڑتے سے یہ الزام لگاتے ہیں۔ کہ ہم مسلمانوں  
کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے۔ فرقہ دارانہ پارٹیوں کی تشکیل کر رہے  
ہیں۔ اور اُن کا اپنا ادعا یہ ہے۔ کہ وہ مہلت خود بڑے ہی قوم پرست اور فرقہ داری  
کی لعنت سے کوسوں دور ہیں۔ لیکن کیا ہیں ان حضرات سے پوچھنے کی جسارت  
کر سکتا ہوں۔ اور کیا وہ ایمان داری سے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں  
کہ یونینٹ پارٹی۔ اس لئے غیر فرقہ دارانہ جماعت ہے۔ کہ اس کے ارکان کی نسبت  
میں۔ دہندوں کے نام بھی ہیں۔ جو موقع بہ موقع۔ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے  
رہتے ہیں؟ کیا کوئی شخص ایمان داری سے۔ اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے  
کہ "غیر فرقہ دارانہ جماعت" کی موجودگی میں بھی۔ دہندوں اور سکھوں کی علیحد علیحدہ



پارٹیاں موجود ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہ غیر مسلم پارٹیاں کیوں یونینٹ پارٹی ایسی غیر فرقہ دارانہ جماعت میں مدغم نہیں ہوئیں؟ میں یونینٹ پارٹی کے ارکان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ایمان داری سے ان سندھ اور سکھ ارکان کے نام تعلق کریں۔ جن کی امداد انھیں حاصل ہے۔ تاکہ پنجاب کے لوگ ان کی اس تعلق کو باور کر لیں کہ ان کے زمرے میں غیر مسلم ارکان کا مضبوط عنصر شامل ہے۔

حضرات! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص اس چیز کا متمنی نہیں کہ سندھوں اور سکھوں کو مسلمانوں کے ساتھ باہمی تعاون کی ایک ہی لڑی میں پرویا جاسکے۔ میں اس بات کے لئے بھی تیار ہوں کہ انتخابات کی کشمکش سے پہلے ہی ہم ان سندھوں اور سکھوں، نیز دوسری جماعتوں سے جن کے مفاد ہمہلکے ساتھ مشترک ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے باوجود تعاون کر سکیں۔ لیکن آپ یاد رکھیں کہ جب تک جداگانہ انتخاب کی مشق موجود ہے۔ ان پارٹیوں کی تشکیل فرقہ دارانہ اصولوں ہی پر ہو سکتی ہے۔ اور ہمیں ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی قوم ہی کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہوگا۔ خدا را ہمیں ایسی "غیر فرقہ دارانہ" پارٹیوں کی ضرورت نہیں جن کے عناصر رجعت پسند ہندو اور رجعت پسند مسلمان ہوں۔ اس کے برعکس۔ ہمیں ایسی غیر فرقہ دارانہ پارٹیوں کی ضرورت ہے جو آنا دنیالی، ترقی پسند اور محبت وطن قومی خادموں پر مشتمل ہوں۔ جو وطن عزیز کی خدمت اور اپنے بھائیوں کی بہبود کے لئے ہر قسم کے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکیں۔

میرے دل میں۔ بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونینٹ پارٹی اپنے

بلندبانگ دعا دی کے باوصف۔ کس قماش کی غیر فرقہ دارانہ جماعت ہے؟ آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس پارٹی کی "غیر فرقہ دارانہ" تغلی کو۔ ایک لمحہ کے لئے بھی۔ باور کرنے کو تیار ہیں؟ عوام کا اعتماد حاصل کرتے۔ اداؤں کی خدمت میں۔ سر ڈھری بازی لگانے کے لئے۔ اس پارٹی کے کون سا عملی اقدام کیا ہے؟ آئیے۔ اب میں آپ کو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد سے۔ متعارف کراؤں۔ جس کے تحت۔ صوبوں میں پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ پارلیمنٹری بورڈ کا مصلح نظر۔ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ ہے کہ۔

نئی اصلاحات کے تحت۔ جس نوع کے پارلیمنٹری نظام کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ ملک میں۔ ایسی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ جن کا پروگرام اور پالیسی بالکل بین اور واضح ہو۔ اور جو

(۱) اپنے رائے دہندوں کو سیاسی آراء اور افکار سے مطلع کر سکیں۔

(۲) یک جہت اور ہم خیالی پارٹیوں سے تعاون کر سکیں۔ اور

(۳) نئے آئین سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے علاوہ۔ مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل کا سڑک۔ ایک یہ جذبہ بھی تھا۔ کہ نئے آئین کے تحت۔ صوبائی حکومتوں سے۔ پورے طور پر مجتمع ہونے کے لئے۔ مسلمانانِ ہند کو وحدت کی لٹری میں منسلک کیا جائے۔ اس لئے ان تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ یہ لابی بنی تھا۔ کہ مسلمانانِ ہند۔ ایک مرکزی جماعت سے وابستہ ہو کر۔ اپنی تنظیم کریں۔ لہذا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے۔

مجھے اس امر کا اختیار دے دیا ہے۔ کہ میں صوبائی انتخابات لڑنے کے لئے۔ ایک مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل عمل میں لاؤں۔ جس کے کم سے کم ۳۵ ارکان ہوں۔ اور جو مقامی حالات کو نظر رکھتے ہوئے ہر صوبے میں ایک پارلیمنٹل الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لانے کے مجاز ہوں گے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مجوزہ مرکزی بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء کو۔ آپ کے شہر لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس لحاظ سے۔ آپ کا شہر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت کا مالک ہے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کا مصداق نہیں۔ بلکہ آپ کی قوم کے بہترین دماغوں نے۔ اس پر بدترین عجز و نحوض کیا۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ فکرو عمل کی وحدت پیدا کرنا مقصود ہے۔ تو انہیں ایک ہی پرچم کے نیچے اور ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا اشد ضروری ہے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر۔ ہم نے مسلمانان ہند کی ایک مرکزی جماعت کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کی شاخیں مختلف صوبوں میں۔ مضبوط بنیادوں پر قائم کی جا رہی ہیں۔ مرکزی جماعت کے بنیادی اصولوں کا صوبائی بورڈوں پر پورا تصرف ہو گا۔ اور جو ارکان بیگ ٹکٹ پر۔ صوبائی اسمبلیوں میں داخل ہوں گے ان کے لئے۔ ان مواعید کا احترام لازم ہو گا۔ جو لیگ سے پیمانہ دفا باندھنے سے ان پر عائد ہوں گے۔ اس طرح۔ ہم اسمبلیوں میں۔ ایسے گھرے آدمی بھیجنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ جو ذاتی اغراض سے بالا، اس کے دہندوں کے صحیح نمائندے

ادھر کڑی اور صوبائی بورڈوں کے سامنے، اپنے تمام افعال کے لئے جواب دہ ہوں گے مجھے معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، لیکن یقین کیجئے کہ اگر ہم اس ہم میں کامیاب ہو گئے، تو صرف پنجاب ہی کے مسلمان نہیں، بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی، اس سے زبردست فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

اب آپ ذرا اپنے صوبے کی کیفیت سن لیجئے۔ کیا کبھی آپ نے غور فرمایا کہ آپ کے رہنا، اس تنظیم میں المسلمین کی کڑی بننے سے کیوں گریز کر رہے ہیں سچی بات اگرچہ کڑی ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اگر وہ لیگ کی مرکزیت قبول کر لیں۔ تو اس صورت میں انہیں لیگ کی پالیسی اور پروگرام کا زہر بھرا جام۔ جو بد قسمتی سے حکومت کی چشم التفات کی چاشنی سے محروم ہے نوش کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے سے۔ ان کی من مانی کارروائیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا بنیہ کی تشکیل کے قصر رفیع کا انہدام بھی ہوتا ہے۔ جس کی دیواریں قریبی رشتہ داروں اور اپنے سیاسی حلیفوں کو ذارتیں دینے پر مشتمل ہوں گی۔ اور جس کی بنیادیں گورنر کے اشارہ چشم فابرو کے کینچ اور کاٹے سے تعمیر ہوں گی۔ اس کے برعکس۔ ہمارے پیش نظر ایسے کا بنیہ کی تشکیل ہے۔ جس کی قوت کا راز رائے عامہ کے احترام اور فرائض کو ایمان داری سے ادا کرنے میں پتہاں ہو گا۔ میں نے چند اخباروں میں یہ بیان، جو یونینسٹ پارٹی کے چند ارکان نے دیا تھا، پڑھا ہے۔ کہ میں ان لوگوں کو۔ جو لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے

مہنا نہیں چاہتے۔ رجعت پسندوں کا سہ لیسوں اور خواجہ تاشوں کے ٹولے سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ نواب چغتاری اور سر محمد یوسف جب تک لیگ کے رکن ہے۔ میں نے اُن کی رجعت پسندی اور ٹوڈیت سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ لیکن جونہی اُنہوں نے لیگ کی غلامی کا جوا گلے سے اتار پھینکا۔ میں نے فوراً اُن کے گلے میں رجعت پسندی اور کا سہ لیسوں کا پتہ ڈال دیا۔

حضرات! میں اس الزام کی صحت سے انکار کرتا ہوں۔ اور اس قسم کے لوگوں پر بیانات کو درخور اعتنا قرار نہیں دیتا۔ میں رجعت پسند عناصر کے خلاف نہیں۔ اور نہ اُن لوگوں سے کوئی خاص پُرعاش رکھتا ہوں۔ جن کی کتاب زندگی کا عنوان رجعت تمقہری اور کا سہ لیسوں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے۔ نواب چغتاری کا، جنہوں نے اپنی مرضی سے بعد میں استغفہ دے دیا، پڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں آج پھر سرسکندریات خاں کو بورڈ کے حلقے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس صورت میں وہ پلائی کی اجازت کے بغیر۔ من مانی وزارتوں کے ڈھکوسلے کھڑے کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ اور انھیں مرکزی بورڈ کے اصولوں کا احترام کرنا ہوگا۔

میں بیانگِ دہل کہتا ہوں کہ میں اس مجوزہ وزارت کے خوشگوار خوابوں کو درہم برہم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی بنیاد۔ آج ہی سے۔ یعنی انتخابات کی کامیابی اور رائے دہندگان کی متفقہ آواز سے قبل ہی رکھی گئی ہے۔ میں سہہ اور سکھ حضرات کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو انھیں اپنے اُن

ارکان سے لاحق ہے۔ جو یونیسٹ پارٹی کے اغراض مشنومہ کی تریبان گاہ پر اپنے  
ضمیر اور اپنی قوم کی نمائندگی کو یونیسٹ چڑھا چکے ہیں۔

میں اس حقیقت کو بچہ ایکہ بار آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ  
میرے پیش نظر۔ ایسی مسلم حکومت کا قیام نہیں۔ جو سندروں اور سکھوں کو  
گپیل دینا چاہتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے۔ کہ دنیا کی کوئی حکومت۔ جس کی بنیاد  
ظلم اور نا انصافی پر رکھی گئی ہو۔ سرگزر گزار یا بیچارہ نہیں ہو سکتی۔ اگر آئندہ پنجاب  
کی حکومت میں۔ مسلمانوں کو ایک کثیر اور فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہو نیوالی  
ہے۔ تو یقین کیجئے۔ کہ یہ عنصر ہمیشہ حق و انصاف اور مردوت و شفقت کے اصولوں  
پر عمل پیرا رہے گا۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔  
کہ مسلمان حق و صداقت کے راستے سے۔ ایک رنج اور ادمر نہیں ٹھکنے پائیں  
گے۔ پنجاب کے بہادر مسلمانوں کا خطاب سندوستان کا بازوئے شمشیر زن ہے اور  
وہ بلاشبہ مسلمانان سند کا دایاں بازو کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ہر محر کے  
میں۔ سندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر۔ جدوجہد  
میں شرکت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انہی روایات کے پابند رہیں گے۔ اور  
آج جبکہ ہمیں ایک نیا معرکہ درپیش ہے۔ وہ سندوستان کے مسلمانوں کو ایک  
لمحہ کے لئے بھی مایوس نہیں کریں گے۔

خدا را اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے۔ کہ ابھی ایسے بہت سے مرحلے باقی  
ہیں۔ جن کی اہمیت سندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے یکساں ہوگی۔ اسلامیان  
سند کا بدن ابھی بہت سے ناسوروں سے برس رہا ہے اور ان کے اندمال کے

لئے ہر صوبے کے مسلمانوں کو حتی المقدور مرہم کا سامان بہم پہنچانا ہوگا۔ مجھے بتائیے کہ آل انڈیا اہمیت کے مسائل جن سے مسلمانوں کی قومی و سیاسی بقا وابستہ ہے آپ ایک مرکزی جماعت کی مدد کے بغیر کس طرح بننا سکتے ہیں؟ کیا اسلام کا جمہوری نظام آپ کو اس امر کی دعوت نہیں دے رہا کہ مسلمانان ہند کی ایک مرکزی نمائندہ جماعت ہو۔ جس کی صدا سنہرستان کے مسلمانوں کی متفقہ آواز کہی جاسکے؟

حضرات! ہمارے پیش نظر اس قسم کی ایک نمائندہ جماعت کا بلند تصور ہے جو آزاد خیال، ترقی پسند اور اثنا پیشہ افراد پر مشتمل ہو۔ اور جو آزادی وطن کی مساعی میں ہمسا یہ اقوام کا ہاتھ بٹا سکے۔ تاکہ سنہرستان کے ماتھے پر غلامی کا جو سیاہ ٹیگہ لگا ہوا ہے۔ وہ دھسل جائے۔

میں سنہرستان سے بھی یہی کہتا ہوں کہ انھیں سچی اپنی جماعتوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ تاکہ ان کی جماعتوں کے خود غرض اور خود ساختہ رہنماؤں کا وجود نامسعود باقی نہ رہے۔ اور وہ بچے اور بلی جوش سے مسلمانوں سے تعاون کر سکیں۔ اس صورت میں سنہرستان اور مسلمانوں کے جو نمائندے صوبائی اسمبلیوں میں جائیں گے۔ وہ خلوص قلب اور پوری ایمان داری سے۔ ایک ایسے معاہدے پر پہنچنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جو سنہرستان کی تمام قوموں کو متفق کر دے اور اس طرح آئے دن کی باہمی سرگھٹپول اور سنہرستان مسلم بھگڑوں کے شاخسانوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میں سرسکندر حیات خاں سے پوچھتا ہوں کہ اگر وہ اہل پنجاب کی غیر فرقہ نارائہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے۔ اس قدر ہی بے تاب تھے۔ تو آج

سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریزرو بنک کی ملازمت اسی خواب کو  
شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کے لئے، انہوں نے  
اس سے پہلے کیوں استغنیٰ نہ دیا؟۔ میں پوچھتا ہوں کہ نواب منظر غاں کی جگہ  
سر سکندر حیات کو، قلم دان وزارت سنبھالنے کی کیوں ضرورت لاحق ہوئی؟  
مجھے انسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ ان تمام سوالوں کا جواب صرف اس قدر  
ہے، کہ یونینسٹ پارٹی کے خود غرض ارکان جن کے سامنے سوائے جاہ و منصب  
کے حصول کے اور کوئی مقصد نہیں، وزارت کی پڑی کوششیں بے اثر رہنے کی کوششیں  
مصرف ہیں، اور حیرت ہے، کہ اس جاہ پرست ٹوٹے کو، حکومت پنجاب  
کی کھلے بندوں امداد حاصل ہے۔

اس ضمن میں میں ہر ایک کیلینسی گورنر پنجاب کی قدرت میں کچھ جو یہاں  
سے کچھ زیادہ دور نہیں رہتے، اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کہ وہ اور ان کی حکومت  
پنجاب کے لوگوں پر، اس امر کو واضح کرنے میں تساہل سے کام نہ لیں، کہ جہاں  
تک انتخابات کا تعلق ہے، حکومت مکمل طور پر غیر جانبدار رہے گی۔ اور انہیں  
اس عہد کا پورا پورا پاس ہے۔ جو مرکزی حکومت نے ابھی چند ہی روز پہلے  
اسمبلی کے ارکان کو دیا تھا۔

حضرات! سب سے آخر میں میں آپ سے پُر زور درخواست کرتا ہوں،  
کہ اپنے دلوں کی قدر و قیمت پہنچانے، اور اس بات کو یاد رکھنے، کہ آپ کے  
دلوں کی دوسری قیمت ہے، پہلے تو آپ کے دلوں سے صوبائی اسمبلیوں  
کے ارکان منتخب ہوں گے۔ پھر آپ کے منتخب کردہ نمائندوں کے دلوں سے



فیڈرل اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عمل آئے گا۔

اس لئے میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ سچے مسلمان کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے۔ کہ ذوالوں۔ بہادر لیوں اور قرابت دار لیوں کے لپت تصور سے بلند رہ کر۔ صرف ان لوگوں کو ووٹ دیجئے۔ جو ایک واضح، بین اور روز روشن کی طرح نمایاں پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ اس کے بعد میں آپ سے درخواست کروں گا۔ کہ اگر آپ مسلمانوں کو۔ باہمی تنظیم کی لڑی میں منسلک دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ تو مسلم لیگ کی رکنیت قبول کیجئے۔ اور صرف ان امیدواروں کو ووٹ دیجئے۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جو اسمبلی کے اندر۔ اپنے اعمال کے لئے۔ مرکزی عہد کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اسی کے علاوہ باقی جس قدر امیدوار ہیں وہ بھڑوں کے اس نکلے کی مانند ہیں۔ جس کا کوئی نگہبان اور رکھوالا نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے اعمال و افعال کے لئے۔ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ اور ان کے روبرو جالب منفعت اور ہوس، جاہ کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

میری آخری اور پُر زور درخواست یہ ہے۔ کہ آپ مسلم لیگ میں۔ جوق و جوق شامل ہوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ہر ممکن مدد کریں۔ کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی سب سے پرانی، سب سے بڑی اور سب سے خدمت گزار جماعت ہے۔

## ضیعیہ ۳

سکندر جناح پیکیٹ کے متعلق پروفیسر گلشن رائے کا بیان۔

مرطوبہ سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور۔

مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سکندر جناح پیکیٹ نے پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک اڈل درجے کا

ایمان پیدا کر دیا ہے۔ یونینٹ پارٹی نے اسے سکندر حیات خاں کی زیر قیادت

گذشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کا مقابلہ کیا تھا۔ جب اپریل ۱۹۳۷ء میں سمر

فضل حسین نے یونینٹ پارٹی کی نئے سرے سے تشکیل کی تھی۔ تو یہ اعلان

کیا گیا تھا۔ کہ اس پارٹی کا پورا گرام۔ عوام کی اقتصادی اصلاح پہ مبنی ہے۔ اسی

اعلان کی رو سے۔ پارٹی نے ایک ایسے پروگرام کو۔ اپنا نصب العین قرار دیا

تھا۔ جو سراسر غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس کا تعنا یہ تھا

کہ تمام فرقہ وارانہ معاملات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

مرفضل حسین مرحوم نے۔ محسوس کر لیا تھا۔ کہ جدید اصلاحات نے۔ ماحول

کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اور اس تبدیل شدہ ماحول میں۔ اگر خالص فرقہ وارانہ

پالیسی پر عمل کیا گیا۔ تو گورنر کو آئے دن مداخلت کا موقع ملتا رہے گا۔ اور اس

طرح گویا صوبائی خود مختاری ایک سراسر مذاقی بنکر رہ جائے گی۔ سرفضل حسین مرحوم کی خواہش تھی کہ وہ خود پنجاب پر حکومت کریں۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ انھیں صوبے کے تمام فرقوں کی تائید و حمایت حاصل ہو۔ تاکہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر گورنر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت سرفضل حسین کی پشت پر تھی۔ ذماعت پیشہ سندھوں کی حمایت بھی انھیں حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں بسکھوں کے ایک طبقے کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

سرفضل حسین اور مسٹر جناح کا جھگڑا :- شہری سندھو سر

تھے۔ لیکن اس کے باوجود مرحوم پس کوشش میں مدد دیتے تھے۔ کہ کسی طرح راجہ نریندر ناتھ اور ان کے شہری رفقاء کو اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔ مرحوم کو یہ بھی معام تھا کہ مسلمانوں میں سے احرار اور سکھوں میں سے اکالی۔ ان کے خلاف ایسا بااں ہمہ انھیں امید تھی کہ وہ غیر اکالی سکھوں اور شہری سندھوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے وہ یہاں تک آمادہ تھے کہ فرقہ وارانہ پروگرام کو نظر انداز کر کے صرف اقتصادی پروگرام کو اپنا مطمحہ نظر بنایا جائے۔ اور مسٹر جناح کا اصرار تھا کہ مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے انتخابات کی جنگ لڑی جائے۔ لیکن سرفضل حسین نے یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ سے، جو سندھ سبھا کی طرح ایک خالص فرقہ وارانہ جماعت ہے۔

تعاون کیا۔ تو شہری سندھ اور سکھ۔ ان کے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ اس کے علاوہ بہت ممکن تھا۔ کہ زراعت پیشہ سندھ بھی ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیں انہیں حالات۔ انہوں نے کسی قدر درشت لہجہ اختیار کر کے۔ مسٹر جناح سے۔ صاف صاف کہہ دیا۔ کہ وہ پنجاب سے تشریف لے جائیں۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے۔ کہ تمام فرقوں پر مشتمل۔ ایک اکثریت رکھنے والی۔ غیر فرقہ دارانہ پارٹی قائم کرنی چاہیے۔ انہوں نے مسٹر جناح کی ناراضی مول لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

اگرچہ اس واقعہ کے چند ماہ بعد  
وزارتی پالیسی کی مضبوط پوزیشن :  
سرفضل حسین کا انتقال

ہو گیا۔ لیکن ان کے پیروؤں نے۔ گزشتہ انتخابات میں۔ ان کی پالیسی پر پوری طرح عمل کیا۔ اور مسلم لیگی امیدواروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ جن میں سے۔ ایک تو انتخابات کے نتیجہ کا اعلان ہوتے ہی۔ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس وقت پنجاب اسمبلی میں۔ تنہا ملک برکت علی۔ مسلم لیگ کی نمائندگی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

موجودہ صورت حال یہ ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی میں بیانیسی مسلمان اور سات سندھ ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ سات اچھوت۔ سات شہری سندھ۔ چھ انڈی پینڈنٹ سندھ۔ سترہ سکھ اور چار مسیحی۔ اینگلوانڈ میں اور یورپین ممبر شامل ہیں۔ اس طرح گویا مشترکہ وزارتی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۳۲۔ اور حزب مخالف کے ارکان کی تعداد ۴۳ ہے۔ موجودہ وزارت کی پشت پر

مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کے علاوہ۔ ہندو اور سکھ ممبروں کی اکثریت بھی ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ اس وقت یونینسٹ پارٹی کی پوزیشن بے حد مضبوط ہے۔ اور اس مضبوط پوزیشن ہی کا نتیجہ ہے کہ گورنر، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی آڑ لے کر، وزارت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ وزیر اپنی صوابدید کے مطابق، اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے مجاز ہیں اور اس طرح۔ ہم پنجاب میں۔ حقیقی صوبائی خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک غیر کانگریسی حکومت بھی۔ خود مختاری سے متمتع ہو سکتی ہے۔

**جدید سیکٹ کا اثر :-** یونینسٹ پارٹی کو اس وقت جو اطمینان بخش پوزیشن حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ سکھوں اور شہری ہندوؤں کی اکثریت۔ اس پارٹی کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ نظر نگاہ۔ ایک غیر جانبدار شخص کو۔ یہی توقع رکھنا چاہیے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات خاں۔ اپنی پارٹی کے استحکام کی خاطر سے۔ اور گورنر کی مداخلت کے امکان کو کم سے کم کرنے کے لئے۔ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ جس سے ان کے غیر مسلم شرکاء و پارٹنرز کو کھانہ سے علیحدہ ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ موصوف نے۔ مسٹر جناح سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رُو سے وہ پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ کے قریب کنیت پر دستخط کر کے۔ لیگ میں شامل ہو جائیں۔ سر سکندر نے۔ اس بات کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی یا بالفاظ دیگر۔ موجودہ یونینسٹ پارٹی

کے مسلمان ممبر۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے تحت کام کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ پنجاب پرنٹنگ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر پوزیشن پارٹی کے مسلمان ممبروں کا قبضہ ہو جائے گا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ موجودہ  
 معاہدے کی شرائط کی روت سے پنجاب

## لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ :-

پرنٹنگ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو اپنے دائرہ عمل میں ایک حد تک خود مختاری حاصل ہوگی۔ لیکن اب اس سہ ماہی اس امر سے بھی انکار محال ہے۔ کہ یہ پرنٹنگ بورڈ، بہت بڑی حد تک مرکزی بورڈ کے تابع فرمان ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ آئندہ اس مرکزی بورڈ کا آئین کس قسم کا ہوگا؟ کیا موجودہ بورڈ کی طرح آئندہ بھی لیگ کا صدر ہی اس بورڈ کے ممبروں کو نامزد کیا کرے گا یا ان ممبروں کا انتخاب آل انڈیا مسلم لیگ کی مجموعی رائے سے ہوگا؟ یہیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مستقبل میں جو نظام رائج کیا جانے والا ہے۔ اُس میں آل انڈیا مسلم لیگ، ہندوستان کی تمام صوبائی لیگوں کے ایک مرکزی نمائندہ ادارے کی صورت اختیار کرے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مجوزہ آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل میں ہندوستان کے ہر صوبے کے ممبروں کا انتخاب کس اصول کے مطابق کیا جائے گا۔ کیا ہر چھوٹا بڑا صوبہ مساوی تعداد میں ممبر بھیج سکے گا۔ یا ہر صوبے کی مسلم آبادی کے تناسب سے۔ ممبروں کی تعداد مقرر ہوگی۔ یا یہ اصول تدریجاً نظر رکھا جائے گا۔ کہ جس صوبے میں مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد زیادہ

وہ صوبہ زیادہ نمائندے سمجھنے کا مجاز ہوگا۔ اور جہاں ممبروں کی تعداد کم ہے وہ قطع نظر مسلم آبادی کے تناسب کے۔ نمائندے بھی کم تعداد میں بھیج سکے گا؟

یہ تمام سوالات بے حدام اور غور طلب ہیں  
**قرقہ دارانہ قراردادیں :-**  
 بہر حال کچھ کبھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آل

انڈیا مسلم لیگ میں۔ پنجاب کے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا پنجاب کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ ان قراردادوں کو اپنے صوبے میں عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ جن کو مرکزی لیگ نے منظور کیا ہے؟ کیا پنجاب کے مسلمان ان قراردادوں کو جامہ عمل پہناتے وقت۔ اپنے غیر مسلم رفیقوں کا تعاون حاصل کر سکیں گے؟ میں ایک مثال دے کر۔ اپنے نقطہ نگاہ کو واضح کرتا ہوں۔

اس سال آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں۔ ایک قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ "برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ مسجد شہید گنج کو از سر نو تعمیر کرے۔ مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ورنہ مسلمانان ہند اور برطانوی حکومت کے درمیان تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔"

میں پوچھتا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی اس قرارداد پر۔ برطانوی حکومت کیونکر عمل کر سکتی ہے؟ کیا سرکنڈرہیات خاں۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ سرسندرشکھ مجیٹھیہ اور ان کی خالصہ نیشنل پارٹی کے سکھ ممبروں کو۔ اپنے ساتھ بلا سکیں گے؟ اگر سرکنڈرا اور پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی (یعنی یونینسٹ پارٹی) کا مسلمان عنصر نے اس قرارداد پر عمل نہ کیا۔ تو کیا اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمنٹری بورڈ۔ ان کے خلاف۔ ضابطے کی

کارروائی کرنے پر مجبور نہیں ہوگا؟ میں نے محض ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ نہ  
اس بات کا قومی امکان ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ اس نوع کی متعدد  
قراردادیں منظور کرے گی۔ جن سے پنجاب کے ہندو اور سکھ متفق نہیں ہونگے؟

مذہبی امور میں اٹاٹومی :-  
عملی نقطہ نگاہ سے اگر غور کیا جائے۔ تو  
ظاہر ہے۔ کہ مستقبل کی یونینسٹ پارٹی

کے مسلم لیگی ممبر۔ صرف وہی کام کر سکیں گے۔ جن کے لئے۔ اُن کو پارٹی کے غیر مسلم  
گروہوں کا تعاون حاصل ہوگا۔ اندر میں حالات۔ اگر آل انڈیا مسلم لیگ یہ  
چاہتی ہے۔ کہ موجودہ یونینسٹ پارٹی، جس کا جزو اعظم مسلمانوں پر مشتمل ہے  
پنجاب پر حکومت کرے۔ تو اُس کا واحد طریقہ یہ ہے۔ کہ مذہبی معاملات میں  
پنجاب پر وشل مسلم لیگ کو مکمل اٹاٹومی عطا کر دی جائے۔ لیکن بایں ہمہ۔  
یہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک مرکزی جماعت کی  
چینیت ہے۔ صرف اس لئے منظم کیا جائے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی امور  
کی نگہداشت کی جائے۔

مسلم لیگ کے ممبر سرگز تو قح نہیں کر سکتے۔ کہ انھیں پنجاب یا بنگال کی  
مجلس قانون ساز میں۔ کبھی قطعی اکثریت بھی حاصل ہوگی۔ مسلمانوں کا کوئی  
نہ کوئی عنصر۔ ہمیشہ مسلم لیگ کا مخالف رہے گا۔ صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ  
پارٹی کو۔ اگر انتخابات میں کامیابی ہو بھی لئی۔ تو بھی صوبے پر حکومت کرنے  
کے لئے۔ اُسے غیر مسلموں کا دلی تعاون حاصل کرنے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ اور  
اس تعاون کی۔ اُسے خاص قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ وہ قیمت یہ ہے۔ کہ مسلم لیگ



پارٹی کو وعدہ کرنا ہوگا۔ کہ وہ ایک سراسر غیر فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہوگی۔

**الخصمیں :-** غیر فرقہ وارانہ پالیسی پر۔ عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہوگا۔

کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا۔ اپنی صوبائی شاخوں پر کوئی

ضابطہ اور اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اگر ایک آل انڈیا جماعت اپنی صوبائی شاخوں

پر ضابطہ و اختیار قائم نہیں رکھ سکتی۔ تو پھر ایسی آل انڈیا جماعت کا فائدہ

ہی کیا ہے؟ بعرض حال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ ان صوبوں کی مجالس قانون

سازیں۔ لیگ کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ تو بھی مسلم لیگ اقلیتوں

کی مرضی کے بغیر۔ یا ان کے علی الرغم۔ کسی فرقہ وارانہ پالیسی کو نافذ کرنے

کے قابل نہیں ہوگی۔ اور الگ اس نے ایسا کیا۔ تو گورنر اپنے اختیارات خصوصی

کے استعمال پر مجبور ہوگا۔ اور اس طرح صوبائی خود مختاری کے اندر جگہ

جگہ ڈراڑیں پڑ جائیں گی۔

حبیب آئین کی رو سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اقلیتوں کی رضامندی

اور گورنر کے تعاون کے بغیر کسی نوع کی فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل نہیں کیا جا

سکتا۔ اندر ہی حالات۔ بہترین طریق کار یہ ہے۔ کہ ایک غیر فرقہ وارانہ

پالیسی وضع کی جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پارلیمنٹری امور کی

انجام دہی کے لئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ جماعتوں کی قطعاً ضرورت باقی نہیں

رہے گی۔

پوزیشن پارٹی کے سند و ممبروں پر اثر :- اب ایک اند نقطہ نگاہ

سے غور فرمائیے ہمیں

پنجاب اسمبلی میں۔ بہت بڑی اکثریت کی امداد حاصل ہے۔ کیونکہ سر چھوڑو رام۔  
 سر سندر سنگھ مجیٹھیہ امداد چہ نرندرتا تھ کے گروہ اُن کی لُپٹت پر ہیں۔ بہار کے  
 مسلمان دوست بار بار یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے۔ کہ سندر وڈوں کو چاہیے کہ  
 سندر وڈ سبھا سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اب کہ سر سندر حیات خاں اور  
 اُن کی پارٹی کے مسلم ارکان۔ لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ سندر وڈوں کو سندر  
 سبھا میں شریک ہونے سے یہ پہلے دوست کیونکر منع کر سکتے ہیں؟ کیا  
 سندر جناح پکیٹ نے، جس کی رُوسے یونینٹ مسلمانوں کو لیگ میں شامل  
 ہونا پڑے گا، سر چھوڑو رام اور یونینٹ پارٹی کے سندر ممبروں کی پوزیشن  
 کو بہت بڑی حد تک کمزور نہیں کر دیا؟ آئندہ صورتِ حال یہ ہو گی کہ  
 یونینٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ ایک بیرونی جماعت کے احکام کی پابندی کرنے  
 پر مجبور ہوں گے۔ سر چھوڑو رام اگر چاہیں گے بھی۔ تو یونینٹ پارٹی کے مسلمان  
 ممبروں کو اپنا نقطہ نگاہ تسلیم کرنے پر۔ آمادہ نہیں کر سکیں گے۔ تا وقتیکہ  
 آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے۔ اس قسم کی مہایات صادر نہ ہوں۔ اندرین حالات  
 خود اپنی پارٹی میں سر چھوڑو رام اور اُن کے ساتھیوں کی پوزیشن اس قدر  
 کمزور ہو جائے گی۔ کہ اُنھیں امداد اعانت کے لئے لامحالہ یونینٹ پارٹی سے  
 باہر کسی اور جانب دیکھنا پڑے گا۔